اسلام اور تہذیبِ حاضرہ
محمد منیر

اسلام اور تہذیبِ حاضرہ

تہذیبِ انسانی کی تاریخ میں اسلام کا مقام!

مصنفہ

محمد منیر سابق چیف جسٹس آف پاکستان

پبلشرز

لا پبلشنگ کمپنی کچہری روڈ لاہور

طابع : عبدالرشید

مطبع : المکہ پریس شارع فاطمہ جناح لاہور

خوشنویس .... رانا محمد اکبر ۳۱/۱ اردو بازار - لاہور

عرضِ حال

یہ ایک وسیع مضمون پر مختصر سی کتاب میری سابقہ انگریزی تصنیف اسلام ان ہسٹری (ISLAM IN HISTORY) کا ترجمہ نہیں اگرچہ اس کی ترتیب مضامین کم و بیش اُس تصنیف کے مطابق ہے۔

اُردو میں یہ میری پہلی کتاب ہے۔ اگرچہ میں سکول اور کالج میں ۵ سال عربی، چھ سال فارسی اور دسویں جماعت تک اُردو سیکھنے میں کوشاں رہا۔ سال ۱۹۱۲ء کے بعد ان تینوں زبانوں سے میرا تعلق منقطع ہو گیا اور یونیورسٹی کا نصاب اور عدالتوں کی سرکاری زبان انگریزی ہونے کی وجہ سے میری ساری توجہ اس زبان پر مرکوز ہو گئی۔ البتہ گاہے گاہے شکستہ اُردو یا فارسی میں لکھی ہوئی دستاویزات پڑھنے کا موقع مجھے ضرور ملتا رہا۔ مگر ایسے مواقع کسی زبان پر عبور حاصل کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتے۔

اگر کسی زبان کے بولنے اور لکھنے کا اصل مدعا اپنے خیالات یا اپنی خواہشات کو دوسروں تک پہنچانا ہوتا ہے تو اس مقصد کو اپنی ٹوٹی پھوٹی اُردو میں پورا کرنے کی میں نے حتی المقدور کوشش کی ہے۔ میں نہ ادیب ہوں نہ صحافی اور نہ عالم دین۔ اور ایک وسیع اور متنازعہ مضمون پر قلم اٹھا کر گویا میں نے اختلاف رائے کو دعوت دی ہے۔ مگر میں تنقید کو بشرطیکہ وہ نیک نیتی پر مبنی ہو اور اس کا مقصد دل آزادی نہ ہو، خواہ وہ نکتہ چینی کی شکل اختیار کرے یا مصنف کے نظریے سے اتفاق کی صورت، انسان کی دماغی ارتقاء کے لیے ایک خوش آئند خال سمجھتا ہوں کیونکہ کسی متنازعہ معاملے کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے یا درست نتیجہ نکالنے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔

ایک غیر مشاق اُردو نگار کیلئے عبارت کی غلطی ایک معمولی بات ہے اور فراخدل قارئین ایسی غلطیوں سے درگزر کرتے ہیں۔ اُردو ایک ترقی پذیر زبان ہے جس میں ہر روز دوسری زبانوں کے الفاظ داخل ہوتے رہتے ہیں عربی اور فارسی کے ادق الفاظ کا بکثرت استعمال ایک عام قاری کیلئے اُردو کا سمجھنا مشکل کر دیتا ہے اور اگر ان مشکل الفاظ کے کسی لغت میں مترادف تلاش کیے جائیں۔ تو بسا اوقات وہ مستعملہ الفاظ سے بھی زیادہ مشکل ہوتے ہیں یا وہ اپنے معنوں میں مختلف رنگ لیے ہوتے ہیں اُردو میں کوئی فردوسی پیدا نہیں ہو سکتا جو غیر زبانوں سے دانستہ اجتناب کرتے ہوئے اُردو کے رائج الفاظ میں اپنا مطلب بیان کر سکے اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو ایک مرکب زبان بھی ہے جس میں دوسری زبانوں کے الفاظ بلا تامل استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

اِس کتاب کے لیے میں نے اسلام اور تہذیب حاضرہ کا نام چنا ہے کیونکہ تہذیب ایک جامع لفظ ہے، جس کا کسی قوم کی سرگرمیوں کے ہر پہلو پر اطلاق ہوتا ہے۔ اس لیے کسی ملک کی معاشرتی، معاشی، اقتصادی سرگرمی، اس ملک کا دستور، قانون، مذہب اور نظریۂ زندگی، اس کے علم و فن اور ادب یا اس کی مادی خوشحالی اور اسے حاصل کرنیکے ذرائع سب تہذیب کے مختلف پہلو ہیں۔ میں نے اسلام کی بنیادی اصولوں اور اوامر و نواہی اور اخلاقیات کا مطالعہ کیا ہے اور اس عالمگیر تحریک نے ذہنی انقلاب اور ارتقاء انسانی میں جو کردار ادا کیا اسکو تاریخی نقطۂ نگاہ سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میرا یہ مطالعہ اسلام کے علماء، فقہاء اور دانشوروں تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ میں نے مغرب کے مستشرقین اور اسلام کے مورخین کی تصنیفوں سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ کیونکہ کسی مذہب کی برتری کا ایک معیار یہ بھی ہوتا ہے کہ اس مذہب سے باہر رہنے والے اسکے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں میں نے حتی الوسع ان متنازعہ مسائل میں داخل ہونے سے احتراز کیا ہے۔ جو تحتی یا فروعی حیثیت

رکھتے ہیں اور جن پر اسلام کی ساخت کا انحصار نہیں۔ ایک مرکزی نقطۂ خیال جو اس کتاب میں ظاہر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ تہذیب و ترقی کا ازمنۂ وسطیٰ کے مسلمان دانشوروں سے ایک بالواسطہ تعلق ہے۔ عرب اور بعد میں عرب اور غیر عرب مسلمان علم سائنس کے اصل موجد تھے۔ انہوں نے اپنا سائنسی تخیل نہ قدیم یونانیوں سے لیا اور نہ کسی اور سابقہ قوم کے دانشوروں سے۔ انکا فلسفہ بھی یونانیوں کے فلسفہ سے مختلف تھا بلکہ قدیم یونانی فلسفہ کو انہوں نے اپنے فلسفے سے منزہ کیا۔ مسلمان دانشوروں کے علوم یورپ میں پندرھویں صدی تک یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل تھے۔ حتیٰ کہ ان دانشوروں کی تصانیف کے مطالعہ سے یورپ میں وہ دور شروع ہوا جس کو تجدید علوم RENAISSANC کا زمانہ کہتے ہیں اور جس کو غلط طور پر قدیم یونانی علوم سے منسوب کیا جاتا ہے اور اسی تجدید علوم کے زمانہ کی وجہ سے یورپ میں وہ سائنسی دور شروع ہوا جس پر تہذیب حاضرہ منحصر ہے۔ یہ حیران کن بات ہے کہ مسلمان جو سائنس اور فلسفے کے موجد تھے بارھویں صدی کے اختتام پر اپنی تحقیقات اور علم و دانش کو ہمیشہ کے لیے کیوں چھوڑ بیٹھے۔ یہاں تک کہ اب موجودہ سائنسی علوم ایجادات اور صنعتی اور حرفتی علوم میں انکا کوئی نمایاں یا قابل ذکر حصہ نہیں رہا اور اس لحاظ سے وہ وہی حیثیت اختیار کر چکے ہیں جو صدیوں پہلے یورپ کی تھی۔ ان کی اسی غفلت نے سوائے تیل پیدا کرنے والے مسلمان ممالک کے انکو ایک اقتصادی بے بسی سے دوچار کر دیا ہے۔ ہر مذہب میں اختلافات کا پیدا ہونا ایک تاریخی حیثیت ہے اور اسلام بھی اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ اس لیے اسلام پر جو کتاب بھی لکھی جائے وہ سب فرقوں کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ یہیں سے الحاد، کفر، بے دین، مشرک وغیرہ الفاظ کا سلسلہ شروع ہو کر گالی گلوچ کی نوبت تک پہنچ جاتا ہے۔ ماضی میں بعض مذاہب میں تو یہ اختلافات اتنی شدت اور نفرت تک پہنچ گئے کہ وہ انسانیت سوز افعال کے ارتکاب کا باعث بنے۔ اسلام میں بھی کچھ ایسے افعال کی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ افعال اکثر مذہبی اختلافات تک محدود نہیں رہتے بلکہ سیاسی اغراض سے جا ملتے ہیں۔ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ مسلمان دانشوروں کی تصانیف کا موجودہ تہذیب اور علوم سے ایک بالواسطہ تعلق ہے۔ اسیطرح قرآنی احکام، اسلامی اوامر و نواہی اور اخلاقیات کا بھی موجودہ قوانین سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اگر آپ تعزیرات پاکستان کو غور سے پڑھیں تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ اس میں جو بڑے بڑے جرائم قابل سزا ٹھہرائے گئے ہیں مثلاً "قتل عمد" قتل انسان مستلزم المسزا، راہزنی، چوری، زنا، ہر قسم کا دغا و فریب، کم وزنی، ملاوٹ، معاہدات جو سٹے کی صورت میں ہوں، ازالہ حیثیت عرفی، بیجا تصرف، امانت میں خیانت، نابالغان کے حال کی خورد برد وغیرہ یہ سب قرآنی احکامات، اسلامی اوامر و نواہی اور اخلاقیات کے دائرے میں آتے ہیں اور آجکل کے قانون کا مساوی تحفظ کا نظریہ، قانون کے سامنے سب کی برابری، مساوات، عدل وغیرہ تو ایکطرح سے اسلام کے ستون ہیں۔ اس لئے صدر فورڈ نے جو بات مسلمانوں کے نام عید کے پیغام میں کہی کہ اہل امریکہ اور مسلمانوں میں بہت سی مشترکہ اقدار ہیں وہ حقیقت پر مبنی تھی اور ماؤزے تنگ نے تو اس پاکستانی مسلمان کو شرمندہ کر دیا ہوگا جس کے اس سوال کے جواب میں کہ کیا آپ نے قرآن پڑھا ہے ماؤزے تنگ نے کہا کہ تم مسلمان تو قرآن کو پڑھتے ہو ہم اس پر عمل کرتے ہیں۔ زمانہ حال کے علوم کی وہ شاخ جس کو قانون کی سائنس JURISPRUDENC کہا جاتا ہے انسانی سرگرمیوں کو مختلف ابواب معین تقسیم کر کے معاشرے کے حقوق اور فرائض کو بیان کرتی ہے۔ اسلام حقوق کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کرتا ہے (۱) حقوق اللہ یعنی وہ حقوق جو ایک مسلمان کو اللہ کیلئے بصورت فرض ادا کرنے پڑتے ہیں اور جن کی ادائیگی یا عدم ادائیگی اللہ اور فرد کے درمیان معاملہ ہے (۲) حقوق العباد یعنی وہ حقوق جو ایک مسلمان کو معاشرے کے دوسرے افراد کے حق میں تسلیم کرنے پڑتے ہیں اور کیونکہ ہر ایک حق معاشرے کے کسی نہ کسی دوسرے فرد پر ایک فرض عائد کرتا ہے۔ اس لیے ان معنوں میں ان حقوق کی ادائیگی بھی فرض بن جاتی ہے۔ حقوق کی یہ شاخ قرآن اور سنہ میں تفصیلاً بیان کی گئی ہے مگر ان کا نچوڑ حافظ صرف ایک شعر میں بیان کر گئے ہیں۔

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن ۔۔۔ کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

یکم ستمبر ۱۹۷۶ء

محمد منیر، ۳۹ - گلبرگ ۵ - لاہور

فہرست مضامین

مضامین	صفحہ نمبر
باب ۱	
عمل تاریخ میں اسلام کا مقام	
حضرت محمدؐ کی ولادت	۱
حضرت محمدؐ کا لڑکپن اور شباب	۲۱
اسلام کا آغاز	۱
اسلام سے پہلے کی تہذیبیں	۱، ۱۸
حضرت کی پیدائش کے وقت رائج مذہب	۱
بازنطینہ یا استنبول	۱، ۱۸
شہنشاہ قسطنطین	۱، ۱۸
کریٹ کی تہذیب	۲
سکندر اعظم کا خواب	۲
قدیم یونانی فلسفی	۲
مصر کی تہذیب	۲، ۱۸
منگول قوم	۲
سویڈن کے بحری قذاق	۲
ہلاکو خان اور بغداد پر حملہ	۲، ۳
بغداد	۲
یورپ کی تاریکی	۲
برِ اعظم افریقہ	۲
ہندوستان	۲
شہنشاہ ہرشا	۲
مسلمانوں کی فتوحات	۲
اسلام و تہذیب کی اشاعت	۲
فتح ہسپانیہ	۲
مسلم اور مغرب کے مفکرین	۲
ابن رشد کے بعد فکری جمود	۳
اندلس سے مسلمانوں کا اخراج	۳
یورپ میں اسلامی تفکر و سائنس کا دخول	۳
یورپ میں احیاءُ العلوم	۳
روم کی سلطنت کا انتشار	۳
پاپائے روم کی طاقت	۳
عیسائیت کی فرقوں میں تقسیم	۳
عیسائیت کی مذہبی عدالتوں کے مظالم	۳
زمانہ احیاءُ العلوم کی ایجادات اور سائنسی تفکر	۳
امریکہ کی دریافت	۳
یورپ کے معاشرتی اور اقتصادی حالات میں تبدیلی	۳
یورپ کی نوآبادیاں اور استبداد	۳
مشینی انقلاب کی وجہ سے امرا اور غربا کے طبقے	۴
اشتراکیت کا جنم	۴
چین کا انقلاب	۴
قومیت کا نظریہ	۴
عالمی جنگ اوّل اور دوم	۴
لیگ آف نیشنز اور اقوام متحدہ	۴
ترکیہ میں انقلاب	۴
اسرائیل کا جنم	۴
اسرائیل اور عربوں کی جنگیں	۴
روس اور عرب	۵
فلسطینی بے گھر	۵
عرب اور دیگر مسلمان ممالک میں اتحاد کے آثار	۵

مضامین	صفحہ نمبر
قرار دادِ پاکستان	۵
محمد علی جناح (قائدِ اعظم)	۵
پاکستان اور ہندوستان میں جنگ	۵
مشرقی پاکستان کی علیحدگی	۵
بنگلہ دیش	۵
مجیب الرحمٰن	۵
یورپ میں دہریت	۶
روس اور امریکہ کی کشمکش	۶
ایٹم کا انتشار اور ایٹمی قوت	۶
باب ۲	
دنیا قبل از اسلام	
نسل انسانی کی ابتدا	۷
بحر ظلمات اور بحیرہ روم کا ملاپ	۷
مصر، دریائے فرات و دجلہ کی وادیاں، یونان	۷
ایشیائے کوچک، اٹلی، سلی و قرطاجنہ کی آبادیاں	۷
نسل انسانی کی پیدائش کے متعلق دوسرا نظریہ	۷
جزیرہ کریٹ	۷
سمیر سے تہذیب کی ابتدا	۸
بابل	۸، ۱۰، ۱۸
ہموّرابی	۸
آمو اور بل دیوتا	۸
بل مردوک دیوتا	۸، ۱۰
بتوں کا راج	۸، ۱۰، ۱۲
سکندرِ اعظم کا اپنی ولدیت کے متعلق شبہ	۹، ۱۸
حضرت موسیٰ	۹، ۱۵
حضرت موسیٰ کی بت پرستی سے نفرت اور بُت	

مضامین	صفحہ نمبر
پرستوں کے قتل کا حکم	۹، ۱۸
ہارون	۹
مصر کے فراعنہ کا اپنے آپ کو دیوتا سمجھنا	۹
فراعنہ کا موت کے بعد احتساب کا تخیل	۹
فرعون اخناطون	۹
اخناطون کی اپنی بہن نفرطیطی سے شادی	۹
شہنشاہ سیروز	۱۰، ۱۶، ۱۸
بخت نصر	۱۰، ۱۸، ۲۷
انسانی قربانی	۱۰
پیرو کے چمور بادشاہ	۱۰
نوشیروان	۱۱
عیسائیت میں مجسموں اور تصویروں کی پرستش	۱۱
عرب قبل از اسلام اور اس کے باشندے	۱۱، ۱۳، ۱۴، ۱۵
نجد	۱۱
صحرائے عرب	۱۱
یمن	۱۱، ۱۶
ملکہ بلقیس یا شیبا اور حضرت سلیمان	۱۲
سیسوترس	۱۳
پومپئے	۱۳
ابراہہ	۱۳، ۱۷
اصحاب فیل	۱۳
حج قبل از اسلام	۱۴
غلامی قبل از اسلام	۱۴
کعبہ کی حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل نے تعمیر کی	۱۵، ۱۹
صابعین	۱۶
حضر موت	۱۶
بحر احمر	۱۶

مضامین	صفحہ نمبر
حنیف	۱۶
باب ۳	
اسلام کا ظہور	
اسلام کی انقلابی حیثیت	۱۷
ولادت حضرت محمدؐ	۱۷،۱۸
اسلام سے پہلے کی تہذیبیں	۱۸
سارگن دوم	۱۸
فارس	۱۸
جولیس سیزر	۱۸
یسوع ناصری کا صلیب پر چڑھایا جانا	۱۸
حضرتؐ کے والد ماجد	۱۸
بی آمنہ	۱۹
حضرتؐ کا شجرہ نسب	۱۹
عبد المطلب	۱۹
ابولہب	۱۹
ہاشم	۱۹
امیہ	۱۹
مکہ	۱۹،۲۷
کربلا	۱۹
بی حلیمہ	۱۹،۲۷
ابوطالب	۱۹،۲۳
بحیرہ راہب	۱۹،۲۰
بُصرہ	۱۹
مسعودی	۲۰
ابن ہاشم	۲۰
ابن جابر	۲۰

مضامین	صفحہ نمبر
ہیوز	۲۰
حضرت خدیجہ سے شادی	۲۱
زید غلام کی رہائی	۲۱
غار حرا	۲۲
وحی کا آغاز	۲۲
دوسری وحی	۲۳
کوہ صفا سے عوام کو خطاب	۲۳
کفار کا سلوک	۲۳،۲۶
طائف میں	۲۴
کفار کا حضور کو لالچ دینا	۲۴
ہجرت حبشہ	۲۴
نجاشی	۲۴
حضرت عمرؓ کا اسلام قبول کرنا	۲۴
یثرب سے لوگوں کا آنا اور اسلام قبول کرنا	۲۴،۲۵
مدینہ کا شامل اسلام ہونا	۲۵
مدینہ آنے کی دعوت اور اہل مدینہ سے معاہدہ	۲۵
مدینہ کو ہجرت	۲۵
حضور کے قتل کی سازش	۲۵
حضرت کا مدینہ کا سفر اور غار ثور میں حضرت ابوبکر کیساتھ پناہ لینا۔	۲۵
ایک چھوٹا کیڑہ دنیا کی تاریخ بدلتا ہے	۲۵
مدینہ میں آمد اور استقبال	۲۵
سال ہجری کی ابتدا	۲۵
وحی میں اسلام کا مژدہ	۲۵
باب ۴	
یثرب میں	
مدینہ مختلف مذاہب کا شہر	۲۷

مضامین	صفحہ نمبر
مدینہ بطور سیاسی مرکز	۲۷
کیا اسلام کی بنیاد عیسائیت کے کھنڈرات پر پڑی	۲۷
اسلام نے کسطرح سیاسی رُخ اختیار کیا	۲۸
مدینہ اور مکہ کی اہمیت	۲۸
مدینہ میں اسلام کی تکمیل	۲۸
اسلام کے پہلے دو اصول، اللہ پر ایمان لانا اور بت پرستی ترک کرنا۔	۲۸
قدیم عربوں اور اسکیموں کی طرز زندگی کا موازنہ	۲۸
طائی	۲۹
مکہ کے متعلق پالیسی	۳۰
انصار	۳۰
مہاجرین	۳۰
مہاجرین، انصار اور یمنیوں سے معاہدہ	۳۰
صلحنامہ مدینہ	۳۰، ۳۱
بنی ضمرا سے معاہدہ	۳۱
دیگر قبائل سے معاہدہ	۳۱
مہاجرین کا قریش کے ساتھ اتفاقیہ مقابلہ	۳۱
جنگ بدر	۳۱، ۳۲
جنگ بدر کے نتائج	۳۲
ابوسفیان	۳۱
ابوجہل	۳۱
حضرت عباس قید ہوئے	۳۲
بدر کے بعد اسلامی حکومت کا مدینہ میں قیام	۳۲
قانون حرب	۳۲، ۳۳
جارحیت کی جنگ کا امتناع	۳۳
جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک	۳۳
جنگ احد	۳۳، ۳۵

مضامین	صفحہ نمبر
خالد بن ولید	۳۴، ۳۶ / ۴۴، ۴۶
یہودی امت سے خارج	۳۴
جنگ احد اور جنگ طور کی مشابہت	۳۵
جنگ احد کے چند پہلو	۳۵
الفانسو ہفتم کی ملکہ اور مجاہدین	۳۵
جنگ خندق	۳۶
اسلامی فتوحات کا شام کی سرحد تک پہنچنا	۳۶
صلح حدیبیہ	۳۶، ۳۷
عتبہ	۳۷، ۳۸
فتح خیبر	۳۸
وادی القرا اور فدک کی اطاعت	۳۹
حضرت صفیہ	۳۹
معاہدوں کا تقدس	۳۹، ۴۰

باب ۵

مضامین	صفحہ نمبر
فتح مکہ، حکمرانوں کو دعوت اسلام	۴۱
معرکہ موتہ	۴۲
مکہ میں داخلہ اور بت شکنی	۴۴
معرکہ حنین	۴۴
طائف پر دھاوا	۴۵
معرکہ تبوک	۴۵
شہنشاہ ہرقل	۴۶
تسخیر دومۃ الجندل	۴۶
گبن کا معرکہ موتہ پر تبصرہ	۴۲
〃 گبن	۴۶
وفود کی آمد اور قبول اسلام	۴۶
خطبہ عرفات	۴۷

مضامین	صفحہ نمبر
مورخ ایچ۔جی۔ویلز کا خطبۂ عرفات پر تبصرہ	۴۸
مدینہ میں آخری خطاب	۴۸، ۴۹
حضرت کے مختصر حالاتِ زندگی	۴۹-۵۰
حضرت کی سیرت	۴۹، ۵۰
آرتھر کونن ڈائل کی حضور کے متعلق رائے کہانی کی صورت میں	۵۰، ۵۱
کارلائل کی رائے	۵۳
جرمن گٹے کی رائے۔	۵۳
معصومیت نبی کا مسئلہ	۵۳
باب ۶	
اسلام کے عقائد و فرائض	۵۵
مسلمان کی تعریف	۵۵، ۵۶
ارکانِ اسلام	۵۷
اللہ کی صفات	۵۷
قرآن	۵۸
وحی کا وقت اور وحی نازل ہونے کے وقت کی حالت	۶۰
سنت اور حدیث	۶۲
محدثین۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی النسئی ابن ماجہ۔	۶۳، ۶۴
صحاح ستہ	۶۳
احادیث کی تاریخ اور صحت	۶۴
حدیث کی صحت پرکھنے کا معیار	۶۴، ۶۵
اجتہاد اور اجماع	۶۵
اجتہاد مطلق	۶۴
ابن تیمیہ	۶۵

مضامین	صفحہ نمبر
سیوطی	۶۵
علامہ اقبال	۶۶
مجتہدین	۶۶، ۶۷
آئمہ اربعہ۔ امام ابوحنیفہ النعمانی، امام عبدالمالک بن انس، امام شافعی، امام ابوعبداللہ احمد بن حنبل	۶۶، ۶۸
اجتہاد کی دورِ حاضرہ میں اہمیت	۶۸-۷۰
جہاد	۷۰
عورت کا درجہ	۷۰، ۷۲
تعددِ ازدواج	۷۳
پردہ	۷۳
غلامی	۷۴، ۷۶
باب ۷	
اخلاقیات۔ اوامر و نواہی	۷۷
عہد شکنی	۷۸
تجارت و سود	۷۹
کم وزنی	۸۰
زر اندوزی و ذخیرہ اندوزی	۸۰
بیع میں عطا بیانی	۸۰
ملاوٹ	۸۰
سٹہ	۸۱
نیک اعمال کی تاکید	۸۱
زمینداری	۸۲
اقتصادی ڈھانچے کی تعمیر	۸۲
مذہبی رواداری	۸۳، ۸۴
مذہبی آزادی کی نظائر	۸۴-۸۶
آزادیٔ ضمیر	۸۶، ۸۸

مضامین	صفحہ نمبر
عدل	۸۸،۹۰
عدل خلافت راشدہ کے عہد میں	۹۰
عدل خلفاء عباسیہ کے عہد میں	۹۳،۹۴
عدل ہسپانیہ میں	۹۴
عدل سلاطین عثمانیہ کے عہد میں	۹۵
عدل دور فاطمیہ میں	۹۵،۹۶
عدل ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں	۹۶
باب ۸	
بازنطین اور فارس کی شہنشاہیاں	
سرنگوں - فتح یورپ	۹۹
ابوبکر خلیفۂ اول	۹۹
مسیلمہ کذاب	۱۰۰
معرکہ یرموک	۱۰۱
فتح دمشق	۱۰۱
خولہ	۱۰۳
ضرار	۱۰۳
خالد بن ولید	۱۰۲،۱۰۳
اجنادین کا معرکہ	۱۰۲
فتح انطاکیہ	۱۰۳
فتح یوروشلم	۱۰۵
حضرت عمر کا یوروشلم کا قبضہ لینا، حضرت عمر کی سادگی اور فراخ دلی -	۱۰۵-۱۰۶
فتح حلب	۱۰۶
غلام دمیز کا فتح حلب میں حصہ	۱۰۶
ہرقل	۱۰۶
قسطنطین	۱۰۶

مضامین	صفحہ نمبر
فتح مصر	۱۰۷
عمرو فاتح مصر	۱۰۷
فرما	۱۰۷
حضرت عثمان کے عہد کی فتوحات	۱۰۹
طرابلس	۱۰۹
گرگیری	۱۰۹
سکندریہ پر قبضہ	۱۰۹
شاہ یزدجرد	۱۰۹
بنو ہاشم اور بنو امیہ کی کشیدگی	۱۱۰
حضرت عثمان کی شہادت	۱۱۰
حضرت علی	۱۱۰
حضرت عائشہ	۱۱۰
جنگ جمل	۱۱۱،۱۱۲
حضرت علی، معاویہ اور عمرو کے قتل کی سازش	۱۱۳
خلافت راشدہ کی کامیابیاں	۱۱۴،۱۱۵
سانحہ کربلا	۱۱۵،۱۱۸
بنو امیہ کا عہد	۱۱۸،۱۲۰
خلیفہ عمر بن عبدالعزیز	۱۱۹،۱۲۰
خاندان عباسیہ	۱۲۰،۱۲۱
ہلاکو خاں کا بغداد پر حملہ	۱۲۱
صلیبی جنگیں	۱۲۲
مصر	۱۲۳
ترکیہ	۱۲۳،۱۲۶
ترکوں کی فتح	۱۲۳،۱۲۴
فتح قسطنطنیہ	۱۲۴
ترکیہ میں انقلاب	۱۲۳،۱۲۴

مضامین	صفحہ نمبر
گیلی پولی	۱۲۵
انور پاشا	۱۲۵
مصطفیٰ کمال اتاترک	۱۲۵
ہندوستان میں مسلمانوں کا داخلہ اور حکومت	۱۲
باب ۹	
مسلمان کا تشخص	۱۳۱
مردان مومن	۱۴۳،۱۳۷ ۱۴۴
ابوبکرؓ	۱۳۷
حضرت عمرؓ	۱۳۸
حضرت عثمانؓ	۱۴۱
حضرت علیؓ	۱۴۱
بنو امیہ	۱۴۲
حضرت عمر ثانی	۱۴۲
امام حسینؓ	۱۴۲
باب ۱۰	
اسلام اور دیگر مذاہب	۱۴۵
مذاہب کی قسمیں	۱۴۵
مذہب میں عقیدہ اور عمل کا تعلق	۱۴۵
عمل کی قسمیں	۱۴۶
مسلمانوں کے ملک	۱۴۷
ہندو مذہب	۱۴۸
بدھ مت	۱۴۹
شنتو مذہب	۱۵۰
طاؤ کا مذہب	۱۵۰
کنفوشیس	۱۵۱

مضامین	صفحہ نمبر
قدیم مصر کا مذہب	۱۵۱
قدیم رومہ کا مذہب	۱۵۲
قدیم یونان کا مذہب	۱۵۲
زرتشت	۱۵۲
یہودیت	۱۵۳
عیسائیت	۱۵۶
تثلیث	۱۵۹
عشاء ربانی	۱۵۹
عیسائیت کے فرقے	۱۶۲،۱۶۱
اسلام	۱۶۴
مختلف مذاہب کا ملاپ	۱۶۶
توحید	۱۶۷
انقلاب عظیم	۱۶۸
اسلام کے اصول کی سادگی	۱۶۹
دانشوروں کی رائے	۱۷۰
علامہ اقبالؒ	۱۷۰
باب ۱۱	
اسلام اور دہریت	
لاادریت کا تخیل	۱۷۳
مسئلہ تخلیق	۱۷۵
مغربی دہریت کے بانی	۱۷۵
ہیگل	۱۷۵
مارکس	۱۷۶
فیورِ بک	۱۷۶
نیٹشے	۱۷۸
ہیوم	۱۷۹

مضامین	صفحہ نمبر
ڈارون	۱۸۰
سر ہربرٹ لینڈوسل	۱۸۰
جان سٹوارٹ مل	۱۸۱
جین پال سارترے	۱۸۱
ڈیوای	۱۸۲
نظریہ متعلق بہ وجود	۱۸۳
خلق اور کائنات کا معمہ	۱۸۴
ماورالخلا	۱۸۷
کھونٹک ۔ وحدار ستارہ	۱۸۸
اسلام میں مسئلہ تخلیق	۱۹۰
مسئلہ مخالفہ	۱۹۱
فرقہ معتزلہ	۱۹۲
البقیلانی	۱۹۲
الیٹم	۱۹۲
لبنز	۱۹۳
مسلم فلسفی	۱۹۴
امام غزالی	۱۹۴
اللہ کی صفات	۱۹۵
تصرف اور مواحدین کا سلسلہ	۱۹۶
الکندی	۱۹۷
فارابی	۱۹۷
ابن رشد	۱۹۷
ابن تمارت	۱۹۷
مواحدین کا نظریہ	۱۹۸
ابن باجہ	۱۹۸
ابن طفیل	۱۹۸
ابن سبین	۱۹۹

مضامین	صفحہ نمبر
ابن کرم	۱۹۹
نفیسہ	۱۹۹
ابن ادہم	۱۹۹
رابعہ راہبہ	۱۹۹
ابن عربی	۲۰۰
الکرخی	۲۰۰
علی حارث	۲۰۰
مصور بن عمان	۲۰۰
ذوالنور مصری	۲۰۰
رومی	۲۰۰
طالب المکی	۲۰۰
سعدی	۲۰۰
حافظ	۲۰۰
جامی	۲۰۰
عمر خیام	۲۰۰
باب ۱۲	
سائنس اور تہذیب کے پیشرو	۲۰۱
سائنس کے اصل موجد عرب	۲۰۱
ارسطو	۲۰۱، ۲۰۳
افلاطون	۲۰۱، ۲۰۳
عرب اور قدیم یونان کے سائنس والوں اور فلسفیوں کا تعلق عرب سائنسدانوں سے	۲۰۱
طریقہ	۲۰۲
یونانی فلسفی	۲۰۲
سقراط	۲۰۲
گیلی لیو	۲۰۳

مضامین	صفحہ نمبر
عرب سائنس دانوں اور فلسفیوں کا انہماک	۲۰۴
علم طب	۲۰۵
فخرالدین رازی	۲۰۵
ابی سینا	۲۰۶
علی بغدادی	۲۰۶
امان	۲۰۶
عبدالقاسم	۲۰۶
ابن بیطر	۲۰۶
زین الدین	۲۰۶
علم حیوانات	۲۰۷
یونانی اطبا	۲۰۷
عرب مورخ	۲۰۷
طبری	۲۰۷
مسعُودی	۲۰۸
ابن مسکادیہ	۲۰۸،۲۰۹
ابن خلدون	۲۰۸
تاریخ فرشتہ	۲۰۸
البیرونی	۲۰۸
ہومر	۲۰۹
پلوٹارک	۲۰۹
تھیوڈوسیس	۲۰۹
حکومت، سیاست اور اخلاق	۲۰۹
مسئلہ ارتقاء	۲۰۹
مولنٰنا روم	۲۱۰
جغرافیہ	۲۱۰
ادریسی	۲۱۰
ابن فردابہ	۲۱۰
یاقوت بن عبداللہ	۲۱۰
ابن سعید	۲۱۰
علم کیمیا	۲۱۱
ابن جابر	۲۱۱
علم طبیعات، ریاضی اور ہیئت	۲۱۱
ابن ہیثم (د ث)	۲۱۱
الکندی	۲۱۱
عبداللہ خوارزمی	۲۱۱
کوپرنیکس	۲۱۱
طالمی	۲۱۱
البطنی	۲۱۲
الفرغانی	۲۱۲
جعفر	۲۱۲
الغجندی	۲۱۲
ال قبیسی	۲۱۲
اقلیدس	۲۱۲
فیثاغورس	۲۱۲
زرقی علی	۲۱۲
غزالی	۲۱۳
علم نباتات	۲۱۳
قدرتی قوتوں کا استعمال	۲۱۳
تجارت اور جہاز رانی	۲۱۳
معاویہ کا بیڑا	۲۱۴
باربروسا	۲۱۴
صنعت، باغبانی، اور زراعت	۲۱۴
ایٹم کا تصور	۲۱۴
جارج سٹرائن	۲۱۴

مضامین	صفحہ نمبر
ابو کامل	۲۱۴
ابراہیم ابن سینا	۲۱۴
نبیح امین	۲۱۴
شستری	۲۱۴
ہٹوریئنز ہسٹری آف دی ورلڈ	۲۱۵
بری فالٹ	۲۱۵
راجر بیکن	۲۱۵
یورپ میں احیاء العلوم کے زمانے کی ابتدا	۲۱۶
انسائکلوپیڈیا بریٹینی کا	۲۱۶
الغزالی	۲۱۷، ۲۲۳
طامس ایکوی ناس	۲۱۷
پاسکل	۲۱۷
فتح ہسپانیہ	۲۱۷
ابن رشد	۲۱۷
صلیبی جنگیں	۲۱۷
عیسائیت میں فرقے	۲۱۷
پاپائے روم	۲۱۸
باب ۱۳	
دورِ حاضرہ اور اسلام	۲۱۹
اسلام کی تعریف	۲۱۹
غیر دینی نظام حکومت	۲۲۰
دہریت	۲۲۰
لاادریت	۲۲۰
اخلاقی اقدار کی تبدیلی	۲۲۰

مضامین	صفحہ نمبر
سیکولر نظام	۲۲۰
کاغذ کی ایجاد	۲۲۱
فرقہ معتزلہ	۲۲۱، ۲۲۳
الکندی	۲۲۱
الفارابی	۲۲۱
ابن سینا	۲۲۱
سائنس کی ایجاد	۲۲۳
سائنسی ایجادات	۲۲۲
دورِ حاضرہ کے مسلمانوں میں سائنسدانی کا فقدان	۲۲۲
ابن رشد	۲۲۳
نیوپلیٹونزم	۲۲۳
عیسائیت میں تجدید	۲۲۳
بغداد کی تباہی	۲۲۴
ہلاکو خان	۲۲۴
فتح قسطنطنیہ	۲۲۴
سلطان محمد ثانی	۲۲۴
وائنا پر حملہ	۲۲۴
سلیمان ذی شان	۲۲۴
ہنگری میں اسلامی حکومت	۲۲۴
جبراً تبدیلی مذہب کی ممانعت	۲۲۵
حفاظت خود اختیاری میں دفاعی جنگیں	۲۲۵
شریعت کے عناصر	۲۲۵
چند اسلامی مسائل میں تبدیلی کا امکان	۲۲۵

مضامین	صفحہ نمبر
اجتہاد مطلق سے اختلاف	۲۲۶
آئمہ اربعہ	۲۲۶
شریعت سے باہر کے قوانین	۲۲۷
اسلام اور دور حاضرہ کے مفکرین	۲۲۷
اسلام اور وطنیت	۲۲۷
ابن دقیق	۲۲۸
ابن تیمیہ	۲۲۸
عبدالوہاب	۲۲۸
وہابی	۲۲۸
محمد اسمٰعیل شہید	۲۲۸
سر سید احمد خان	۲۲۹
مولانا آزاد	۲۳۰، ۲۳۱
فیضی	۲۳۲
خلیل احمد مصری	۲۳۲
عبدہٗ	۲۳۳
ڈاکٹر طٰحٰہ حسین	۲۳۴
عرب قومیت	۲۳۳
خیا گوکلپ	۲۳۴، ۲۳۵
انقلاب ترکیہ	۲۳۴
کمال اتاترک	۲۳۵
علامہ اقبال اور انقلاب ترکیہ	۲۳۵
اتحاد المسلمین	۲۳۶، ۲۳۷
اسلام میں فرقے	۲۳۷، ۲۳۸
ابن دقیق العید	۲۳۸

مضامین	صفحہ نمبر
ابن تیمیہ	۲۳۸
سیوطی	۲۳۸
ابن حزم	۲۳۸
عبدالوہاب	۲۳۸
علامہ اقبال	۲۳۹
شاہ ولی اللہ	۲۳۹، ۲۴۵
اجماع	۲۴۰
نئے مسائل جو بذریعہ اجتہاد حل ہونے چاہئیں	۲۴۱
مسلمانوں کا آپس میں قتل	۲۴۴
فسادات پنجاب کی تحقیقاتی رپورٹ	۲۴۴
مغربی تہذیب کا نمایاں پہلو	۲۴۵
مسلمانوں میں سائنسی تکنیک کا فقدان اور اس کے نتائج	۲۴۶، ۲۵۰
سائنس کا اصول اور اس کا استعمال	۲۴۷، ۲۴۸
تیل پیدا کرنے والے مسلم ممالک اور ان کا یورپ کی صنعتیات پر اثر	۲۴۸
سر برٹ لینڈ رسل	۲۴۸، ۲۴۹
موجودہ اخلاقی گراوٹ۔	۲۴۹
پاکستان میں اسلامی اقدار	۲۵۱

باب ۱۴

حرف آخر

مضامین	صفحہ نمبر
اسلام کا ارتقاء انسانی میں حصہ	۲۵۳، ۲۶۶

اِس کتاب میں اگر کسی دیگر مصنف کے اقتباس میں

ENCYCLOPÆDIA BRITTANICA

کا حوالہ نہیں دیا گیا ۔ تو اسے

COLLIERS ENCYCLOPÆDIA

کا حوالہ سمجھنا چاہیئے ۔

باب ۱

عملِ تاریخ میں اسلام کا مقام

کسی عالمگیر تحریک یا انقلاب کا بنی نوعِ انسان کی ارتقا میں مقام متعین کرنے کے لیے خواہ وہ تحریک یا انقلاب وحی پر مبنی ہو یا کسی انسانی دماغ کی اختراع، ضروری ہے کہ نہ صرف تاریخ کے اُس مرحلہ کو جس میں اُس تحریک یا انقلاب نے جنم لیا پورے طور پر سمجھا جائے بلکہ اس سے قبل اور بعد کے حالات کا بھی پوری طرح جائزہ لیا جائے۔ کسی مؤرخ کے لیے جو تاریخ نویس ہونے کا دعویٰ کرتا ہو اس سے زیادہ ضروری اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے خیالات کو واقعات کے تابع رکھ کر بیان کرے اور جو نتیجہ وہ حالات اور واقعات سے اخذ کرے وہ ہر قسم کے تعصّب اور طرفداری سے مبرا ہو۔ پہلے سے قائم کی ہوئی رائے کی تائید میں واقعات کو چُننا اور دیگر متعلقہ اُمور کو نظر انداز کر دینا تاریخ نویسی نہیں کہلا سکتا اور جو مصنّف کسی مذہبی تحریک پر قلم اُٹھاتا ہو اس کے ذہن سے یہ بات محو نہیں ہونی چاہیئے کہ جس مذہب میں اُس کی پیدائش ہوئی ہے وہ اُس کے ذہن پر بچپن ہی سے ایسے گہرے نقوش چھوڑتا ہے کہ "بالغ العقل" ہونے کے بعد بھی وہ محو نہیں ہو سکتے۔ اس لیے ایسے مصنّف کے لیے تاریخ نویسی کا فن اور بھی نازک اور مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ تاریخ نویسی کے فن کا جوہر واقعیّت پسندی ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، جن کو ایک لحاظ سے بانیٔ اسلام کہا جاتا ہے، ۵۷۰ عیسوی میں مکّہ کے ایک قریش خاندان میں پیدا ہوئے۔ اور جب آپ قریباً چالیس سال کی عمر کو پہنچے تو آپ نے ایک ایسے دین کا آغاز کیا جو وحی پر مبنی تھا اور اس وحی کا نزول وقتاً فوقتاً جاری رہا حتیٰ کہ ۶۳ سال کی عمر میں آپ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

رسول اللہ کی پیدائش سے پہلے دُنیا کے مختلف حصّوں میں کئی ایک مذاہب اور تہذیبیں ظہور پذیر ہو چکی تھیں جنھوں نے دُنیا کی تاریخ پر گہرے اثرات چھوڑے، زندگی کے نئے نظام قائم کیے اور اسرارِ عالم کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی کوشش کر کے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ رسولِ اکرمؐ کی پیدائش کے وقت عوام کا مذہب عیسائیت تھا جس کو دُنیا کے کچھ حصّے اور اُس وقت کی سب سے طاقتور سلطنتِ رُوم کے شہنشاہ قبول کر چکے تھے اُن کا صدر مقام بازنطینہ تھا جو شہنشاہِ قسطنطین کے بپتسمہ لینے کے بعد

"قسطنطنیہ" کہلایا (اب اس کو استنبول کہتے ہیں) اس سے قبل جزیرہ کریٹ کی قدیم تہذیب، جس کو چند مؤرخ عربوں اور دوسرے مسلمانوں کے احسان فراموش کرتے ہوئے موجودہ مغربی تہذیب کی ابتدا سمجھتے ہیں، دو ہزار سال پہلے جزیرہ تھیرا کے ساتھ سمندر میں غرق ہو چکی تھی۔ اس کے بعد بڑے بڑے جنگجو اور عسکری رہنما اپنی فتوحات، خونریزی اور تباہی کے آثار چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ سکندر اعظم تمام دنیا پر قدیم یونانی تہذیب مسلط کرنے کے خواب سے مایوس ہو کر ایشیا سے مقدونیہ واپسی کے دوران بابل میں اپنی فتوحات کی خوشی کے جشن میں کثرتِ شراب نوشی سے بیمار ہو کر مر چکا تھا۔ قدیم یونانی فلسفی اپنے نظریات کی، جو ایک دوسرے سے متضاد تھے، تبلیغ کر چکے تھے۔ روما بادشاہی، جمہوریت اور شہنشاہی کے دور سے گزر کر دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور اس کی سابقہ طاقت کی نشانی صرف بازنطینیہ کی بادشاہی رہ گئی تھی اور وہ بھی اپنی زندگی کے آخری لمحات میں سسک رہی تھی۔ منگول قوم کے چرواہوں نے، جو جھیل بیکال کے گرد ڈیرہ ڈالے بیٹھے تھے، اب تک کوئی ایسا خان پیدا نہیں کیا تھا جو لوٹ مار کر کے اس دولت کو جو ان کے گرد بکھری ہوئی تھی مالِ غنیمت بنائے اور مفتوحہ ممالک کے باشندوں کی کھوپریوں کے برج بنا کر ان پر فخر کرے۔ اور اگر وہ بحری قزاق، جو آٹھویں اور دسویں صدی عیسوی میں سویڈن کے ساحل کی کمیں گاہوں سے نکل کر یورپ کے مغربی ساحل پر قابض ہو چکے تھے اور امریکہ تک پہنچ چکے تھے، تجارت کے لیے نہیں حسب معمول لوٹ مار کی غرض سے بغداد میں داخل ہو کر خلافتِ اسلامیہ پر بھی حملہ آور ہو جاتے جیسا کہ تیرھویں صدی میں ہلاکو خاں ہوا تو غالباً تاریخ عالم کی تین اہم صدیاں ضائع ہو جاتیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ پھر تاریخ کا دھارا کس طرف رخ کر لیتا۔ کیونکہ یہی زمانہ تاریخِ اسلام میں عقل و دانش اور تضبیط شرع کا تھا۔

رسول کریمؐ کی پیدائش کے وقت اور بہت بعد تک یورپ جہالت اور تاریکی کے گڑھے میں پڑا تھا صرف کبھی کبھی وحشی قومیں اس کو اس گہری نیند سے جگا دیتی تھیں۔ برّاعظم افریقہ کا اندرونی حصہ، جو برّاعظم سیاہ کہلاتا تھا، وحشی اور مردم خور قبائل کا مسکن تھا۔ ہندوستان میں اپنی تہذیب تھی اور شہنشاہ ہرشا کے زمانہ میں جو رسول اللہؐ کا ہمعصر تھا، بد اخلاق یا بد دیانت افراد اور ناخلف بیٹوں کے ناک اور کان کاٹ کر ان کو سسک سسک کر مرنے کے لیے جنگل میں چھوڑ دیا جاتا تھا۔

نئے دین یعنی اسلام کے معتقدین نے دنیا کا بہت سا حصہ جس میں یورپ بھی شامل تھا، ایسی سرعت سے فتح کیا جس کی پہلے کوئی مثال نہ تھی اور دنیا کو ایک ایسی تہذیب سے روشناس کرایا کہ وہ جلد ہی ایک عالمی تہذیب بن گئی۔ وہ سائنس کے موجد بنے۔ انہوں نے قدیم یونانی فلسفہ کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا بلکہ عقل سے کام لے کر اور اپنے مذہب کی روشنی میں اس کی تصحیح کر کے اس کو مسترد کر دیا۔ انہوں نے ایسے ادارے قائم کیے جن سے دنیا متحیر ہو گئی۔ اور آٹھویں صدی عیسوی (۷۱۱) میں ہسپانیہ کو فتح کر کے اپنی تاریخ کو یورپ کی تاریخ سے ملا دیا اور ایسے مفکر اور فلاسفر پیدا کیے

ان کی عقل و دانش سے مغرب اَب بھی فائدہ اُٹھا رہا ہے مگر ہسپانیہ کے مشہور فلسفی ابنِ رُشد سے مر لے
مُوروں کے ہسپانیہ سے نکالے جانے کے بعد مسلمانوں میں تجسس اور تحقیق کا چشمہ یکدم خشک ہوگیا۔ اسلامی
تحریک میں آزادیٔ خیال اور ترقی پسند رجحانات ختم ہوگئے۔ اور ایک طرح کا فکری جمود شروع ہوگیا۔ ابنِ رُشد
کے بعد یعنی ۱۱۹۸ء کے بعد عرب مفکروں کا مخصوص تخیل اور فلسفہ ختم ہوگیا۔

۱۲۵۸ عیسوی میں ہلاکو خاں نے دارالخلافہ بغداد پر حملہ کر کے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اندلس
سے، جہاں اَب بھی اِسلامی تہذیب کے آثار موجود ہیں، آخر مسلمان ۱۶۰۹ء میں نکال دیا گیا۔ مگر سائنسی
رُجحانات اور تحقیق جو عربوں کی ایجاد تھے اَب ہسپانیہ کے علاوہ یورپ کے دُوسرے حصّوں میں پہنچ
چکے تھے۔ اور اِس تخیّل کی بدولت یورپ میں وُہ دَور شروع ہوا جس کو احیاءُ العُلوم (RENASCENCE)
کا زمانہ کہتے ہیں۔ اگرچہ یورپی مؤرخ اس احیاء کو یونانی علم و فن کی تجدید سے منسوب کرتے ہیں۔ جیسا کہ بعد میں
بیان کیا جائے گا۔ یہ اُن کی یورپ پرستی اور اِسلام سے تعصب کا ایک نمونہ ہے۔ رُومہ کی مُملکت وحشی
اَقوام کے حملوں سے منتشر ہوچکی تھی مگر پاپائے رُومہ کے عقائد اور اس کی طاقت اٹلی میں اب بھی تسلیم کی
جاتی تھی۔ احیاءُ العُلوم نے پاپائے رُومہ کی طاقت اور عقیدوں پر اثر ڈالنا شروع کیا۔ شبہات سے
شروع ہوکر ان عقائد اور طاقت کے خلاف کُھلی بغاوت نے سر اُٹھایا اور عیسائیت دو بڑے فرقوں
میں منقسم ہوگئی۔ اِن دو فرقوں میں اِس قدر نفرت بڑھ گئی کہ وُہ لوگ، خواہ وُہ پوپ سے مختلف عقیدہ
رکھتے ہوں یا ایسے خیالات کا اظہار کرتے ہوں جو پاپائے رُوم کے عیسائی عقائد سے ٹکراتے ہوں،
مذہبی عدالتوں کے حُکم سے تختۂ دار پر چڑھنے لگے یا آگ میں جلائے جانے شروع ہوگئے۔ انسانی ضمیر
اس تنگدلی اور بے رحمی کو برداشت نہ کرسکا اور یورپ میں آزادیٔ خیال کا تصوّر مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔
اور بلا لحاظِ مذہب سائنسدان اپنی تحقیق میں مصروف رہے۔ یکے بعد دیگرے سائنسی ایجادات اور
دریافتیں شروع ہوئیں۔ جس کے نتیجہ میں معاشرتی اور اقتصادی حالات نے بدلنا شروع کیا اور انسانی
زندگی میں عیسائیت، وُہ مقام چھوڑ گئی جو اسے حاصل تھا۔ صرف رومن کیتھولک فرقے کے عیسائی اپنے
عقیدہ پر اڑے رہے۔ امریکہ دریافت ہُوا۔ اور قدامت پسند عیسائیوں کے تنگ کار اپنا وطن چھوڑ کر
نئی دُنیا کا رُخ کرنے لگے تاکہ وہاں آزادیٔ خیال پر بندشوں سے چھٹکارا حاصل کرسکیں۔ چھاپہ خانے
اور بھاپ کے انجن ایجاد ہُوئے۔ برقی قوت نے اِنسان کو ایک نئی طاقت سے روشناس کرایا۔ یہاں
تک کہ یورپ مشینوں کا ملک اور صنعتی پیداوار کی منڈی بن گیا۔ اس کی تجارت اور صنعتی پیداوار دُنیا
کے دُور دراز حصّوں میں پہنچنے لگی۔ تجارت نے نوآبادیوں کا سلسلہ شروع کیا۔ اور نوآبادیاں استبداد
کو ساتھ لائیں۔ اس سے نئے مسائل اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ ایک طرف صنعتی اُمراء کا طبقہ پیدا ہُوا۔
دوسری طرف افلاس زدہ مزدوروں اور کارخانوں میں کام کرنے والوں کا۔ آخر الذکر کھانے پینے،

سائل، بیکاری اور رہائش کے مسئلوں سے دوچار ہوئے ۔ ان بچاروں نے کارخانوں کے مالکوں کے ظلم سے بچنے کے لیے ٹریڈ یونینیں قائم کیں ۔ صنعتکاروں نے تالہ بندی سے جواب دیا۔ اِس طرح اِشتراکیت کے تخیل نے جنم لیا ۔ اِس نئے فلسفے نے بڑے بڑے مفکّر اور مدبّر پیدا کیے ۔ یہاں تک کہ بیمارزدہ افیونیوں کے ملک چین نے اِس تخیل کو اپنا کر اپنے ملک کا چہرہ بدل دیا اور یہ افیون نوش اور کاہل لوگ ایک ترقی یافتہ معاشرے کے ذمّہ دار رُکن بن گئے ۔ کسی مفکّر نے پیش گوئی کی تھی کہ یہ خطۂ زمین جس میں انسان کیڑے مکوڑوں کی طرح چلتے پھرتے ہیں اور افیون سے اپنے مصائب بھُولنے کی کوشش کرتے ہیں ایک خوابیدہ شیر ہے جو کسی نہ کسی وقت ہوشیار ہو کر رہے گا۔ رُوس پہلے ہی جنگِ عظیم اوّل کے بعد نظریہ اِشتراکیت کو قبول کر کے ایک ترقی یافتہ عالمی طاقت بن چکا تھا۔

قومیت کے نظریے نے زور پکڑا اور مختلف نسل کے لوگوں نے اپنے ہم نسلوں سے مل کر جنگ کے ذریعے ملکوں کی حدُود میں تبدیلیاں کر لیں اور اپنے لیے علیحدہ ملک بنا لیے ۔

تہذیبِ جدید اپنی اِنتہا کو پہنچ گئی اور قوموں کی رقابت سے پہلے جنگِ عظیم اوّل اور پھر بیس سال بعد جنگِ عظیم دوم لڑی گئیں جن میں اِنسانیت کا خون پانی کی طرح بہا۔ آئندہ جنگ بند کرنے کے لیے پہلے لیگ آف نیشنز قائم کی گئی مگر وُہ ناکارہ ہو کر رہ گئی ۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اقوامِ متحدہ کا ادارہ بنا۔ جنگِ عظیم دوم کے مجرموں کو جنگی جرائم کی پاداش میں تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔

ان دو جنگوں میں مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچا۔ پہلی جنگ میں ترکوں نے جرمنی کا حلیف بن کر شکست کھائی اور اپنا بہت سا علاقہ کھو بیٹھے مگر ان میں ایک ایسا محبِّ وطن شخص پیدا ہُوا جس نے ترکی کے کچھ حصّے کو بچا لیا اور سُلطانیت اور خلافت دونوں کو ختم کر کے اِسے دَورِ حاضر کا ایک ترقی یافتہ جمہوری مُلک بنا دیا اور اس طرح مذہب کو حکومت سے خارج کر دیا۔

عربوں نے اِتحادیوں کے ساتھ مل کر ترکوں سے بغاوت کی اور بطورِ عوضانہ دو چھوٹی چھوٹی بادشاہیاں حاصل کیں ۔ اِتحادیوں نے عرب دُنیا کے عین درمیان ایک یہودی مُلک اِسرائیل کی بنا رکھی ۔ عربوں کے لیے یہ نیا ملک مُستقل ناسُور بن گیا ۔ اِتحادیوں کی بڑی طاقتوں نے عملاً اسرائیل کی حفاظت کی ذمّہ داری لی اور اس کو ہر قسم کے دفاعی اور جارحانہ ہتھیاروں سے لیس کیا۔ تاکہ عرب ممالک حملہ کر کے اس نئے مُلک کو بے بس نہ بنا سکیں ۔ یا اس کو کُچل کر صفحۂ ہستی سے نہ مٹا دیں ۔ اپنی طاقت سے مخمور ہو کر اسرائیل نے تین دفعہ عربوں سے لڑائی کی اور ان کو شکست دی ۔ چوتھی لڑائی بھی لڑی گئی اور اگرچہ مصر نے صحرائے سینا کا کچھ حصّہ واپس لے لیا ۔ ٹھیک طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اِس میں کون جیتا اور کون ہارا ۔ ان جنگوں میں اِسرائیلی صحرائے سینا کے کافی علاقہ کے ساتھ شام اور اُردن کا بھی کچھ حصّہ دبا بیٹھے ۔ امریکہ نے فریقین میں صُلح کرانے کی ظاہرہ کوشش کی مگر اسرائیلی اپنے ہتھیاروں اور ہوائی جہازوں کے گھمنڈ پر اَڑے

رہے ہے ۔ اقوامِ متحدہ کی حفاظتی کونسل کے ریزولیوشن کی بھی اسرائیل نے پروانہ کی ۔ رُوس کچھ حد تک عربوں کا مددگار بنا مگر برائے نام ۔ فریقین کے درمیان ایک اور جنگ اب قریباً ناگزیر ہوگئی ہے ۔ اسرائیل کا وجود قائم ہونے سے لاکھوں فلسطینی عرب بے گھر ہوگئے ۔ یہ لوگ ایک سرسبز اور شاداب خطۂ زمین کے مالک تھے ۔ مگر اِن کو اَب کس مپرسی کی حالت میں رہتے ہوئے دو نسلیں گزر چکی ہیں اور وُہ یا تو کسی صحرا میں خیمے لگا کر یا آبادیوں کے اِرد گرد جھونپڑیاں بنا کر اقوامِ متحدہ کے بھکاری بنے بیٹھے ہیں۔ مگر مہذّب قوموں کے اِنسانی ضمیر نے ان کی بیچارگی، بے بسی اور مظلومی پر اب تک ان کو نہیں جھنجھوڑا۔ اگرچہ یہودی عربوں پر کئی لحاظ سے دُوسری قوموں کی مدد کی وجہ سے سبقت رکھتے ہیں ۔ مگر اَب عربوں کو اپنے اختلافات کے باوجود اِسلام کے رِشتہ نے اکٹھا کر دیا ہے ۔ اور جب تک عرب اِسرائیل سے، چھنے ہوئے علاقے واپس نہیں لیتے اور فلسطینی بے گھر آباد نہیں ہوتے اس تنازعہ کے حل کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ئہ کو مسلم لیگ کا وُہ ریزولیوشن، جس کو لاہور ریزولیوشن یا قرار دادِ پاکستان کہا جاتا ہے، پاس ہُوا ۔ اس قرارداد میں مسلمانانِ ہند نے اپنے علیحدہ اور خود مختار وطن پاکستان کا مطالبہ کیا اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ئہ کو قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی اَنتھک کوششوں سے پاکستان ایک نئی مملکت کی شکل میں دنیا کے نقشہ پر نمودار ہُوا ۔

پاکستان اِسلام کے نعرے پر ۱۹۴۷ میں ہندوستان سے علیحدہ ہُوا مگر ان دونوں ملکوں میں تین دفعہ جنگ چھڑ چکی ہے ۔ تیسری جنگ میں رُوس کی مدد سے ایک بین الاقوامی سازش کے تحت بھارت پاکستان کے مشرقی حِصّہ کو علیحدہ کرنے میں کامیاب ہوگیا ۔ مشرقی پاکستان ملک سے کٹ کر بنگلہ دیش بن گیا۔

ہندوستان کا آئین ایک جمہوری آئین ہے جس کو دنیا میں سب سے بڑا جمہوری آئین کہا جاتا ہے مگر جب بھارت کی وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی کے انتخاب کو الٰہ آباد ہائی کورٹ نے کالعدم قرار دے دیا تو مسز اندرا گاندھی نے ایسے اقدامات کیے کہ وُہ آمرِ مطلق بن بیٹھیں اور ظاہر یہ کیا گیا کہ یہ سب اقدامات آئین کے مطابق کیے گئے ہیں ۔ گویا کہ بھارت کے جمہوری آئین کے اندر رہ کر جمہوریت کو آسانی سے ٹھکرایا جا سکتا ہے ۔

اُدھر بنگلہ دیش میں حالات نے رنگ بدلا اور ۱۹۷۵ کے یومِ پاکستان کی تقریبات ابھی ختم ہُوئی ہی تھیں کہ ۱۵ اگست ۱۹۷۵ئہ کی صبح کو تین بجے بنگلہ دیش کے آمرِ مطلق بنگلہ بندھو شیخ مجیب الرحمٰن کی حکومت کے خلاف فوج نے بغاوت کی ۔ شیخ موصوف اور اس کے چند حواریوں اور عزیزوں کو قتل کر دیا گیا اور سابقہ مشرقی پاکستان کو پھر اسلامی جمہوریہ بنگلہ دیش کا نام دے دیا گیا ۔ گویا کہ ۱۹۴۰ کی قرار دادِ پاکستان کی لفظی تعمیل ہوگئی ۔ مگر چند دن بعد 'اسلامی' کا لفظ ریاست کے نام سے خارج کر دیا گیا ۔ اور ایک اَور انقلاب کے بعد نئی حکومت قائم ہوئی ۔

اٹھارویں صدی سے یورپ میں دہریت اور لا ادریت کی ایک لہر اُٹھی ۔ چین نے بھی یہ نظریہ اختیار کرلیا۔ اس تحریک نے دنیا کو دو بڑے حصوں اور طاقتوں میں تقسیم کر کے دُنیا کا نقشہ بدل ڈالا۔ ایٹم کو منتشر کرنے کی قوت نے اس خلیج کو اور بھی وسیع کر دیا ہے ۔ روس اور امریکہ میں ایک کشمکش اور بے اعتباری پیدا ہو گئی ہے اور یہ دونوں ملک مہلک سے مہلک ہتھیار بنانے اور خلا پر قابو پانے کی دوڑ میں اتنے مصروف ہو گئے ہیں کہ تیسری عالمگیر جنگ کو بعید از امکان نہیں کہا جاسکتا۔ اس سائنسی اور فنی جدو جہد میں اسلامی ملکوں کے مسلمان علیحدہ کھڑے ہو کر تماشائی بنے رہے ہیں ۔ یہ مختصر حالات تہذیبوں اور اقتصادی عملوں کا ہے جو اسلام سے پہلے اور اس کے طلوع ہونے کے بعد دنیا میں ظہور پذیر ہوئے اور ان کا ملحوظ خاطر رکھنا اسی لیے ضروری ہے کہ درست طور پر اندازہ لگایا جاسکے کہ اسلام نے اس سارے کھیل میں کیا حصّہ لیا اور ارتقاءِ بنی نوع انسان میں اس نے کیا کردار ادا کیا۔

❁❁❁:❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

باب ۲
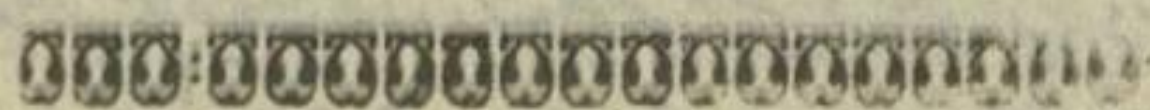
دُنیا قبل از اِسلام ۔ بُتوں کا راج

قطع نظر اس مذہبی عقیدہ کے جو یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں مشترک ہے کہ تخلیق انسان حضرت آدمؑ سے ہوئی ۔ محققینِ سائنس اور آثار قدیمہ اب تک یہ معلوم نہیں کر سکے کہ نسلِ انسان کب سے شروع ہوئی ؟ پہلا انسان کب اور کہاں پیدا ہوا ؟ ایک جگہ یا مختلف مقامات پر ؟ ایک وقت یا مختلف اوقات میں ؟ نسلوں کی جسمانی ساخت میں اختلافات کی کیا وجہ ہے ؟ مگر وہ اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ موجودہ انسان ارتقاءِ حیوانی کی ایک منزل ہے ۔

حالیہ تحقیقات سے شبہ ہوتا ہے کہ انسانی تہذیب جنوب مشرقی ایشیا سے دس ہزار قبل مسیح شروع ہوئی مگر عام طور پر یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ تہذیب اور معاشرے کی ابتدا چھ سات ہزار سال قبل مسیح ان قوموں سے ہوئی، جو ایک جھیل کے کنارے پر جو بحیرۂ روم کے نشیب میں واقع تھی آباد تھیں۔ اُس وقت بحیرۂ رُوم ایک بڑا خشک نشیب تھا جس کے وسط میں ایک چھوٹی سی جھیل تھی ۔ پندرہ سے دس ہزار سال قبل مسیح ایک ایسا وقت آیا کہ سورج کی حرارت سے قطب شمالی کی برف نے پگل کر بحر ظلمات کے پانی میں اضافہ کر دیا اور سطح سمندر اتنی اونچی ہو گئی کہ پانی نے جبل الطارق کی خشک چٹان کے اس حصّہ سے گزر کر جو مراکش اور ہسپانیہ کو ملاتا تھا، بحر ظلمات کو بحیرۂ روم سے ملا دیا ۔ نتیجتاً ان قوموں کو، جو بحیرۂ رُوم کے نشیبی حصّہ میں جھیل کے کنارے پر آباد تھیں اُوپر آ کر بحیرۂ روم کے ساحل کے ساتھ آباد ہونا پڑا ۔ اس طرح مصر، دریائے فرات اور دجلہ کی وادیاں، یونان، ایشیائے کوچک، اٹلی، سسلی، قرطاجنہ اور ساحلِ افریقہ آباد ہو گئے ۔ ایک اور نظریہ یہ ہے کہ قدیم تہذیب ان لوگوں کی نقل مکانی سے شروع ہوئی ۔ جو صحرائے عرب اور افریقہ میں رہتے تھے ۔ یہ قطعہ تب ایک سر سبز علاقہ تھا مگر جب وہ طبعی تبدیلی کے باعث خشک ہونا شروع ہوا تو کچھ باشندے تو مصر چلے گئے، کچھ دریائے فرات کے سر سبز علاقے کی طرف اور کچھ جزیرۂ کریٹ میں جا بسے جہاں انہوں نے مائی نوین (MINOEN) تہذیب کی بنیاد ڈالی ۔ کچھ لوگ صحرا ہی میں ٹھہرے رہے جو یا تو خانہ بدوش بن گئے یا خوراک اور پانی کی قلت کے باعث مر گئے ۔ اگر موخرالذکر نظریہ نہ مانا جائے تو سب سے پہلی تہذیب، جس کا مورخین

کو پتہ چلتا ہے، وادیٔ فرات میں واقع شہر سمیر، نہ کہ جزیرۂ کریٹ سے شروع ہوئی اور دریائے فرات کے ساتھ ساتھ اس کے دہانے تک پہنچ گئی۔ باشندگانِ سمیر نے اپنے دیوتا ال ال کی تعظیم میں ایک قصبہ سمیر کے نام سے تعمیر کیا۔ سمیر کو نزدیک کی دوسری اقوام نے، جن میں آشوری بھی شامل تھے، فتح کر لیا اور یہاں ایک عبرانی قوم نے شہنشاہی بابل کی بنیاد رکھی۔ اس قوم کا حکمران مشہور ہمورابی تھا جو سمجھتا تھا کہ اس کو سمیر اور اکد کی حکمرانی آمو اور بل دیوتاؤں نے بخشی ہے۔ ہمورابی نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ اس کو شمس دیوتا نے ایک ضابطۂ قانون دیا ہے جو اس کی رعایا پر نافذ العمل ہوگا۔ بابل کا سب سے بڑا دیوتا بل مردوک تھا جس کی اہل بابل پرستش کرتے تھے۔

آشوریہ، مصر، ہندوستان، یونان، عرب اور بہت سے دیگر ممالک میں بیشمار دیوتا تھے۔ جن کے متعلق عوام کا یہ خیال تھا کہ وہ انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر وہ چاہیں تو انسان کو خوشحال رکھ سکتے ہیں اور چاہیں تو وہ اس پر کوئی مصیبت یا بلا نازل کر سکتے ہیں۔ ان دیوتاؤں کو بُت کی شکل دے کر مندروں میں پروہتوں کی تحویل میں رکھا جاتا تھا۔ جہاں ان کی پوجا کی جاتی تھی اور ان پر چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں سوائے اسرائیل کے اور کوئی قوم یا ملک نہ تھا جو بُت پرستی نہ کرتا ہو۔

انسان اپنی پیدائش سے قدرت کے کچھ خوفناک مناظر دیکھتا رہا۔ جن سے وہ خائف رہتا تھا۔ وہ یقین رکھتا تھا کہ انسان پر جو آفتیں نازل ہوتی ہیں، مثلاً سیلاب، زلزلہ، قحط، بجلی کا گرنا، وہ سب دیوتاؤں کی مرضی سے نازل ہوتی ہیں۔ ان سب آفتوں سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے اور وہ دیوتاؤں کو مختلف طریقوں سے خوش رکھنا ہے۔

انسان یہ بھی یقین رکھتا تھا کہ اس کے آباو اجداد کی روحیں بھی اس کی زندگی میں دلچسپی لیتی ہیں اور اس کی ہر سرگرمی پر نظر رکھتی ہیں۔ اس کو خوشی دے سکتی ہیں یا اس پر کوئی آفت نازل کر سکتی ہیں۔ اسی لیے اپنے آباو اجداد کی روحوں کو خوش رکھنا ضروری ہے۔ اور اس کا اور کوئی طریقہ نہیں۔ سوائے اس کے کہ ان کے بُت بنا کر ان کی پوجا کی جائے اور ان پر نذرانے چڑھائے جائیں۔ وحشی جانور بھی اس کو نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اس نقصان سے بچنے کے لیے جانوروں کی بھی پرستش شروع ہوئی۔ سانپ، شیر، ہاتھی، گینڈا، مگرمچھ اور پرندوں کے بُت بنے اور ان کی پوجا شروع ہوئی۔ مصر کے بہت سے دیوتا پرندوں کی شکل میں تھے۔ ستاروں اور سیاروں کے متعلق بھی قدیم انسان کا یہ خیال تھا کہ وہ بھی اس کی زندگی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ان کے مفروضہ مجسمے بنا کر اور ان کی پرستش سے ان کا مضر اثر زائل کیا جا سکتا تھا اور بہتری کی توقع رکھی جا سکتی تھی۔ اس طرح مختلف اقوام اور ممالک میں بیشمار بُت وجود میں آئے اور ان کی پرستش کے باعث ایک مذہبی پرستش کا نظام قائم ہو گیا جس

میں دیوتاؤں، مندروں اور ان کے پروہتوں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی۔ اس نظام نے انسانی دماغ پر ایسا غلبہ پایا۔ کہ جب سکندر اعظم کی ماں نے اسے بتایا کہ وہ اپنے باپ فلپ کے نطفہ سے پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کا باپ ایک دیوتا ہے۔ تو اپنی فتوحات کے دوران جب وہ مصر پہنچا تو اپنی ولدیت کی تصدیق کے لیے وہ ممفس (MEMPHIS) سے روانہ ہو کر چار سو میل کی مسافت کے بعد امین (AMMON) کے نخلستان گیا اور وہاں کے دیوتا سے اس کے کاہن کے ذریعہ حقیقت دریافت کی تو دیوتا نے اسے بتایا کہ وہ دراصل اس کا اپنا بیٹا ہے۔ اپنی ماں کے شوہر کا نہیں۔

اور جب حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کو ایک خدا کا تصور دیا اور بت پرستی سے منع کیا تو آپ جب کوہ طور سے اترے تو آپ نے دیکھا کہ آپ کی غیر حاضری میں آپ کی قوم نے ایک بچھڑے کا سنہری بت بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی ہے۔ یہ دیکھ کر آپ اتنے برہم ہوئے کہ آپ نے بچھڑے کے پجاریوں کو قتل کر دینے کا حکم صادر کر دیا۔ اس حکم کی تعمیل میں ایک خدا کے معتقدین نے بچھڑے کے پجاریوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اس ہنگامے میں باپ نے بیٹے کو، بیٹے نے باپ کو اور بھائی نے بھائی کو قتل کیا۔ مقتولوں کی تعداد پہلے ہی دن تئیس ہزار تک پہنچ گئی۔ یہ واقعہ توریت کے باب تئیس میں ہارون کی زبانی جو حضرت موسیٰ کے بھائی تھے درج ہے۔ اس بت پرستی کے بعد بے جان چیزوں کی پرستش نے رواج پایا اور دریاؤں، ندیوں، پہاڑ کی چٹانوں وغیرہ کی پوجا شروع ہوئی۔ درختوں اور حشرات الارض کی بھی پرستش ہونے لگی۔ مصر میں فراعنہ خود دیوتا بن بیٹھے۔ ایک مجسمے میں شاہیں دیوتا کو خافو فرعون کے سر کے پیچھے بیٹھے دکھایا گیا ہے اور رمسس (RAMASES) سوئم کے کفن کے چوبی صندوق پر تین دیوتاؤں کے بیٹھنے کی علامات دکھائی گئی ہیں۔ پیپرس کے ایک پتے پر ایک تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ خنیفر ایک میز کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھا ہے اور میز پر آجکل کے ججوں کی طرح کئی ایک دیوتا انصاف کی کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ خنیفر کے چہرے پر خوف کے آثار نمایاں ہیں اور وہ ایک سفید کفن میں ملبوس ہے۔ اس کو ہاتھ سے پکڑ کر ایک گیدڑ کی شکل کا دیوتا مصمم ارادے کے ساتھ ایک ترازو کی طرف گھسیٹ کر لے جا رہا ہے۔ جہاں اس کا دل ایک پر کے وزن کے مقابلہ میں وہی گیدڑ شکل دیوتا تول رہا ہے اور تول کے نتیجہ کو ایک اور دیوتا کے پاس، جو شکل سے تعلق معلوم ہوتا ہے، پہنچایا جا رہا ہے۔ اس کے بعد مردہ خنیفر فرعون ایک شاہیں شکل دیوتا اور ایک دوسرے دیوتا کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ جنہوں نے سزا یا جزا کا فیصلہ کرنا ہے۔ چونکہ فراعنہ اپنے آپ کو دیوتا سمجھتے تھے اس لیے وہ اپنے خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے تھے۔ سارے فراعنہ میں سے صرف ایک فرعون اخناطون گزرا ہے جو صرف خدا کا اور وہ بھی سورج کے خدا ہونے کا قائل تھا۔ اس کے اس طریقے سے مواحد ہونے کا پورا جواز بھی تھا کیونکہ اس نے اپنی بہن نفرطیطی (NEFERTITI)

سے شادی کی تھی جو خوبصورتی میں بے مثل تھی۔ اس کی خوبصورتی کا اندازہ اس کی کئی تصویروں سے لگایا جاسکتا ہے جو اب تک اس کے مجسّمے کی موجود ہیں۔

دورانِ جنگ ہر فریق کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ فریق مخالف کے دیوتا کو اُٹھا کر اپنے دیوتا کے پاس بغرض اطاعت لے جائے۔ اور یہی فتح و شکست کا معیار ہوتا تھا۔ چنانچہ جب اہل ایلم بابل کے بڑے دیوتا بل مردوک کو اٹھا کر لے گئے تو اہل بابل نے اپنے آپ کو خود مختار نہ سمجھا۔ جب تک بعد کی لڑائی میں وہ بل مردوک کو واپس بابل نہ لے آئے۔

انجیل میں درج ہے کہ جب فلسطینی قوم جو بنی اسرائیل کو بہت ستاتی تھی اسرائیلیوں کے لکڑی کے صندوق کو جس کے اندر توریت کی تختیاں محفوظ تھیں اپنے مچھلی شکل دیوتا کے مندر میں جو اشدود میں واقع تھا لے جا رہے تھے اور یہ دیوتا گر کر ٹوٹ گیا تو اہل اشدود پر ایک آفت وبا کی شکل میں نازل ہو گئی۔ بابل کا کوئی بادشاہ اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھتا تھا جب تک کہ بل مردوک کے مندر کے پروہت اس کو بل مردوک کے پسر کا درجہ نہ دے دیں۔ اور فارس کے شہنشاہ سیروس نے بابل کو بل مردوک کی برکت سے ہی اپنی قلمرو میں شامل کیا تھا اور یہودیوں کو، جن کو بخت نصر یروشلم سے قید کر کے بابل لے آیا تھا، آزاد کر کے یروشلم واپس بھیج دیتا تھا۔

جاپان، کوریا، ہندوستان، افریقہ اور جنوبی امریکہ میں دیوتاؤں کو خوراک بطور نذرانہ دینے کی رسم عام تھی۔ قدیم عراق میں تقریباً چار ہزار سال پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سماوی آفتیں، جو بتوں کی شکل میں گھڑ کر دکھائی جاتی تھیں، خوراک کے نذرانے سے خوش ہوتی ہیں۔ دلیل یہ تھی کہ دیوتا بت کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور بت خود دیوتا کا جسم بن جاتا ہے۔

انسانی قربانی کی رسم بہت قدیم ہے۔ یہ قربانی کسی کے مرنے پر یا فوراً بعد دی جاتی تھی۔ خیال یہ تھا کہ اس طرح مردہ شخص کا جسم اسی طرح طاقت پکڑتا ہے جیسے کہ انسان کا جسم خوراک کھانے سے۔ قدیم چین میں وہ شخص قربانی کے لیے چُنے جاتے تھے جو لڑائی میں قید کر لیے گئے ہوں۔ پروہتوں کا اعتقاد تھا کہ ایسی قربانی سے ان کے دیوتا مسرت پاتے ہیں۔ ہندوستان میں انسانی قربانی انیسویں صدی تک جاری رہی۔ قدیم اہل یونان اور رومہ اور دیگر مغربی ممالک بھی انسانی قربانی کے قائل تھے۔

ملک پیرو کے جمہور بادشاہ فراعنۂ مصر کی طرح خود دیوتا ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور اپنے آپ کو دو ستاروں کی اولاد سمجھتے تھے۔ ان کے مرنے پر ان کی قبروں میں رعیت کی عورتوں کو قربان کر کے ان کے ساتھ دفن کر دیا جاتا تھا تاکہ وہ ان کی نفسانی خواہشات کو مرنے کے بعد بھی پورا کر سکیں۔ حالیہ کھدائیوں سے پتہ چلا ہے کہ صرف ایک ٹیلے میں تین سو عورتوں کو دفن کیا گیا تھا جن کے پنجر

برآمد ہونے پر ثابت ہوا کہ وہ سب جوان عورتیں تھیں جو قربان کی گئی تھیں ۔ قدیم امریکہ میں اہم عمارتوں کی بنیاد بھی قربان کی ہوئی عورتوں کی لاشوں پر رکھی جاتی تھی[1]۔

وسطی امریکہ کے ملک میکسیکو میں ہسپانیہ کے تسلّط سے پہلے ایک قوم ازٹک (AZTEC) آباد تھی ۔ جن کے آثار قدیمہ کی کھدائیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاصی مہذّب قوم تھی ۔ اس قوم میں رواج تھا ۔ کہ انسانوں کو زندہ لٹا کر ان کے سینے سے دل نکالے جاتے تھے ۔ جن کو بھون کر مندر کے اندر دیوتا کو پیش کیا جاتا تھا ۔ سلطنت روم کے ابتدائی زمانہ کے عیسائی یا تو یہودیوں کی اولاد تھے یا وہ یہودیت سے متاثر تھے ۔ وہ یسوع ناصری ، بی مریم ، یسوع کے چیلوں اور شہیدوں کے مجسّموں اور تصویروں کی پرستش کے خلاف تھے ۔ مگر جب یسوع کی تصویریں ، جو دیر تک زیر زمین دفن تھیں ، اس وقت دکھائی گئیں جب نوشیرواں نے عُرفہ پر حملہ کیا اور عُرفہ حملے سے محفوظ رہا تو ایسی تصویروں اور مجسّموں کی پرستش زور شور سے شروع ہو گئی اور چھٹی صدی عیسوی کے اختتام تک یہ پرستش عیسائیت کا اہم جزو بن چکی تھی ۔

عرب قبل از اسلام

کروڑوں سال گزرے کہ عرب برّاعظم افریقہ کا ایک حصّہ تھا اور حبش سے جڑا ہوا تھا ۔ اس عجیب اور بیابانی خطہ زمین کے کوائف پوری طرح کسی کو معلوم نہیں البتہ یونانی اور رومی مؤرخوں نے اپنی تحریروں اور تصانیف میں کہیں کہیں اس کا سرسری طور پر ذکر کیا ہے اور پھر ساتویں صدی عیسوی میں یہی سرزمین تاریخ کے پورے اجالے میں اس وقت کی بڑی بڑی سلطنتوں کے مقابلے میں اُکھڑی ہوئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں ان کو تباہ کرنے کے بعد ایک عالمی تہذیب کا گہوارہ بن گئی ۔ جس نے بنی نوع انسان پر ایسا گہرا اثر ڈالا جو کسی تہذیب نے تخلیق انسان کے بعد نہیں ڈالا تھا ۔

عرب کا نام ایک شخص یعرب سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ جس کا سلسلہ سام سے ملتا تھا ۔ عرب دنیا میں سب سے بڑا جزیرہ نما ہے جو ایشیا کی مغربی سرحد پر واقع ہے ۔ وسعت میں یہ سارے یورپ کے ایک تہائی حصّہ کے برابر ہے ۔ اس جزیرہ نما کی زیادہ سے زیادہ لمبائی ۱۴۰۰ میل ہے اور زیادہ سے زیادہ چوڑائی ۱۳۰۰ میل ۔ یہ ملک فارس ، شام اور مصر سے گھرا ہوا ہے جن ملکوں کے باشندے قدیم زمانہ کی مہذب قوموں میں شمار ہوتے تھے ۔ اس کے تین طرف سمندر ہے ۔ بحر ہند اس کے جنوبی ساحل کے ساتھ ایک ہزار میل تک ملتا ہے ۔ بحر احمر اس کے مغرب سے ملحق ہے ۔ اور خلیج فارس اور خلیج عمان اس کے مشرق میں واقع ہیں ۔ اس سرزمین کو تین حصوں میں تقسیم کیا

---

[1] NATIONAL GEOGRAPHIC FOR MARCH 1973

جاسکتا ہے :-

(۱) نجد جس میں کہیں کہیں سرسبز وادیاں اور چراگاہیں ہیں۔

(۲) صحرائے عرب جو نجد کے جنوب میں واقع ہے اور ریتلا اور پتھریلا علاقہ ہے۔ جہاں نہ کوئی سایہ ہے، نہ کوئی پناہ گاہ، اور جس پر جنوب مغربی ہوا تھپیڑے مارتی رہتی ہے اور اپنے ساتھ ایسی نمی لاتی ہے جو انسان کے لیے مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ اس صحرا میں بسا اوقات لشکر اور قافلے ایک جگہ سے اُڑ کر دوسری جگہ جانے والی ریت کے ٹیلوں میں دب جاتے ہیں۔ مگر اس صحرا میں کہیں کہیں نخلستان، پوشیدہ چشمے اور کنوئیں بھی ہیں جہاں بدوی لوگ نقل مکانی کے دوران آرام کے لیے ٹھہر جاتے ہیں اور ان کے مویشیوں کو چارہ بھی مل جاتا ہے۔

(۳) یمن جو اس خطۂ زمین میں واقع ہے جو بحر ہند اور بحر احمر کے ساتھ ملتا ہے۔ بحر احمر کے ساتھ ملنے والے علاقہ کو جس میں مکہ واقع ہے حجاز کہتے ہیں۔

عرب کی موجودہ آبادی ایک کروڑ کے لگ بھگ ہے اور ازمنۂ قدیم میں یہ ایک تجارتی ملک رہا ہے۔ کیونکہ ایک اہم تجارتی شاہراہ، جو مکہ اور مدینہ سے کچھ فاصلہ سے گذرتی ہوئی جنوبی سمندر کو شام سے اور بحیرۂ روم کے ساحلوں پر واقع شہروں سے ملاتی تھی، اس میں سے گزرتی تھی۔ عرب کے جنوبی اور مغربی حصہ میں پانی وافر ہے اور کچھ درخت بھی ہیں اور کیونکہ اس خطہ کی ہوا معتدل ہے۔ اس کے بعض حصوں میں نہایت لذیذ پھل بھی پیدا ہوتے ہیں اور انسانی اور حیوانات کی آبادی بھی کافی ہے۔ اس لیے اہل روم اس خطہ کو خوش قسمت وادی کہتے تھے۔ یونانی بھی اس خطے کی خوبیوں سے واقف تھے اور یمن کا تو ان کی تحریروں میں اکثر ذکر آتا ہے۔ اُس زمانہ میں یمن اتنا خوشحال تھا کہ مآرب کے عظیم بند کی وجہ سے، جس میں پانی کم زیادہ کرنے کے لیے تیس ریگولیٹر تھے، اس خطہ کو دنیا میں سب سے زرخیز علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ اس بند کے تعمیر کرنے والے کے نام کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ اگرچہ دو نام حمیر اور لقمان اس سلسلے میں لیے جاتے ہیں۔

مسلم مؤرخوں کے مطابق جب ملکہ بلقیس، جو اُس وقت یمن پر حکمران تھی، حضرت سلیمانؑ کو، جو اپنی دانائی، خوش پوشی اور شان و شوکت میں یکتا تھے، ملنے کے لیے یروشلم کی طرف روانہ ہوئی تو اس کے ساتھ تین عسکری دستے اور ہر دستے میں ایک ہزار سپاہی تھے اور وہ اپنے ساتھ جواہرات، قیمتی پتھر، طرح طرح کی خوشبوئیں اور مصالحے بھی ساتھ لے گئی۔ اگر یہ بلقیس وہی ہے جو ملکہ شیبا (SHEBA) کے نام سے پکاری جاتی تھی تو اس واقعہ کی توریت کے کنگز (KINGS) کے دسویں باب سے تصدیق ہوتی ہے۔ جہاں مرقوم ہے کہ جب ملکہ شیبا (SHEBA) تک حضرت سلیمانؑ کی شہرت پہنچی تو وہ ان سے بحث کرنے کے لیے اور پہلے سے تیار کیے ہوئے سوالوں کا جواب

پوچھنے کے لیے یروشلم گئی - اس کے ساتھ اس کے خادموں اور مشیروں کی ایک بڑی جماعت تھی۔ اور اُس قافلے میں بے شمار اونٹ تھے جن پر مختلف قسم کے خوشبودار مصالحے، سونا اور قیمتی جواہرات لدے ہوئے تھے -

عرب کے باشندے

رسول مقبول ؐ کے اس ملک کا انتظام سنبھالنے سے پہلے نہ یہاں کوئی قانون تھا، نہ کوئی نظامِ حکومت - اگرچہ عرب سلطنتِ روما کا علاقہ رہا تھا اور یمن کو اہل فارس اور اہل حبش کئی دفعہ حملہ آور ہو کر مطیع کر چکے تھے - تاہم عربوں کی آزادی میں کوئی فرق نہ آیا تھا - مکّہ اور مدینہ کے شہر بھی تورانیوں کے زیر اثر رہے تھے - مگر اس سے بھی ان کی آزادی کسی طرح متاثر نہ ہوئی - بہت عرصہ بعد ترکوں اور مصریوں نے بھی اسے اپنا مفتوحہ علاقہ سمجھا اور اپنے زیر اثر لانا چاہا - مگر پھر بھی عرب قانوناً اور حقیقتاً آزاد ہی رہے - کیونکہ ترکوں اور مصریوں کی حکومت برائے نام تھی اور کبھی بھی موثر نہ ہو سکی - بڑے بڑے بادشاہ مثلاً سیسوسترس (SESOSTRIS) سیروس (CYRUS) شاہ فارس، رومی جنرل پومپے (POMPEY) نے بھی اس ملک کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کی کوشش کی مگر اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے - عربوں کی آزادی کا راز ان کی ذہنیت، ملک کی طبعی ہیئت اور ان کے گھوڑے اور اونٹ تھے - اگرچہ ہر قبیلہ اپنے سردار کے ماتحت خود مختار تھا جس کا کسی دوسرے قبیلے سے کوئی تعلق نہ تھا تاوقتیکہ کسی قبیلے کی کسی دوسرے قبیلے کے ساتھ لڑائی نہ چھڑ جائے جو ایک دفعہ شروع ہو کر صدیوں جاری رہتی تھی - مگر جب کسی بیرونی طاقت نے عربوں پر حملہ کیا تو سب قبائل اپنے اختلافات کو ایک طرف رکھ کر دشمن کے خلاف متحد ہو جاتے تھے اور اس پر تیروں، تلواروں اور برچھیوں سے حملہ کر دیتے تھے - وہ اپنی یقینی فتح سمجھتے تھے - اگر وہ شکست بھی کھا جائیں تو اپنے اونٹوں، جو پچاس میل کی مسافت ایک گھنٹے میں طے کر سکتے تھے، یا اپنے گھوڑوں کو دوڑا کر، جو تیز رفتاری میں آپ اپنی مثال تھے، تپتے ہوئے صحرا اور ریت کے ٹیلوں کی طرف بھاگ جاتے تھے - اگر دشمن ان کے تعاقب کی بیوقوفی کرتا تو وہ ٹیلوں میں گم ہو کر بھوک پیاس سے مر جاتا تھا -

رسول کریم ؐ کی پیدائش سے دو سال پہلے بعض مؤرخوں کے مطابق پیدائش کے سال، حبشی لشکر کے جرنیل ابرہہ نے عرب پر حملہ کیا تھا - تاکہ وہ خانہ کعبہ کو مسمار کر ڈالے مگر اس کو اپنے ہاتھیوں اور ساتھیوں سمیت واپس لوٹنا پڑا - کیونکہ اُس دور کے مؤرخوں کے مطابق لشکر میں چیچک پھوٹ پڑی اور آسمان سے ژالہ باری ہونے لگی تھی - قرآن حکیم میں اس واقعہ کا ذکر صحاب فیل کے حوالے سے دیا گیا ہے اور ان کی شکست کا باعث ابابیلوں کا آسمان سے کنکریاں پھینکنا بیان کیا گیا ہے - مگر

اللہ میاں کبھی کبھی کنایتہً بھی نو بات سمجھا جاتے ہیں (۲۴/۳۹)

جو عرب صحرا میں رہتے تھے وہ اس تہذیب کے نزدیک تک نہیں گئے تھے جو ان کے تین طرف پھیلی ہوئی تھی ۔ ان کا کوئی سیاسی نظام نہ تھا اور ان کی اقتصادی زندگی سادگی کا نمونہ تھی کیونکہ صحرا میں کوئی سڑک نہ تھی اور کوئی دریا یا مستقل ندی نہ ہونے کی وجہ سے وہ کوئی کشتی یا جہاز بھی استعمال نہیں کر سکتے تھے ۔ ان کے سردار تھوڑی بہت تجارت پر گزارہ کرتے تھے ۔ یہ صحرا نورد جگہ جگہ اس غرض سے نقل مکانی کرتے رہتے تھے کہ ان کے اونٹوں اور گھوڑوں کو چارہ مل جائے اور ان کو بھی بھوک پیاس بجھانے کے لیے کچھ ہاتھ آجائے ۔ سال میں صرف ایک دفعہ حج کے موقعہ پر ان کو ایک دوسرے سے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا ۔ جہاں یا تو وہ اپنی تجارتی مہموں کا ذکر کرتے تھے ۔ یا کسی شاعر سے کوئی رزمیہ یا عشقیہ نظم سنتے تھے ۔ حج وہ ضرور کرتے تھے اور کعبہ کے بتوں سے اپنے لیے دعا مانگتے تھے کہ وہ ناگہانی آفتوں سے محفوظ رہیں ۔ ہر ایک قبیلہ کی زبان علیحدہ تھی مگر وہ مکہ کی زبان کو شستہ سمجھتے تھے ۔ اور یہی زبان شعرا ، قصیدہ خوانوں اور افسانہ نویسوں کی مرغوب زبان تھی ۔

جغرافیائی لحاظ سے عرب ایک ملک تھا اور اس کی مشترکہ زبان عربی تھی ۔ یہ دونوں باتیں ایک قوم کی تعمیر کے لیے ضروری عنصر ہیں ۔ مگر جب تک کوئی قانون نافذ العمل نہ ہو اور کوئی قانون ساز ادارہ ملک میں موجود نہ ہو مشترکہ زبان اور ملک خود کوئی حیثیت نہیں رکھتے ۔ اسی لیے عرب میں قبل از اسلام نہ کوئی ملت تھی اور نہ کوئی متحد قوم ۔

اسلام کی ابتدا سے پہلے عورتوں کو ایک قسم کی جائیداد منقولہ سمجھا جاتا تھا ۔ باپ کی وفات کے بعد اس کی بیوائیں اور داشتہ عورتیں جن کی تعداد متوفی کی استطاعت کے مطابق ہوتی تھی متوفی کے بیٹے کے قبضہ میں آتی تھیں جن کو وہ سوائے اپنی سگی ماں کے خواہشات نفسانی پوری کرنے کے لیے استعمال کر سکتا تھا ۔ اسی طرح ہر عورت ، خواہ وہ شادی شدہ ہو ، غیر مردوں کے ساتھ جنسی تعلقات رکھ سکتی تھی ۔ مگر ایسا کرنے سے عورت کے خاوند اور اس کے رشتہ داروں کے ساتھ قبائلی فساد شروع ہو جانے کا امکان ضرور پیدا ہو جاتا تھا ۔ محرمات سے مباشرت کی تعریف زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی ہے ۔ اگرچہ موجودہ تہذیب اور اسلام اس فعل کو قبیح اور قابل تعزیر قرار دیتے ہیں ۔ قدیم عرب میں اس کی کوئی متعین تعریف نہیں تھی اور نہ ہی ایسے فعل کا ارتکاب مذموم سمجھا جاتا تھا ۔ غلاموں کے کوئی حقوق نہیں تھے اور ان کے ساتھ حیوانوں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا تھا ۔ شراب کا استعمال عام تھا اور جوا کھیلنا ایک دلچسپ مشغلہ ۔ دختر کو غیر خاندان میں شادی میں دینا اپنے خاندان کی تحقیر خیال کیا جاتا تھا ۔ اس لیے دختر کشی کا عام رواج تھا اور اس ظالمانہ فعل کو قابل مذمت خیال نہیں کیا جاتا تھا ۔ دن دہاڑے رہزنی اور قتل کے واقعات روزانہ ہوتے تھے اور معمولی واقعات

سمجھے جاتے تھے ۔ عرب انسانی قربانیوں سے بھی ناواقف نہ تھے ۔

مگر یہ گھناؤنی اور تاریک تصویر عرب معاشرے کا ایک طرفہ رخ ہے ۔ عربوں میں خوبیاں بھی بدرجہ اتم موجود تھیں ۔ ان کی شجاعت، فصاحت، آزادی اور مہمان نوازی اس تصویر کا دوسرا رخ ہیں۔ اگر کوئی بدوی پناہ لینے یا بھوک پیاس بجھانے کے لیے کسی دوسرے بدوی کے خیمہ میں داخل ہو جاتا تو اس کو یہ دونوں چیزیں صرف مانگنے پر مل جاتی تھیں اور رخصت ہوتے ہوئے پناہ گزین یا گرسنہ اجنبی کو کچھ عطیہ بھی مل جاتا تھا ۔ پناہ گزین کی حفاظت میں میزبان جان کی بازی لگا دیتا تھا ۔ ایک نمایاں خصوصیت عربوں میں یہ تھی کہ کوئی عرب دوسرے عرب کے مذہب پر معترض نہیں ہوتا تھا ۔ اور نہ دوسرے عرب کے مذہب میں کوئی مداخلت کرتا تھا ۔ اس طرح طلوعِ اسلام کے وقت یہودی، عیسائی، زرتشتی اور مجوسی بلا روک ٹوک زندگی بسر کر رہے تھے ۔ عربوں کی اسلام دشمنی کی اصل وجہ ان کی مذہبی تنگ نظری نہ تھی ۔ عربوں کو اپنی شخصی اور سیاسی آزادی، طریقۂ عبادت اور آزادئ خیال سے بے پناہ محبت تھی ۔ مگر اسلام نے ان کو اپنے بتوں کی پرستش چھوڑ کر ایک خدا کی عبادت کا سبق دینا شروع کیا اور اس بات کو عربوں نے اپنی ذہنی اور پرستش کی آزادی پر ایک حملہ سمجھا ۔ وہ یہ بات سمجھنے کے قابل نہ تھے ۔ جب تک یہ راز کھل کر سامنے نہ آ گیا کہ ایک خدا کی پرستش ان کو ایک جگہ پر لا کر ایک قوم بنا دے گی اور ان میں وہ طاقت اور اقتدار پیدا کر دے گی جس کا وہ خواب میں بھی تصور نہ کر سکتے تھے اور جو اُن سے پہلے تاریخ میں کسی قوم کو حاصل نہ ہوا تھا ۔

بتوں کی پرستش سے عرب بھی مستثنیٰ نہ تھے ۔ اسلامی روایتوں کے مطابق کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور آپ کے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام نے پرانی بنیادوں پر کی جو زمین میں دب چکی تھی ۔ مگر سیلابوں، آگ لگنے اور شکست و ریخت کے باعث نئی عمارت کو کئی دفعہ نقصان پہنچا اور اہل قریش نے اس کی مرمت کی ۔ اس نئی تعمیر کے وقت خانہ کعبہ کے باہر ۳۶۰ بُت نصب تھے ۔ اور جو بت زیادہ متبرک سمجھے جاتے تھے اُن کو کعبہ کے اندر جگہ دی گئی تھی ۔ ایک عظیم بت جبل بھی کعبہ کے اندر رکھا ہوا تھا ۔ جب رسول اللہ نے نئے دین کا اعلان کر کے بتوں کی پرستش کو ناجائز قرار دیا ۔ تو فتح مکہ کے بعد ان تمام بتوں کو، خواہ وہ کعبہ کے اندر تھے یا باہر، مسمار کر دیا گیا ۔

اسلام سے قبل عرب بتوں کی پرستش پر فریفتہ تھے ۔ اور ہر ایک قبیلہ کا اپنا بت تھا ۔ اگرچہ حقیقت یہی ہے جو بیان کی گئی ہے ۔ یہودی، عیسائی اور صابعین جو عرب میں پہلے سے آباد تھے اپنے مذہبی فرائض آزادی سے اور کسی مزاحمت کے بغیر ادا کرتے آئے تھے ۔ اور بت پرست عرب کسی دوسرے کی مذہبی پرستش پر معترض نہیں ہوتے تھے ۔ ایک خدا کا تصور حضرت موسیٰؑ کا بنیادی اصول تھا ۔ مگر عیسائی یسوع ناصری کو کرائیسٹ (CHRIST) کا نام دے کر اس کو خدا کا بیٹا بنا چکے تھے ۔

یعنی خلق نے ایک مخلوق کو خالق کا درجہ دے دیا تھا۔ صابعین کے عقیدے میں یہودیت اور عسائیت کی آمیزش تھی اور ان کو ایک وقت اہلِ کتاب سمجھا جاتا تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر یمن میں آباد تھے۔ مگر ان میں سے کچھ لوگ حضرموت اور بحر احمر کے ایشیائی جانب بھی بس گئے تھے۔ ان کی مشہور ملکہ اور مارب کے بند کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ ان کے علاوہ عرب میں بھی کچھ ایسے لوگ تھے جو حنیف کہلاتے تھے اور ان کے دلوں میں ایک خدا کا تصور جو بتوں سے برتر ہے پیدا ہو چکا تھا۔ اور جب ۵۳۹ ء میں عبرانیوں کو سیروز (CYRUS) شاہِ فارس نے یروشلم کو واپس بھیج دیا۔ تو ان میں کئی ایک مفکرؔ (جن کو نبی کہا گیا) پیدا ہوئے جو ایک ایسے خدا کا ذکر کرنے لگے جو ساری کائنات کا مختار ہے اور اس کا حضرت ابراہیمؑ سے کیا ہوا وعدہ دہرانے لگے کہ ایک دن دنیا میں اتفاق، امن اور خوشحالی کا دَور دَورہ ہوگا۔ اُن کے خیال کے مطابق خدا ایک مندر میں رہتا تھا جس کو انسانی ہاتھوں نے نہیں بنایا تھا۔ بلکہ وہ ازل سے آسمان پر موجود تھا۔ اِسی طرح اسلام سے پہلے ایک خدا کا موہوم سا تصور عرب میں پیدا ہو گیا تھا۔ مگر اس ارفع ہستی کے اوصاف پوری طرح بیان کیے گئے تھے اور نہ ہی سمجھے جاتے تھے۔ یا صرف اسرائیل کی اولاد کے ذہن میں، جن کے سربراہ حضرت موسیٰؑ تھے، ایک خدا یہووا (JEHOVA) کا تصور تھا جس کے منظورِ نظر صرف اسرائیلی ہی تھے۔
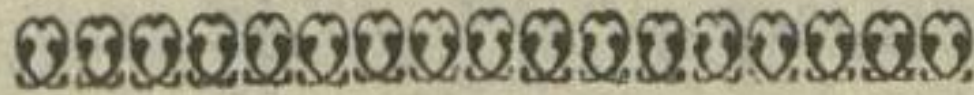
باب ۳

اِسلام کا ظہور

یہ سوال کہ اسلام کی ابتدا کب ہوئی، متنازع ہے۔ بعض کا خیال ہے۔ کہ اسلام کی بنیاد یعنی قرآن لوح محفوظ پر ازل سے کندہ تھا۔ بعض اسلام کو حضرت ابراہیمؑ سے شروع کرتے ہیں۔ اور اپنی تائید میں سورۂ آل عمران کی آیت ۴ کا حوالہ دیتے ہیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ دَورِ حاضر کا اسلام تاریخ میں اس وقت شروع ہوا جب غار حرا میں حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہوئی اور اس کی تکمیل حضرتؐ کی وفات سے پہلے اس وقت ہوئی جب نئے دین کو سورۃ المائدہ میں اسلام کا نام دیا گیا اور نئے دین کے معتقدین کو مُسْلِمُوْن کہا گیا۔ ($\frac{۳}{۶۴}$)

اِسلام ایک ساکن اور منجمد مذہب نہیں بلکہ ایک حرکیاتی سلسلۂ یقین اور اعمال کا نام ہے۔ اور محدثین، مجتہدین، آئمہ اور فقہاء موقع بموقع اس کی مزید تشریح بذریعہ تاویل کرتے آئے ہیں۔

عرب جب اُس حالت میں تھا جو اُوپر بیان کی گئی ہے۔ تو صحرائے عرب کے مغرب سے آنے والے طوفان کا پہلے ایک نرم جھونکا محسوس ہوا۔ یہ جھونکا ایک عام زہریلی ہوا کا نہ تھا بلکہ ایک نئے اور بے مثل طوفان کا پیشرو تھا۔ جس نے بے مثال سرعت کے ساتھ دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس طوفان کو اگر انقلاب کہا جائے۔ تو وہ ایسا انقلاب تھا۔ جس نے بڑے بڑے دیوتاؤں کو، جو صدیوں سے انسانی زندگی کے ٹھیکیدار بنے بیٹھے تھے، ان کے اعلیٰ مقاموں سے گھسیٹ کر مٹی میں ملا دیا اور متکبر سے متکبر اور طاقتور بادشاہوں، قیصروں اور ان کے محلات، جو خواجہ سراؤں، مدخولہ آشناؤں، کنیزوں اور غلاموں سے بھرے ہوئے تھے اور شاہی تعیّش کے شرمناک اڈے بنے ہوئے تھے، کو مع ان کے تختوں اور مسندوں کے ملیامیٹ کر دیا۔ ان تہذیبوں کو جو کئی ہزار سال سے بے مثل اور لازوال سمجھی جاتی تھیں خس و خاشاک کی طرح اُڑا ڈالا۔ نئے دین نے انسان کو اس کے مرتبہ سے ہی نہیں اس کی کم مائگی اور ناپائداری سے بھی آگاہ کیا اور غلاموں کو ان کے آقاؤں کے ہم پلہ بنا دیا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریش کے ایک معزز خاندان میں ۵۷۰ یا ۵۷۱ء میں پیدا ہوئے۔ بعض راویوں کے مطابق اسی سال ابرہہ نے مکہ پر حملہ کیا تھا۔ اور بعض راویوں کے مطابق اس سے دو

سال پہلے ۔ تاریخ کے اُس دَور پر ایک لمحہ کے لیے نظر ڈالیں تو آپؐ کی پیدائش سے پہلے قدیم مصری تہذیب مرچکی تھی ۔ شہر روم ۷۵۳ سال قبل مسیح تعمیر ہوا تھا اور اس کو، جب وہ اپنے آپ کو تہذیب و تمدّن کا گہوارہ سمجھتا تھا، ایک سے زیادہ دفعہ وحشی اقوام نے حملہ کر کے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ مگر اس کی نشانی بازنطینہ میں باقی رہ گئی تھی۔ جس پر یونانی النسل شہنشاہ حکومت کر رہے تھے ۔ فارس خسروان کا تختِ کسریٰ اپنے اوج پر تھا ۔ سارگن دوم (SARGON II) نے اسرائیلیوں کو ۷۴۱ قبل مسیح بابل سے نکال دیا تھا ۔ مگر بخت نصر نے یروشلم کو جلا کر اس کی دیواروں کو کھنڈر بنا دیا تھا اور اسرائیلیوں کو قید کر کے بابل بھیج دیا تھا ۔ کچھ اسرائیلی بخت نصر سے بچ کر مصر چلے گئے تھے ۔ جہاں سے حضرت موسیٰؑ ان کو اپنے ساتھ مصر سے باہر نکال لائے تھے ۔

شہنشاہئ فارس کی بنیاد سیروس (CYROS) نے بابل کو فتح کر کے ۵۳۹ قبل مسیح رکھی تھی۔ اور اس نے اسرائیلیوں کو بابل سے یروشلم بھیج دیا تھا ۔ مگر رسول اکرم کی پیدائش کے وقت بابل کے صرف کھنڈرات باقی رہ گئے تھے جو خاموشی میں اپنی گزری ہوئی عظمت کا اعلان کر رہے تھے نزدیک ہی تختِ کسریٰ کی شاندار عمارت بابل کے کھنڈرات کی شکل اختیار کرنے کے لیے کسی درویش منش امیرالمومنین کے عہد کا انتظار کر رہی تھی ۔

اہلِ فارس نے یونانیوں سے جنگ چھیڑی تھی مگر شکست کھا گئے تھے ۔ روما اور یونان اپنی طاقت کے اوج پر پہنچ کر زوال پذیر ہو رہے تھے ۔ روما کی جمہوریت دیر سے ختم ہو چکی تھی۔ جولیس سیزر (JULIUS CAESAR) اپنی فتوحات پر نازاں ہو کر روما میں شہنشاہی قائم کرنے کے شبہ میں اپنے ہی دوست کے ہاتھ سے قتل ہو چکا تھا۔ سکندر اعظم کئی ایک ممالک مسخر کر کے مگر مشرق و مغرب کے ملاپ کے خواب سے مایوس ہو کر اپنے شباب میں ہی راہئ ملکِ عدم ہو چکا تھا۔ حضرت موسیٰؑ اسرائیلیوں کو مصر سے باہر نکال کر صحرائے سینا میں ان پر ۴۰ سال حکومت کر چکے تھے۔ یسوع ناصری کو بھی یہودیوں کی شکایت پر سلطنتِ روما کا غدار قرار دیا گیا اور انہیں صلیب پر چڑھا دیا گیا تھا۔ مگر وہ عیسائیت اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے ۔ جو رسول اکرمؐ کے زمانہ میں عام لوگوں کا مذہب تھا۔ کیونکہ شاہ قسطنطین (CONSTANTINE) کے بتپسمہ لینے کے بعد عیسائیت مشرقی روما کی شہنشاہی کا سرکاری مذہب بن چکی تھی ۔ قرآن کئی جگہ سابقہ تہذیبوں کے فنا ہونے کے اسباب بیان کر کے عبرت حاصل کرنے کا ذکر کرتا ہے ۔ (۳/۱۳۷، ۶/۶، ۴۴/۲۵-۲۹)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے والد حضرت عبداللہ کی وفات کے بعد پیدا ہوئے ۔ گویا آپؐ کی پیدائش ہی یتیمی کی حالت میں ہوئی ۔ حضرتؐ کے والد محترم کو ایک نہایت خوبرو، وجیہ اور بارسوخ شخصیت بیان کیا جاتا ہے ۔ حضرتؐ کے والد کی وفات کی وجہ سے آپؐ کی پرورش کی ذمہ داری آپؐ

کی والدہ محترمہ بی بی آمنہ پر آ پڑی ۔ قبیلہ قریش کا دوسرا نام بنی کناناں تھا ۔ حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سے یہ قبیلہ سب سے ممتاز قبیلہ تھا ۔ یہ حضرت اسمٰعیلؑ وہی ہیں جن کو حضرت ابراہیمؑ فلسطین واپس ہوتے ہوئے بچپن میں آپ کی والدہ ہاجرہؓ کے ساتھ مکہ کے قریب چھوڑ گئے تھے اور آپ نے مقامی عرب قبائل کے درمیان رہائش اختیار کر لی تھی ۔ جب حضرت ابراہیمؑ تیسری یا چوتھی دفعہ عرب واپس ہوئے تو آپ نے اُن کے ساتھ مل کر خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی ۔

حضرتؐ کا پورا شجرۂ نسب دینا ضروری نہیں ۔ صرف یہ کہ دینا کافی ہوگا کہ آپؐ کے دادا عبدالمطلب خانہ کعبہ کے متولی تھے ۔ اسلام اور نبی اکرمؐ کا دشمن ابولہب آپؐ کا سگا چچا تھا ۔ حضرتؐ کے والد محترم عبداللہ کے دوسرے بھائی عباس، حمزہ اور ابوطالب تھے ۔ حضرتؐ کے پڑدادا کا نام ہاشم تھا اور اسی وجہ سے قریش کی شاخ بنو ہاشم کہلاتی تھی ۔ ہاشم کے سگے بھتیجے کا نام اُمیّہ تھا ۔ جن کی اولاد بنو اُمیّہ کہلاتی تھی ۔

مکہ تمام عرب میں خانہ کعبہ کی وجہ سے ایک مشہور شہر تھا ۔ جو ساحل بحر احمر سے ۴۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے ۔ مدینہ اس ساحل سے ۱۰۰ میل دُور ہے ۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ۔ مکہ کی شہرت اس کے ایک تجارتی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے بھی تھی ۔

بنو ہاشم اور بنو اُمیّہ خاندانوں میں شروع سے ہی تنک رنجی اور رقابت تھی ۔ جو بعد میں اسلام میں ایک تفرقہ کا باعث بنی ۔ کربلا کا سانحہ اور عباسیوں کی خلافت اسی رقابت اور حسد کی جھلک نظر آتے ہیں ۔

حضورؐ کے والد محترم عبداللہ ایک تجارتی قافلہ کی رہنمائی کرتے ہوئے واپسی پر مدینہ میں وفات پا گئے تھے ۔ اس واسطے حضورؐ کی پرورش آپؐ کے دادا عبدالمطلب نے سنبھالی ۔ اور عرب رواج کے مطابق یتیم بچہ کو دودھ پلانے کی غرض سے قبیلہ بنو سعد کی ایک خاتون بی بی حلیمہ کے سپرد کر دیا گیا ۔ چند سال اس یتیم بچے کو بنو سعد کے صحرائی خیموں میں رہنا پڑا ۔ جب بچہ پانچ سال کی عمر پہنچا تو بی بی حلیمہ نے اس کو اس کی والدہ بی بی آمنہ کو واپس کر دیا ۔ ماں بچے کو اس کے والد کی قبر دکھانے مدینہ لے گئی مگر واپسی پر وہ بھی وفات پا گئیں اور بچے کو واپس مکہ بھیج دیا گیا ۔ حضرتؐ ۸ سال کی عمر میں تھے جب آپؐ کے دادا عبدالمطلب بھی فوت ہو گئے ۔ اور آپؐ کی پرورش کی ذمہ داری آپؐ کے چچا ابوطالب پر آ پڑی ۔

حضورؐ کی عمر ۱۲ سال کی تھی جب آپ کے چچا ابوطالب آپ، کو ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ لیکر جانب شام روانہ ہوئے ۔ مسلم مؤرخین کے مطابق راستہ میں بُصرہ کے مقام پر آپؐ کی ملاقات ایک نسطوری عیسائی راہب بحیرہ سے ہوئی ۔ بُصرہ ایک مشہور شہر تھا ۔ جہاں بعد میں مسلمانوں اور سلطنتِ روم کے

درمیان ایک خونریز لڑائی ہوئی۔ حضرتؐ کی بحیرہ کے ساتھ ملاقات کے متعلق کچھ مافوق الفطرت واقعات بتائے جاتے ہیں۔ مگران کا یہاں تفصیل سے بیان کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔ مسلم مؤرخین میں اس راہب کے نام کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ ابن ہاشم اس کا نام ہی نہیں لیتے۔ مسعودی اس کا نام سرجیس (SERGIUS) بتاتے ہیں۔ حلبی اس کو جارجیس (GEORGIUS) کا نام دیتے ہیں۔ بازنطینہ کی تحریروں میں اس راہب کا نام ایک بالکل مختلف واقعہ کے متعلق آتا ہے۔ جو پہلی وحی سے قبل وقوع پذیر ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی کے بازنطینہ کے مؤرخوں کا بیان ہے کہ اس راہب سے حضورؐ کی ملاقات یثرب کے صحرا میں ہوئی۔ جہاں اس راہب نے حضورؐ کے ساتھ چند مذہبی مسئلوں پر گفتگو کی اور آپؐ کو قرآن کے کچھ حصّے سکھائے۔ تاکہ عربوں میں ایک خدا کا تصوّر پیدا ہو۔ یہ بیان بالکل جھوٹا ہے اور صدیوں بعد اس غرض سے گھڑ لیا گیا تاکہ یہ کہا جا سکے کہ اسلام کے بنیادی اصول اور وحدانیت کا تصوّر آنحضرتؐ نے ایک عیسائی راہب سے سیکھے۔ ایک ایسا ہی اتہام قریش نے بھی یہ کہہ کر مشہور کیا تھا۔ کہ قرآن تو مدعیٔ نبوّت کو ایک شخص جبر نے سکھایا جو حضرموت کا رہنے والا اور انجیل کا عالم عیسائی تھا۔ بعد میں یہ شخص مسلمان ہو گیا تھا۔ اور ایک روایت کے مطابق رسول اللہؐ اس کے گھر کے پاس سے گزرتے ہوئے اس سے بات چیت کرنے کے لیے ٹھہر جاتے تھے۔ اس الزام کی تردید میں ڈکشنری آف اسلام کے مؤلف ہیوز (HUGHES) کے مطابق سورہ النحل آیت ۱۰۵ نازل ہوئی جس کا مطلب مؤلف مذکور اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

"ہم جانتے ہیں کہ انہوں نے کہا تھا کہ یہ کوئی فانی انسان ہی ہے جو اس کو پڑھاتا ہے۔ جس شخص کا وہ حوالہ دیتے ہیں اس کی زبان تو وحشیوں کی زبان ہے اور قرآن کی زبان نوشتہ عربی ہے"

ڈکشنری میں جو حوالہ دیا گیا ہے وہ غلط ہے۔ صحیح حوالہ $\frac{16}{103}$ ہے۔

عام قاری کے لیے حضورؐ کی طفولیت اور بلوغت کے زمانہ کا کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں ہے۔ آپؐ کی سیرت اور کردار سے متعلق سینکڑوں کتابیں مختلف زبانوں میں لکھی جا چکی ہیں۔ لڑکپن میں آپؐ اپنے چچا ابو طالب کے مویشی چراتے تھے۔

اور اگرچہ آپ کی جوانی عام عرب ماحول میں گزری۔ آپؐ نے بت پرستی کا کبھی خیال تک نہیں کیا۔ اور نہ ہی آپؐ سے کوئی غیر اخلاقی حرکت سرزد ہوئی۔ اس کے برعکس آپؐ کی ایسی نیک، دیانتدارانہ، بےلاگ اور ہر شبہ سے بالا اخلاقی زندگی تھی کہ لوگ آپؐ کو امین کے لقب سے پکارتے تھے۔ آپ کی دیانتداری ایسی مسلّمہ تھی۔ کہ جب کعبہ کی دوبارہ تعمیر شروع ہوئی اور سوال پیدا ہوا کہ سنگ اسود کو دیوار میں نصب کرنے کا اعزاز کس کو دیا جائے۔ تو ہر شخص یہی چاہتا تھا۔ کہ یہ اعزاز اس کے اپنے قبیلے کے سردار کو ملے۔ عین

ممکن تھا اس پر جھگڑا ہو جاتا۔ مگر حضورؐ کی دیانتداری کی شہرت اب یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ قبائل نے بالآخر متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ یہ نیک کام آپؐ کے سپرد کیا جائے۔ اور آپؐ کی فراست دیکھیے۔ کہ آپؐ نے ایک چادر لی، اس پر سنگ اسود رکھا اور قبائل کے نمائندوں کو کہا گیا کہ وہ چادر کا ایک ایک کونہ پکڑ کر اسے اوپر اٹھائیں اس طرح جب چادر دیوار کی اس اونچائی تک پہنچی جہاں سنگ اسود نصب کیا جانا تھا تو آپؐ نے سنگ اسود کو اٹھا کر دیوار کے اس حصہ پر نصب کر دیا جو اس کے لیے مخصوص تھا۔

مکّہ میں ایک شریف خاندان کی خاتون تھیں جن کا نام خدیجہ تھا اور ان کی دو دفعہ شادی ہو چکی تھی۔ وہ اپنا تجارتی سامان مختلف مقامات پر بیچنے کے لیے بھیجا کرتی تھیں۔ حضورؐ کے چچا ابو طالب کچھ زیادہ متمول نہیں تھے۔ مگر ان کو اپنے بھتیجے کی دیانت اور راست گوئی پر پورا بھروسہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے بی بی خدیجہؓ کو تجویز پیش کی کہ ان کی تجارت کا انتظام حضورؐ کے سپرد کر دیا جائے۔ حضور کی نیک نامی کی شہرت بی بی خدیجہؓ تک پہلے سے پہنچ چکی تھی۔ اس لیے انہوں نے یہ تجویز قبول کی اور آپؐ کو اپنی تجارت کا منتظم مقرر کر دیا۔ آپؐ نے یہ کام بصرہ، یمن اور شام میں اس خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ تجارت میں کافی منافع ہوا۔ اس کے بعد جناب ابو طالب نے بی بی خدیجہؓ کو اپنے بھتیجے کے ساتھ شادی کرنے کی تجویز پیش کی۔ اُنہوں نے یہ تجویز قبول کی اور حضورؐ کے ساتھ عقد کر لیا۔ اس وقت حضورؐ کی عمر ۲۵ سال تھی۔ اور بی بی خدیجہؓ کی ۴۰ سال کے لگ بھگ۔ گویا دونوں کی عمر میں دس پندرہ سال کا فرق تھا۔ اس موقعہ پر حضرت خدیجہؓ کے غلام زید کو بطور عطیہ دیا گیا۔ آپؐ نے زید کو فوراً آزاد کر دیا۔ مگر زید کو حضور کی قربت میں رہنے کی بڑی خواہش تھی اور اس نے ابو طالب کے پسر علیؓ کے ساتھ رہنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ حضرت نے اس خواہش کو بھی قبول کیا۔ اس شادی سے حضورؐ کو قدرے سکون اور بے فکری حاصل ہوئی۔

اگرچہ حضورؐ امی تھے بلوغت کے بعد آپؐ کسی سوچ میں ڈوبے رہتے تھے۔ صحرا کی تنہائیوں میں پھرنے والا کوئی بھی بالغ العقل انسان، خواہ اس نے کسی مکتب میں تعلیم نہ پائی ہو مگر قدرت نے اس کو اپنے اسرار و رموز سمجھنے کی غیر معمولی اشتہا اور غور و فکر اور تحقیق و تجسس کا ملکہ ودیعت کیا ہوا ہو، مظاہر قدرت پر ضرور حیرانی سے نظر ڈالتا ہو گا، وُہ دیکھتا ہو گا کہ ایک زمین ہے جس پر وہ رہتا ہے، اُوپر آسمان ہے جس میں بے شمار ستارے چمکتے ہیں۔ کوئی ستارہ دُور اور کوئی نزدیک نظر آتا ہے۔ ہر ایک ستارہ اپنی جگہ بدلتا رہتا ہے۔ سورج اور چاند ہیں جو خود روشن ہیں اور زمین پر روشنی بکھیرتے ہیں۔ دونوں کبھی غائب بھی ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ان پر دھبہ پڑ جاتا ہے جو بعض اوقات ان کو بالکل چھپا لیتا ہے۔ سورج کبھی نزدیک آ جاتا ہے اور کبھی دُور چلا جاتا ہے۔ چاند کبھی بڑھنا شروع کر دیتا ہے کبھی گھٹتا۔ کچھ دنوں کے لیے بالکل غائب بھی ہو جاتا ہے۔ ہَوا کبھی گرم ہوتی ہے کبھی سرد۔ پرند ہیں جو ہَوا میں اڑتے ہیں مگر نہ کوئی انسان اور نہ کوئی حیوان زمین سے علیحدہ ہو سکتا ہے۔ طرح طرح کے

حیوان ہیں جو زمین پر نشو و نما پاتے ہیں۔ پانی میں ان کو ڈبو دیا جائے تو وہ مر جاتے ہیں مگر مچھلی پانی سے باہر ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ قسم قسم کی نباتات ہے ثمر دار اشجار اور مختلف رنگوں کے پھول ہیں۔ دن چڑھتا ہے اور پھر رات آجاتی ہے۔ موسم بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی خشک سالی حیوانوں اور انسانوں کے لیے آفت بن کر آتی ہے۔ کسی وقت بے پناہ سیلاب آگھیرتا ہے۔ بارش ہوتی ہے تو انسان اور حیوان کے لیے سبزہ اُگ آتا ہے۔ پہاڑ ہیں جن پر سے ندیاں اُترتی ہیں۔ کبھی زلزلہ زمین اور پہاڑوں کو ہلا دیتا ہے۔ اور سینکڑوں جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ قدرت کے یہ مظاہر اس کے دل میں کچھ سوالات پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتے ہوں گے۔ وُہ پوچھتا ہو گا میں کون ہوں؟ کہاں ہوں؟ کیوں ہوں؟ کدھر سے آیا ہوں اور مجھے کدھر جانا ہے؟ جو کچھ میں دیکھتا ہوں اس کا مقصد کیا ہے؟ کائنات کا اور میرا مقصد کچھ ہے بھی یا نہیں؟ کچھ ایسے ہی سوالات نبی اکرمؐ کے دل میں پیدا ہوتے ہوں گے اور آپؐ ان کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہوں گے مگر ان کا جواب نہ ملتا ہو گا۔ یہ سوچ کر کہ شاید تنہائی میں بیٹھ کر ان سوالوں پر پوری توجہ مرکوز کرنے سے ان کا کچھ جواب مل سکے۔ آپؐ نے غار حرا کا رُخ کیا ہو گا۔ جہاں پہلی وحی کے بعد یہ سارے راز آہستہ آہستہ آشکار ہونے لگے۔

پہلی وحی کے نزول سے پہلے حضورؐ نے کوئی فرشتہ نہ دیکھا تھا۔ کشف صدر کے واقعہ کے وقت جب آپؐ کی عمر چار پانچ سال کی تھی، بعض راوی دو سفید لباس میں ملبوس آدمیوں، بعض عقاب کی طرح کے دو پرندوں اور بعض دو فرشتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ آپؐ کو یہ بھی معلوم تھا کہ نہیں کہ فرشتے روحانی یا جسمانی ہستیاں ہوتی ہیں۔ مگر یہ ممکن ہے کہ عیسائیت سے واقف ہونے کی وجہ سے آپؐ کے دل میں فرشتہ کا کوئی تصور موجود ہو۔ راویان کا بیان ہے کہ وحی نازل ہونے سے پہلے آپؐ کو سچے خواب آنے شروع ہو گئے تھے۔ اور بعض راویان مافوق الفطرت مظاہروں کا بھی ذکر کرتے ہیں

آپؐ ایک دن غار حرا میں کسی خیال میں محو تھے کہ آپ کے سامنے ایک فرشتہ شکل صورت نمودار ہوئی اور آپؐ کو کچھ پڑھنے کے لیے کہا۔ آپؐ نے جواب دیا کہ میں اُمّی ہوں پڑھ نہیں سکتا۔ پھر اس فرشتے نے آپؐ کو دو تین دفعہ بھینچ کر کہا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اسے دہراؤ۔ چنانچہ آپؐ نے فرشتے کے ساتھ وہ الفاظ دہرائے جن کا مطلب تھا کہ رب خالق ہے اور اس نے انسان کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ اس فرشتے نے وحی سے پہلے اپنا تعارف نہیں کرایا تھا۔ مگر وحی کے بعد آپؐ نے اس فرشتہ کو آسمان کی طرف جاتے دیکھا اور اُس کو یہ کہتے سُنا 'میں جبریل ہوں' اور 'آپؐ اللہ کے رسول ہیں'۔ یہ واقعہ سیدہ خدیجہؓ کے ساتھ شادی ہونے کے پندرہ سال بعد کا ہے۔ جبکہ آپؐ کی عمر تقریباً چالیس کو پہنچ چکی تھی۔ خوف سے لرزتے ہوئے آپؐ گھر واپس آئے۔ جو کچھ گزرا تھا حضرت خدیجہؓ سے بیان کیا اور کہا میرے اُوپر کمبل ڈال دو۔ چند لمحوں کے تعجب کے بعد حضرت خدیجہؓ آپؐ سے مخاطب ہوئیں اور کہا جو کچھ آپؐ نے

دیکھا اور سُنا وہ سب سچ ہے، آپؐ کو خوش ہونا چاہیئے کیونکہ آپؐ کی زندگی ایسی پاک اور صاف رہی ہے کہ آپؐ کو کوئی ایذا نہ پہنچ سکے گی۔ حضورؐ نے غارِ حرا میں جانا جاری رکھا۔ ایک دن فرشتہ پھر نمودار ہوا اور آپؐ کو مخاطب کر کے کہا کہ اے کملی والے اپنے عزیزوں کو مطلع کردو کہ وہ اللہ کے غصّہ سے ڈریں۔ گھر واپس آکر آپؐ نے یہ ماجرا بھی حضرت خدیجہؓ کو سُنا دیا۔ جواب میں حضرت خدیجہؓ نے بلا تامّل یہ اعلان کر دیا۔ کہ اللہ نے آپؐ کو نبوّت سے سرفراز کیا ہے۔ اور مَیں آپؐ پر ایمان لاتی ہُوں۔ اس طرح سیّدہ خدیجہؓ پہلی شخصیت تھیں جو رسول اللہ پر ایمان لائیں۔ جلد ہی حضرت ابو بکرؓ بھی اس سلسلہ میں شامل ہو گئے اور اس کے بعد پہلے نوجوان آپؐ کے چچازاد علیؓ ایمان لائے اور پھر آزاد شدہ غلام زیدؓ۔ یہ سب وُہ افراد تھے جو آپؐ کے کردار سے بخوبی واقف تھے۔ اس کے بعد آپؐ نے آہستہ آہستہ دب کر تبلیغ شروع کی۔ مگر تین سال میں صرف ۴۰ اشخاص نئے دین کے دائرے میں داخل ہوئے۔ ایک دن آپ کو وحی میں ہدایت ہوئی۔ کہ نئے دین کا پیغام کھل کر لوگوں کو پہنچایا جائے اور مخالفت کی پروا نہ کی جائے۔ چنانچہ آپؐ نے اہلِ مکّہ کو کوہِ صفا کے گرد اکٹھا کیا اور چوٹی پر چڑھ کر لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

"آپ لوگوں سے میری زندگی پوشیدہ نہیں ہے اور آپ سب میرے کردار سے واقف ہیں۔ جو کچھ مَیں کہنے لگا ہُوں اسے غور سے سنو اور میری زندگی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اندازہ لگاؤ۔"

جواب میں لوگوں نے کہا۔ آپؐ تو امین ہیں اور آپؐ کی زندگی بے داغ ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا:۔

"سوائے اللہ کے کسی کی عبادت یا پرستش نہ کرو اور ایسی زندگی اختیار کرو جو ہر قسم کی بداخلاقی سے پاک ہو۔"

یہ اعلان لوگوں کو پسند نہ آیا اور آپؐ کے چچا ابولہب نے کہا۔ میرے بھتیجے کے دماغ میں خلل واقع ہو گیا ہے اور اس پر کوئی غیر معمولی جذبہ طاری ہو گیا ہے جو جلد گزر جائے گا۔

حضرتؐ نے دس سال مکّہ میں اپنی تبلیغ جاری رکھی جو وقت اور جگہ آپ کو مناسب معلوم ہوتی تھی آپؐ اپنے نئے دین کا اعلان کرتے۔ مکّہ میں ایک سالانہ میلہ ہوتا تھا جہاں عرب کے گوشہ گوشہ سے لوگ اپنے فن اور کھیل کا مظاہرہ کرنے آتے تھے اور سامانِ تجارت بھی ساتھ لاتے تھے۔ شاعر اپنے شعر سناتے تھے۔ اور سب لوگ حج کی رسم بھی ادا کرتے تھے۔ حضرتؐ ان لوگوں کو اپنا پیغام سناتے تھے مگر جواب آپ کو تضحیک اور گستاخانہ الفاظ سے ملتا تھا، آپ کو گالیاں دی جاتی تھیں جس میں آپؐ کے چچا ابولہب بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے۔ حضورؐ کو اور آپؐ کے حواریوں کو جو جسمانی تکالیف پہنچائی جاتی تھیں اور جس طرح آپؐ کی تذلیل کی جاتی تھی، خاص طور پر ان تین مہینوں میں جن میں حضرت خدیجہؓ اور ابوطالب کی یکے بعد دیگرے وفات ہوئی۔ اس کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرنا غیر ضروری ہے۔ صرف یہ کہنا کافی ہے کہ آپؐ کا سماجی اور تجارتی بائیکاٹ کا ایک اشتہار کے ذریعہ اعلان کیا گیا جو خانہ کعبہ کے باہر آویزاں کر دیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں آپؐ اپنے آپ

کو بے بس پانے لگے مگر آپؐ کے پائے استقلال میں جنبش نہ آئی۔ مظالم سے تنگ آکر آپؐ کو طائف میں قسمت آزمائی کا خیال آیا۔ طائف مکّہ سے ۷۰ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ مگر وہاں بھی ایک مہینے تک آپؐ کی تضحیک بدستور جاری رہی اور گلی کوچوں کے آوارہ لڑکوں نے آپؐ کے پاؤں اور ٹانگیں پتھروں سے زخمی کرکے آپؐ کو وہاں سے بھگا دیا۔ آپؐ کی مخالفت زور پکڑتی گئی۔ آپ نے اندرون عرب کے قبائل کو اپنے پیغام سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر یہ بھی رائیگاں گئی۔ ان مخالفتوں کے باوجود نئے دین میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا گیا۔ آپؐ کو ہر طرح کے لالچ دیے گئے۔ دولت، سرداری اور عورتوں کی پیش کش کی گئی جو حقارت سے ٹھکرا دی گئی۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جب ابو طالب علالت کی حالت میں بسترِ مرگ پر پڑے تھے تو ان کے پاس قریش کا ایک وفد آیا تھا اور ان سے کہا تھا۔ کہ اگر وہ اپنے بھتیجے کو اس بات پر راضی کرلیں کہ وہ قریش کے مذہب کو برا بھلا نہیں کہیں گے تو قریش بھی نئے دین کی مخالفت نہیں کرینگے اس تجویز کا ابو طالب نے آپؐ سے ذکر کیا۔ آپؐ نے فرمایا۔ کہ یہ سمجھوتہ مجھے منظور ہے۔ مگر اس شرط پر کہ قریش لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پر ایمان لے آئیں اور بتوں کی پرستش ترک کردیں۔

قریش کے سلوک سے تنگ آکر حضرتؐ کو کسی دوسرے ملک میں نقل مکانی کرنے کا خیال آیا اور گیارہ مرد اور چار عورتیں، جن میں حضرتؐ کی بیٹی رقیہؓ، حضرت عثمانؓ اور ان کی اہلیہ شامل تھیں، حبشہ ہجرت کر گئے۔ جہاں کا عیسائی بادشاہ نجاشی تھا۔ ان مہاجرین کا ایمان اتنا پختہ تھا کہ وہ اپنے گھر بار اور جائدادیں چھوڑ کر جلاوطنی کی صعوبتیں سہنے میں خوش تھے۔ حبشہ میں مہاجرین کے رہنما اور نجاشی کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس سے مہاجرین کی پختگیٔ ایمان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اگلے سال کچھ اور مسلمان بھی حبشہ میں آباد ہونے کی غرض سے ہجرت کر گئے۔ تشدّد کسی کے ایمان، ضمیر اور آزادیٔ خیال کو نہیں دبا سکا۔ غرض نئے دین کے چھوٹے سے طبقے کو حضرت عمرؓ کے ایمان لانے سے اور بھی تقویت حاصل ہوگئی۔ حضرت عمرؓ ابتدا میں اسلام کے ایک گرمجوش مخالف تھے۔ اتنے مخالف کہ ایک دن تلوار لے کر حضرت کو قتل کردینے کے ارادے سے گھر سے نکلے۔ جب اپنی بہن فاطمہ کے گھر پہنچے تو ان کو باہر سے ہی کچھ مکان کے اندر پڑھے جانے کی آواز آئی۔ اندر داخل ہوئے تو فاطمہ نے دلیری سے اپنے نئے دین میں داخل ہونے کا اقبال کیا۔ عمر نے ان کو اپنی تلوار سے زخمی کیا۔ پھر کچھ سوچ کر بہن سے وہ صحیفہ مانگا جو وہ پڑھ رہی تھیں۔ بہن نے سورۂ طٰہٰ جس کی وہ تلاوت کر رہی تھیں۔ ان کے حوالے کردی۔ آپ نے اسے پڑھنا شروع کیا۔ ساتویں آیت تک ہی پہنچے تھے کہ آپ کی طبیعت متاثر ہوئی اور رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایمان لانے کا اعلان کردیا۔

رسالت کے گیارہویں سال یثرب کے چھ اشخاص، جو بارسوخ قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے، حج کی غرض سے مکّہ آئے۔ ایک وادی میں ان کی رسول اللہؐ سے ملاقات ہوئی۔ اور یہ سب رسول اللہ پر ایمان

لے آئے۔ اگلے سال یثرب سے بارہ افراد مکہ آئے اور انہوں نے بھی نیا دین قبول کر لیا اور اپنے عقیدے پر قائم رہنے کا اقرار کیا۔ یثرب کو واپس ہوتے ہوئے ان لوگوں کے ساتھ حضرتؐ کے ایک صحابی بھی شامل ہو گئے تھے۔ اور ان کی فصاحت مدینہ میں ایسی مؤثر ثابت ہوئی کہ سوائے چند یہودی خاندانوں کے تمام کا تمام مدینہ نئے دین میں شامل ہو گیا۔ اگلے سال مدینہ سے ۷۲ آدمی حج کے لیے آئے۔ وہ رسول اکرمؐ سے ملے اور انہوں نے رسول اللہ سے ایک معاہدہ کیا جس کی رُو سے وہ سب ایمان لائے، رسول اللہ کو مدینہ آنے کی دعوت دی اور اقرار کیا کہ وہ اپنی جان و مال سے آپؐ کی حفاظت کریں گے۔

رسالت کا تیرھویں سال تھا۔ جب آپؐ کو وحی میں اپنے ساتھیوں سمیت مدینہ ہجرت کرنے کی ہدایت ہوئی۔ اس کے بعد تمام صحابہ اور دیگر مسلمان مدینہ ہجرت کر گئے۔ اپنے مکان اور دولت پیچھے چھوڑ کر مہاجرین کی ہر ایک ٹولی دو مہینہ کے سفر کے بعد مدینہ پہنچی۔ اس طرح دو ماہ کے عرصہ میں تمام معتقدین مکہ سے ہجرت کر گئے۔ مکہ میں صرف تین افراد رہ گئے۔ حضورؐ خود، ابوبکرؓ اور علیؓ۔

آپؐ کے اکیلے رہ جانے پر دشمنوں نے آپؐ کو قتل کرنے کی سازش کی اور فیصلہ کیا کہ جب آپؐ بستر پر دراز ہوں تو مخالف قبائل کے چیدہ چیدہ آدمی آپؐ پر ایک ہی وقت حملہ آور ہوں تاکہ کسی ایک شخص یا قبیلے پر الزامِ قتل عائد نہ ہو سکے۔ رسول اللہؐ کو اس سازش کا علم ہو گیا اور اس کو ناکامیاب بنانے کے لیے حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر آپؐ مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور اپنے بستر پر حضرت علیؓ کو لٹا گئے۔ صبح جب دشمن حملہ کرنے کے لیے آئے۔ تو یہ دیکھ کر کہ آپؐ کی بجائے حضرت علیؓ بستر پر دراز ہیں سخت مایوس ہوئے۔

مکہ سے روانہ ہو کر حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ مکہ کے قریب غارِ ثور میں چھپ گئے اور تین دن تک وہیں چھپے رہے۔ سازشی حضورؐ کی تلاش میں ادھر اُدھر پھرتے رہے۔ اور ان میں سے چند آدمی غار ثور کے منہ پر بھی پہنچ گئے۔ مگر یہ دیکھ کر کہ غار کے منہ پر ایک مکڑی نے جالا بُنا ہوا ہے، غار کو خالی سمجھ کر واپس ہو گئے۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک رومی مؤرخ لکھتا ہے۔ کہ ایک چھوٹے سے کیڑے نے دنیا کی تاریخ کو بدل ڈالا، غار میں چھپے رہنے کے دوران حضرت ابوبکرؓ پر خوف طاری ہوا اور حضورؐ کو مخاطب کر کے کہا کہ ہم صرف دو ہیں اور دشمن تعداد میں زیادہ۔ ہم ان کا مقابلہ کیسے کر سکیں گے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ ہم دو نہیں تین ہیں کیونکہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ تین دن کی مسافت کے بعد حضرتؐ اور ابوبکرؓ بیس جون ۶۲۲ء کو تھوڑی دیر مدینہ کے باہر ٹھہر کر شہر میں داخل ہوئے۔ جہاں آپؐ کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ حضورؐ کے مدینہ پہنچنے پر اسلام کی تاریخ کے نئے دَور کا آغاز ہوتا ہے۔ اور ہجری سال بھی غارِ ثور کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف روانہ ہونے کی تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ حضورؐ ۲۸ جون کو مدینہ پہنچے اور ایک جلوس کی شکل میں شہر میں داخل ہوئے۔ آپؐ ایک اونٹ پر سوار تھے۔ جو ایک

مکان کے سامنے جا کر رُک گیا۔ اس مکان کے مالک دو بچے تھے جنہوں نے یہ مکان اور اس کے آگے کی خالی جگہ حضورؐ کو پیش کی۔ مگر آپؐ نے یہ جگہ اور مکان مفت لینے سے انکار کیا اور معاوضہ دے کر وہاں ایک مسجد تعمیر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

نزولِ وحی کا سلسلہ وقفہ وقفہ سے جاری رہا۔ حتیٰ کہ ایک وحی نے آپؐ کو اسلام کا مژدہ سنایا۔ اسی اسلام کا مژدہ جس نے دنیا کی صدیوں سال کی تہذیبوں، رسوم و رواج کو، جو توہمات پر مبنی تھے تہ و بالا کر کے ایک تہلکہ مچا دیا اور ایک ایسی تہذیب و تمدن کی بنیاد ڈالی جس نے کرۂ ارض پر کروڑوں پیرو پیدا کر کے اسلام کو ایک عالمگیر مذہب بنا دیا۔ یہ ایک ایسا انقلاب تھا جس کی دنیا میں پہلے مثال موجود نہ تھی۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖
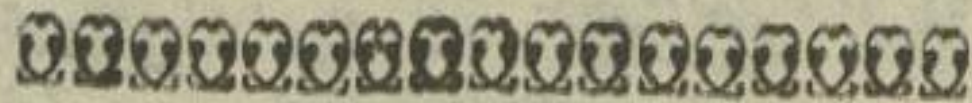
باب ۴

یثرب میں

جب رسول اللہ یثرب میں، جو بعد میں مدینۃ النبی کے نام سے مشہور ہوا، وارد ہوئے تو اس شہر کے لوگ اتنے متعصب اور تنگدل نہ تھے جتنے کہ مکّہ کے باشندے۔ اس وقت یثرب میں بہت سے یہودی آباد تھے جو اُن اسرائیلیوں میں سے تھے جن کو بخت نصر قید کر کے یروشلم سے بابل لے گیا تھا اور یہ لوگ بچ کر یثرب آ گئے تھے۔ کچھ ایسے یہودی بھی تھے جن کو حضرت موسےٰؑ مصر سے نکال لائے تھے مگر ان میں سے بعض نے یثرب کا رُخ کر کے یہیں بُود و باش اختیار کر لی تھی۔ جب یمن میں مارب کا بند ٹوٹا تو وہاں کے کچھ لوگ یثرب آکر آباد ہو گئے تھے۔ ان میں کچھ عیسائی تھے اور کچھ یہودی۔ بہت یہودی اور عیسائی شروع سے ہی یثرب میں بس رہے تھے۔ یثرب کے مقامی لوگوں پر اہل یہود کا کافی اثر تھا اور ان میں سے بعض نے یہود کے رسم و رواج کو اپنا لیا تھا۔ اس طرح یثرب اس وقت مختلف مذاہب کا مشترکہ شہر تھا۔

پیشتر اس کے کہ ہم اسلام کے اس نئے باب کا ذکر کریں جو مدینہ سے شروع ہوا اور جہاں اسلام نے ایک مملکت کی شکل اختیار کر کے اپنی مخصوص سیاسی، اقتصادی، قانونی اور معاشرتی سرگرمیاں شروع کیں اور باقاعدہ حکومت کی بنیاد ڈالی اس امر کی تشریح ضروری ہے۔ کہ جہاں مکّہ میں اسلام کی سخت مخالفت ہوئی تھی مدینہ میں کس طرح اس نئے دین کے پیرو دفعتاً ایک سیاسی طاقت کا مرکز بن گئے اور نئی ریاست کے اہتمام اور نظم و نسق کی ذمہ داری رسول اکرمؐ پر آ پڑی۔

تاریخ میں مکّہ کی شہرت حضورؐ کے وہاں پیدا ہونے یا خانہ کعبہ کے واقع ہونے کی وجہ سے ہی نہیں۔ مکّہ اپنے جائے وقوع کی وجہ سے ایک خاص اقتصادی اہمیت رکھتا تھا اور اسلام کی پیدائش بھی اسی شہر میں ہوئی۔

بعض مؤرخ کہتے ہیں۔ کہ اسلام کی بنیاد عیسائی عقیدے کے کھنڈرات پر استوار ہوئی کیونکہ یسوع ناصری کے اصولوں کو عیسائی پادریوں نے پیچ در پیچ اور انسانی سمجھ سے بالا عقیدوں میں الجھا کر ایک نئے دین کے لیے زمین ہموار کر دی تھی۔ اگر یہ بات صحیح بھی ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام

وحی پر مبنی مذہب نہیں بلکہ شروع سے ہی اسلام ایک خالص سیاسی تحریک تھی۔

آنحضرت ؐ شروع میں سیاسی شخصیت نہیں تھے۔ مگر ہجرت اور اسلامی ریاست قائم ہونے کے بعد آپؐ کو کئی سیاسی فیصلے کرنے پڑے۔ مکّہ میں آپؐ کی تبلیغ اس وحی پر مبنی تھی جو وقتاً فوقتاً آپؐ پر وہاں نازل ہوئی۔ اس وحی میں رُوحانی اور دینی رنگ زیادہ ہے اور سیاست کا ان میں کوئی نمایاں پہلو نہیں۔ جو وحی آپ پر مدینہ میں نازل ہوئی وہ مکّہ کی وحی سے مختلف ہے کیونکہ اس میں دنیوی معاملات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مدینہ میں ایک نئی مملکت کے نظم و نسق کا کوئی نہ کوئی پہلو دفعتاً سامنے آجاتا تھا۔ جس پر ہدایت کی ضرورت ہوتی تھی۔ اور معاشرے کے افراد میں باہمی تعلقات کا تعین کرنا بھی ضروری ہو گیا تھا۔

اگرچہ مکّہ کو صحیح طور پر اسلام کی پیدائش کا فخر حاصل ہے۔ اس نئے دین کے نام اس کی تکمیل اور نتیجتہً اسلامی تہذیب کے آغاز کا حق مدینۃ النبی کا ہے۔

اب قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نئے دین کے کیا اوصاف اور مضمرات تھے۔ سب سے پہلی اور صاف طور پر ظاہر یہ بات تھی کہ عربوں کو جن میں قریش بھی شامل تھے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ضروری تھا۔ اس اللہ پر جو انسان کا اور اس لیے عربوں کا بھی پیدا کرنے والا ہے۔ دوسرا فرض اس مٹی وغیرہ کے بتوں کی پرستش، جن کو انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا، ترک کرنا تھا۔ اس لیے ان عربوں، جو ایمان لے آئے تھے، اور بت پرست عربوں کے نظریہ میں ایک ظاہراً تضاد تھا۔ اگرچہ ہر دو فریق اپنے اپنے عقیدے پر ایمان رکھتے تھے۔

اہل عرب صدیوں سے بتوں کی پرستش کے قائل تھے۔ اس کے برعکس رسول اللہ ان کو اس عقیدے پر لانا چاہتے تھے جس کی بنیاد وحی تھی۔ عرب فطرتاً کشادہ دل تھے۔ وہ کسی دیوتا کی پرستش پر معترض نہ ہوتے تھے۔ جب تک کہ ایسی پرستش سے ان کے دیوتا کی پرستش پر زد نہ پڑے۔ اگر وہ ایک خالق مطلق کا تصوّر اپنا لیتے تو ان کو اپنے بتوں کی پرستش ترک کرنا پڑتی تھی جن کی خوشنی اور برہمی پر وہ زمانہ قدیم سے اپنی زندگی گزار رہے تھے اور جن پر ان کی خود مختار ہستی کا انحصار تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی انفرادی آزادی ختم ہوتی تھی۔ کیونکہ اگر وہ نئے دین کو اختیار کر لیتے تو ان کو ایک خدا پر ایمان لانا پڑتا تھا۔ قانون سے آزاد عربوں کے لیے آزادی کا مفہوم یہ تھا کہ وہ جو چاہیں کر سکیں کیونکہ آزادی کی خواہش انسان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ ایک بدوی موجودہ اسکیمو سے کم خوش نہیں تھا۔ جو تیز ہوا کے برفانی میدانوں میں خیموں یا برفانی غاروں میں پناہ لے کر زندگی گزارتے ہیں اور جہاں کوئی زندہ شے، سوائے دریائی بچھڑوں، دریائی گھوڑوں، برف میں رہنے والے ہرنوں، مچھلیوں اور اپنی برف گاڑی کے کتوں کے نظر نہیں آتی۔ جن کی پیدائش افریقہ، جنوبی امریکہ یا

جنوب مشرقی ایشیا کے جنگلوں میں ہوئی اور جو تہذیب حاضرہ کو ایک لعنت سمجھ کر اس سے کوسوں دُور بھاگتے ہیں۔ بھوکے حیوان اور پرندے بھی اپنی آزادی کو پنجرے کی اس قید پر ترجیح دیتے ہیں جہاں کھانے پینے کی چیزیں ان کے سامنے بافراط رکھ دی جائیں۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ نئے دین کی سخت مخالفت ہوئی۔ اس کے پیروؤں سے قطع تعلقی کی گئی اور ان کو ذلیل اور خوار کر کے ان سے انسانی مرتبہ بھی چھین لینے کی کوشش کی گئی۔ ان کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچائی گئیں۔ ان کے رہنما پر حملے کیے گئے۔ اور ان کو قتل کرنے کی سازش کی گئی۔ اگر یہ بات درست نہ ہوتی تو مسلمان حبشہ اور مدینہ کو کیوں ہجرت کر جاتے۔ ظاہرہ طور پر صلح کن، فیاض، روادار اور مہمان نواز عرب نئے انقلاب کو قبول کرنے اور اپنا طرز زندگی بدل کر نئے نظام کو اختیار کرنے کے لیے تیار نہ تھا اور نہ ہی وہ ایسی قیود میں پھنسنا چاہتا تھا جن سے اس کے افعال اور خیالات میں کسی تبدیلی کا واقع ہونا لازمی ہو جائے۔ مگر نئے نظام کا خاصا یہی تھا۔ اور اس کا مقصد عربوں کو ایک قوم میں متحد کرنا اور ایک قانون اور ضابطے کے اندر لانا تھا۔ قدیم انسان کی بلا روک ٹوک آزادی نے اس کو حیوان کے مشابہ بنایا ہوا تھا مگر جب انسان ایک مہذب اور شائستہ معاشرہ میں داخل ہوتا ہے تو اس کو اپنی آزادیٔ عمل پر کچھ پابندیاں قبول کرنی پڑتی ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسی پابندیاں ہی انسانی تہذیب کا جوہر اور انسانی ارتقار کی تاریخ ہیں۔

آنحضرتؐ مکّہ سے ہجرت کر کے ۶۲۲ء میں مدینہ پہنچے اور یہیں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی وجہ سے مدینہ نے، جو پہلے یثرب کہلاتا تھا، مدینۃُ النّبی کا نام پایا۔ مشہور جغرافیہ داں اور علم ہیئت کا ماہر طالمی (PTOLEMY) مدینہ کا یثربا (YATHRAPPA) کے نام سے حوالہ دیتا ہے اور ینایئن (MINAEAN) کتبوں میں اس مقام کو یثرِب (YATHRIB) لکھا گیا ہے۔ یہ مقام عرب کی درمیانی سطح مرتفع کے مغربی کنارے پر واقع ہے جس کی مشرق کی طرف ڈھلوان ہے۔ اور اس کا بحر احمر سے ۲۰۰ میل کا فاصلہ ہے۔ اس کے شمال مغرب کی طرف اُحد کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں جن میں کئی زرخیز اور شاداب وادیاں ہیں۔ جنوب میں یہ سطح مرتفع حد نظر تک پھیلی ہوئی ہے۔

آنحضرتؐ کی ہجرت کے بعد مکّہ میں ایک بھی مومن نہیں رہا تھا اور جو سلوک مکّہ کے کفار نے آپؐ کے اور آپؐ کے ساتھیوں کے ساتھ کیا تھا اور جس طرح آپؐ کو وہاں سے نکالا گیا آپؐ اسے نہیں بھولے تھے۔ مزید برآں آپؐ کو یقین ہو گیا تھا کہ مکّہ اور مدینہ دو متضاد نظریات رکھتے ہوئے اکٹھے زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس لیے مکّہ کے متعلق آپؐ کے ذہن میں ایک حکمت عملی تھی جس کا پہلا قدم یہ تھا کہ مکّہ کی شام کے ساتھ جو تجارت تھی اور جس پر بہت حد تک مکّہ کی خوشحالی منحصر تھی اس کو ناممکن

بنا دیا جائے۔ چنانچہ حضورؐ نے اس پالیسی کی تکمیل میں چند قبائل کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی رُو سے مسلمانوں پر یہ فرض عائد کیا گیا کہ وہ ان قبائل کی جان و مال کی حفاظت کریں گے اور اگر مسلمانوں کے ساتھ کوئی قبیلہ نبرد آزما ہو تو یہ قبائل مسلمانوں کی حمایت میں لڑیں گے۔ حضورؐ نے یہ معاہدہ اس وقت کیا جب آپؐ سو دو سو مجاہدین کی جماعت کی ایک گشت کے دَوران کمان کر رہے تھے۔ معاہدے پر حضورؐ نے خود اپنی مہر ثبت کی۔ رسول کریم کو پورا یقین تھا کہ اہل مکہ کسی نہ کسی وقت مدینہ پر ضرور حملہ کریں گے تاکہ اسلام کی آماجگاہ کو تباہ کر دیا جائے۔

یہ خیال درست نہ ہوگا کہ جو لوگ اسلام میں شامل ہو گئے تھے وہ سب صدق دل سے ایمان لے آئے تھے۔ ان میں سے بہت سے لوگ کسی مصلحت کے تحت مسلمان ہوئے تھے۔ چنانچہ ایسے منافقین کی ایک جماعت ظاہرہ طور پر مسلمانوں کے ساتھ تھی مگر درپردہ وہ مسلمانوں سے منافرت اور بغض رکھتی تھی۔ اس جماعت کا سرغنہ عبداللہ بن یوبی تھا۔ اس جماعت کے افراد کی تعداد بتیس تھی جن میں سے ۲۴ قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے تھے اور ۸ قبیلہ خزرج سے۔ اس کے علاوہ بہت سے یہودی بھی اسلام دشمن بن کر منافقین کے ساتھ مل گئے تھے۔ یا اسلام کا اقرار کرنے کے بعد اسلام دشمن ہی رہے تھے اور مسلمانوں میں انتشار پھیلانے کی خفیہ سازشوں میں مصروف تھے۔

اہل مکہ نے عبداللہ بن یوبی کو جو منافقین کا سرغنہ تھا ایک چھٹی لکھی جس میں کہا گیا تھا کہ نبی اکرم کو مدینہ سے نکال دیا جائے اور جب اہل مکہ مدینہ پر حملہ کریں تو ان کے ساتھ شامل ہو کر مدینہ والوں سے لڑیں۔ اس بات کا رسول اللہ کو علم ہو گیا اور آپ نے مدینہ کی حفاظت کے لیے احتیاطی اقدام شروع کر دیئے۔ مدینہ میں اُس وقت یہودیوں کا غلبہ تھا اور کچھ مقامی عرب بھی یہودی مذہب اختیار کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ یمن کے دو قبائل خزرج اور اوس مارآب کا بند ٹوٹنے کے بعد مدینہ آبسے تھے۔ مدینہ کے وہ لوگ جو مسلمان ہو چکے تھے۔ انصار کہلاتے تھے۔ جو مسلمان مکہ سے ہجرت کر آئے تھے۔ اُن کو مہاجرین کہا جاتا تھا کچھ عیسائی بھی مدینہ میں آباد تھے۔ اس طرح مدینہ میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد تھے رسولِ مقبول نے سب سے پہلے مہاجرین اور انصار کا آپس میں رشتہ مضبوط کیا اور ان میں بھائیوں کی سی شفقت پیدا کر دی۔ آپ کا ہرگز ارادہ نہ تھا کہ یہودیوں کو جبراً مسلمان بنایا جائے۔ یا ان کو مدینہ سے نکال دیا جائے۔ اس کے برعکس آپ نے مہاجرین، انصار، یہود اور یمنیوں کے درمیان ایک معاہدہ طے کرایا۔ جس کو صلح نامہ مدینہ کہا جاتا ہے۔ اس عہد نامہ کی اہم شرائط یہ تھیں۔

۱۔ یہودیوں کی آزادیٔ مذہب اور ان کی جان و مال کی حفاظت مسلمانوں کے ذمے ہوگی۔

۲۔ ہر قبیلے کا تنازعہ اس قبیلے کے قانون اور رسم و رواج کے مطابق طے کیا جائے گا۔

۳۔ اگر مدینہ پر حملہ ہو تو مسلمان اور یہودی مشترکہ طور پر اس کا دفاع کریں گے۔

۴۔ کوئی فریق خواہ وہ مسلمان ہو یا یہودی کسی دیگر قبیلے کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ کرے گا۔
۵۔ اگر لڑائی مدینہ کے باہر ہو۔ تو کسی یہودی کو اس میں شامل ہونے پہ مجبور نہیں کیا جائے گا۔
۶۔ ہر فریق دوسرے فریق کی عورتوں کا احترام کرے گا۔
۷۔ جملہ امورِ متنازع کا فیصلہ رسول اللہ کریں گے۔

مسلمانوں نے اپنے دین کی تبلیغ مکہ سے باہر اور اردگرد کے قبائل میں جاری رکھی۔ ایک اور معاہدہ بنی ضمرا سے کیا۔ جس کی رُو سے عہد کیا گیا کہ ایک فریق دوسرے کے ساتھ لڑائی نہیں کرے گا۔ اور نہ دوسرے فریق کے دشمن کا ساتھ دے گا۔ کچھ معاہدے ان قبائل کے ساتھ بھی کیے گئے۔ جو اس شاہراہ کے دونوں طرف بستے تھے۔ جو مکہ سے شام، یروون اور فلسطین کو جاتی تھی۔ اگر مکہ کی طاقت کو توڑنا مقصود تھا تو اس کی تجارت کو مفلوج کرنا اس مقصد کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ مزید براں مکہ کو کمزور کر دینے سے اس حملہ کا اندیشہ بھی کم ہو جاتا تھا جو اہل مکہ مدینہ پر کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے رسول اکرم چھوٹی چھوٹی دیکھ بھال کرنے والی جماعتیں اس شاہراہ کی طرف بھیجا کرتے تھے۔ ان جماعتوں میں سے ایک جماعت کی، جو سات مہاجرین پر مشتمل تھی۔ اور عبداللہ کے زیر کمال تھی؛ قریش کے ایک قافلہ کے ساتھ وادیٔ نخلہ میں مٹھ بھیڑ ہوگئی۔ قافلہ کا ایک آدمی مارا گیا۔ کچھ مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا اور کچھ دشمن قید بھی کر لیے گئے۔ مدینہ میں متواتر یہ خبر موصول ہوتی رہی۔ کہ اہلِ مکہ مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اور انہوں نے عبداللہ یوبی سردارِ منافقین کو ایک چِٹھی بھی لکھی ہے جس کا اُوپر ذکر آ چکا ہے۔

جنگِ بدر ۶۲۳ء

ہجرت کا دوسرا سال یعنی ۶۲۳/ ۶۲۴ء تھا۔ کہ ابوسفیان جو بنی امیہ کا سردار اور عبد المناف کی جو نبیٔ اکرم کے بھی جدِ امجد تھے، اولاد سے تھا، مکہ سے ایک تجارتی قافلہ لے کر شام گیا ہوا تھا۔ اور واپسی پر کیونکہ اس کا راستہ مدینہ کے قریب سے گزرتا تھا اسے اندیشہ ہوا کہ مدینہ کے مسلمان اس پر حملہ کریں گے۔ چنانچہ اس نے اپنے اس خدشہ کا اظہار کر کے مکہ والوں سے اپنی حفاظت کے لیے مدد مانگی۔ جواب میں مکہ سے ۷۰۰ اور ۱۰۰۰ کے درمیان آدمیوں نے پوری طرح مسلح ہو کر مدینہ کا رُخ کیا۔ مگر ابھی یہ لشکر مدینہ نہیں پہنچا تھا۔ کہ اس نے ابوسفیان کے قافلے کو مدینہ سے گزر کر مکہ کی طرف صحیح سلامت واپس آتے دیکھا۔ اس لیے اس لشکر کے مدینہ کی طرف بڑھنے کا کوئی جواز باقی نہ رہا تھا۔ مگر اسلام دشمن ابوجہل نے لشکر کو اکسایا اور مدینہ پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی حالانکہ ابوسفیان نے ان کو مکہ واپس جانے کا مشورہ دیا تھا۔ نبی اکرم نے اس متوقع حملہ کی اطلاع پاکر انصار اور مہاجرین کے

اکابرین سے مشورہ کیا۔ جنہوں نے رسولِ کریمؐ کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے فیصلہ کیا۔ کہ مدینہ سے کچھ فاصلہ پر اس لشکر کا مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ ۳۱۳ مجاہدین نے اپنے آپ کو اس مقابلے کے لیے پیش کیا۔ ان مجاہدین کے پاس صرف دو گھوڑے اور چند اونٹ تھے۔ رسد اور اسلحہ بھی ناکافی تھا۔ تاہم رسول اللہ نے مجاہدین کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔ جنگی لباس پہنا اور تلوار زیب کمر کر کے مقابلے کے لیے آگے بڑھے۔ مدینہ سے ساٹھ میل دور بدر کے مقام پر فریقین کا آمنا سامنا ہوا اور لڑائی شروع ہوئی حضور سجدہ میں گر پڑے اور اللہ سے فتح کی دعا مانگی۔ دشمن کو شکست ہوئی اور وہ لاشیں اور قیدی چھوڑ کر میدان سے بھاگ گیا۔ ابوجہل مارا گیا مگر حضرت کے چچا عباس دشمن کی قید میں آ گئے۔ حضورؐ نے فدیہ لیکر قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اور جو فدیہ ادا کرنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے ان کو بغیر فدیہ لیے چھوڑ دیا۔ مگر کچھ قیدیوں کو اس شرط پر مدینہ میں رکھ لیا گیا کہ وہ مدینہ میں بچوں کو پڑھائیں گے اور ان کی رہائش، خورد و نوش اور پوشاک کا انتظام بچوں کے ولی کریں گے۔ اس معرکہ میں ہر دو جانب کے لشکریوں کی تعداد تقریباً ۱۵۰۰ تھی۔ ان میں سے ۱۴ مسلمان شہید ہوئے اور کفار میں سے دس گنا یعنی ۱۴۰ آدمی مارے گئے یا شدید زخمی ہوئے۔

جنگِ بدر سے جو مسلمانوں کی ایک اہم جنگ تھی۔ مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:

۱۔ ایک نئی امت، سیاسی معنوں میں قوم، اور مسلمانوں کے لیے ایک مملکت وجود میں آئی۔

۲۔ مسلمانوں کے لیے ایک حکومت قائم ہو گئی جس کے سربراہ نبی اکرم خود تھے جو کمانڈر ان چیف، قانون سازی اور انتظامیہ کا عہدہ سنبھال چکے تھے۔ تنازعات کا فیصلہ کرنے کے لیے یعنی محکمہ انصاف (جوڈیشل) بھی آپ کے ہی ہاتھ میں تھا۔

۴۔ معرکۂ بدر سے پہلے بھی ایک سفید علم مسلمانوں کے پاس تھا۔ جو کبھی حضرت حمزہ اٹھاتے تھے یا کوئی اور نامور مجاہد۔ مگر جنگِ بدر میں مجاہدین نمایاں طور پر ایک اسلامی علم کے نیچے لڑے۔

۵۔ مسلمانوں میں ایک مشترکہ نظریہ پیدا ہو چکا تھا جس سے ان میں اتحاد، ضبط، باہمی امداد، جوشِ عقیدت اور ایثار کی روح پیدا ہو چکی تھی۔

۶۔ جنگِ بدر میں مالِ غنیمت کی تقسیم کا قاعدہ بھی مقرر ہوا۔

ان واقعات کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ جنگ بدر کے بعد ایک باقاعدہ اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔ کیونکہ مسلمانوں کو اب اپنی حفاظت میں جنگ کے لیے تیار رہنا اور دفاعی جنگ میں شریک ہونا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس لیے ان میں ایک قسم کے قانونِ حرب کا بھی احساس پیدا ہو گیا تھا جو کچھ تو سابقہ رسم و رواج پر مبنی تھا۔ اور کچھ قرآنی آیات پر (۲/۱۹۰-۱۹۴ ۔ ۲۲/۳۹، ۴۰)۔ ان آیات کو بار بار پڑھنے اور سوچئے کہ ان کا مطلب سوائے اس کے جو ذیل میں درج ہے کچھ اور بھی ہو سکتا ہے

"تم صرف ان لوگوں سے لڑو جو تم پر حملہ کرتے ہیں۔ مگر اس صورت میں بھی حد سے تجاوز مت کرو اور لڑائی تب تک جاری رکھو جب تک ظلم ختم نہ ہو جائے اور انصاف غالب نہ آجائے اگر دشمن لڑائی بند کر دے تو تم بھی ان پر کسی دشمنی کا اظہار نہ کرو سوائے ان کے جو ظلم کے مرتکب ہوئے ہوں۔ اگر تم پر حملہ ہوا ہو تو تم بھی لڑو کیونکہ ایسی صورت میں مظلوم تم ہو۔ تم میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے زبردستی صرف اس وجہ سے نکالے گئے کہ وہ کہتے تھے ہمارا مالک ہمارا خدا ہے۔ اگر خدا لوگوں کو دوسروں کی زیادتی روکنے کی اجازت نہ دیتا تو ظالموں نے وہ تمام مقامات تباہ کر دیے ہوتے جہاں خدا کا نام لیا جاتا ہے۔ یعنی کلیسائیں، یہودیوں کے عبادت خانے اور مسجدیں۔ اور خدا یقیناً ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اس کے نام پر عبادت خانوں کی بربادی کو روکتے ہیں جہاں خدا کا نام لیا جاتا ہے، خواہ خدا کو یاد کرنے والے مسلم ہوں یا عیسائی یا یہودی۔"

یہ وہ قواعد جنگ ہیں جو ۱۳۰۰ سے زائد سال پہلے صراحتاً بیان کیے گئے اور جن کو دنیا کے موجودہ قانون کے ماہر صدیوں کی کشمکش کے بعد انسانی معاشرے کو قائم رکھنے کے لیے بنیادی اصول سمجھنے لگے ہیں۔ ان آیات کا مرکزی مفہوم یہ ہے کہ جارحیت کی جنگ ممنوع ہے اور اسی اصول کے مطابق جنگ عظیم دوم کے بعد جرمنی کے کئی نامور نازی جو جارحیت کے مرتکب ہوئے تھے تختہ دار پر چڑھا دیے گئے۔

حضورؐ کا جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک، آپؐ کی فیاضی، فراخ دلی، ہمدردی انسانی خصلت کے ایسے زریں پہلو ہیں جو اسلام سے پہلے کی تہذیبوں میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔ اگرچہ جنگ بدر کے قیدیوں کی حیثیت اس دور کے مطابق غلاموں کی سی تھی۔ تب بھی ان کے ساتھ آپؐ کا برتاؤ وہی تھا جس کی تاکید آپؐ نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے عرفات کے خطبہ میں فرمائی تھی۔ جنگ بدر کے بعد آپؐ نے کسی شخص کو مجبور نہیں کیا کہ وہ اسلام قبول کرے۔

مؤرخین دو اشخاص کا ذکر کرتے ہیں۔ جن کو اس وجہ سے قتل کیا گیا کہ مکہ میں وہ کچھ افعال قبیحہ کے مرتکب ہوئے تھے۔ مگر یہ فعل اس اصول کے خلاف نہیں کہ دین کے معاملہ میں کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ان دو شخصوں کو اس وجہ سے قتل نہیں کیا گیا کہ انہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔

جنگ اُحد (۶۲۵ء)

جنگ بدر اور جنگ اُحد میں قریباً ایک سال کا وقفہ ہے۔ مگر اس وقفہ کے دوران کے چند

واقعات قابل ذکر ہیں ۔

ایک یہودی دوکاندار ایک مسلمان خاتون کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آیا۔ مسلمانوں نے اس یہودی کو قتل کر دیا ۔ پھر یہودیوں نے بدلے میں ایک مسلمان کو شہید کر دیا۔ اس واقعہ سے مسلمانوں اور یہودیوں میں نفرت پیدا ہوگئی ۔ یہودیوں نے مدینہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ کسی یہودی کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی گئی تھی اور نہ ہی ان میں سے سوائے اس یہودی کے جس نے مسلمان عورت کے ساتھ گستاخی کی تھی، کسی یہودی کو قتل کیا گیا ۔ اس طرح یہودیوں کے ساتھ جو پہلے عہد نامہ ہوا تھا وہ منسوخ ہوگیا ۔ قبل ازیں یہودیوں کو ملت میں شامل سمجھا جاتا تھا۔ اب ان کا وہ درجہ بھی ختم ہوا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ اہل مدینہ نے ایک قافلہ پر جو عراق کے راستے شام جا رہا تھا کامیاب حملہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکّہ کی خوشحالی کو، جو شام اور مشرق کے درمیان تجارت پر منحصر تھی، سخت دھکا لگا ۔

اب تیسرا معرکہ مکہ کے قریش، جن کے ساتھ کچھ قبائل بھی تھے اور مسلمانوں کے درمیان ناگزیر ہوگیا تھا۔ جنگ بدر کے مکی مجروحین کے زخم رِس رہے تھے اور ان میں انتقام کا جذبہ مشتعل ہو رہا تھا۔ ایک سال کی تیاری کے بعد قریش اور دیگر قبائل کا ایک لشکر جس کی تعداد تین ہزار تھی اور وہ پوری طرح مسلّح تھا جن میں ۷۰۰ لشکری زرہ بکتر سے آراستہ تھے اور دو سو گھوڑ سوار تھے، مکّہ سے ہجرت کے تیسرے سال روانہ ہوا اور اس نے مدینہ سے کچھ فاصلہ پر مقام احد پر، جو پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے، خیمے نصب کیے ۔

رسول اللہ نے مجلس شوریٰ کا اجلاس طلب کیا جس نے فیصلہ کیا کہ دشمن کے ساتھ مدینہ سے باہر ہی مقابلہ کیا جائے ۔ اس طرح ایک ہزار مجاہدین جن میں بعض پوری طرح مسلّح تھے مدینہ سے باہر نکلے اور مکّہ کے لشکر کی طرف بڑھے ۔ مگر لڑائی شروع ہوتے ہی عبداللہ بن اُبی منافقین کا سرغنہ اپنے تین سو آدمی لے کر علیحدہ ہوگیا۔ اس طرح صرف ۷۰۰ مجاہدین باقی رہ گئے ۔ رسول اللہ نے جنگی لباس زیب تن کیا، کمر میں تلوار باندھی اور لشکر کی کمان سنبھال کر اس کو تین حصّوں میں تقسیم کیا۔ ہر حصّہ کو ایک علم سپرد ہوا ۔ دو جھنڈے قبائل نے اٹھا رکھے تھے اور تیسرا دست مبارک میں تھا مگر لڑائی شروع ہونے سے پہلے آپؐ نے یہ علم منصب بن امیر کے سپرد کر دیا۔ ایک درہ میں آپؐ نے پچاس تیر اندازوں کو متعین کرکے ان کو ہدایت کی کہ جنگ خواہ کوئی رُخ اختیار کرے تیر انداز اپنی جگہ نہ چھوڑیں حملہ مجاہدین نے شروع کیا اور مکّہ کا لشکر منتشر ہو کر بھاگنے لگا۔ عین اسی وقت چالیس تیر اندازوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور بھاگتے ہوئے لشکر کا تعاقب کیا تاکہ مال غنیمت میں ان کا بھی حق ہو جائے۔ خالد بن ولید نے، جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور اسلام قبول کرنے کے بعد دنیا میں بہت بڑے جرنیلوں میں شمار ہوئے، ان تعاقب کرنے والے تیر اندازوں کے عقب میں آکر ان پر حملہ کر دیا۔ خالد کی

کمان میں دو سو آدمی تھے۔ اس طرح اسلامی لشکر خالد اور بھاگتے ہوئے مکّہ والوں کے درمیان پھنس گیا۔ بھگوڑے واپس ہو کر پھر لڑائی میں شامل ہو گئے اور اسلامی لشکر کے سامنے آ کر ڈٹ گئے۔ مجاہدین میں ابتری پھیل گئی اور انہوں نے مدینہ کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ ۱۰۷ سال بعد ۷۳۲ء میں اسی طرح کا ایک اور واقعہ پیش آیا۔ یہ ایسا اہم واقعہ تھا کہ اس نے مسلمانوں سے دنیا کی حکمرانی ایسے وقت چھین لی جبکہ وہ ان کی گرفت میں آ رہی تھی۔ ہُوا یوں کہ فرانس اور اسلامی حکومت میں جنگ چھڑ گئی۔ لڑائی ایک اہم مقام پر ہوئی جس کو طور کا میدان کہتے ہیں۔ میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا مگر کسی نے یہ افواہ اڑا دی کہ دشمن نے مجاہدین کے خیموں پر جو مالِ غنیمت سے بھرے تھے حملہ کر دیا ہے۔ مجاہدین مالِ غنیمت بچانے کے لیے میدان چھوڑ کر اپنے خیموں کی طرف بھاگ گئے اور میدان دشمن کے ہاتھ رہا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک یورپین مؤرخ لکھتا ہے۔

"طور کے میدان میں عرب دنیا کی حکومت ایسے وقت میں کھو بیٹھے جب وہ ان کے ہاتھ میں آ رہی تھی"۔

جنگ اُحد میں حضورؐ خود زخمی ہو گئے اور دشمنوں کے نرغے میں گھر گئے۔ مگر ابو دجانہؓ، طلحہؓ اور سعد بن ابی وقاصؓ نے آپؐ کو گھیرے میں لے لیا، اپنے جسموں پر تیر اور تلوار کے وار سہے یہاں تک کہ ان کے جسم زخموں سے چھلنی ہو گئے۔ حضورؐ کی مرہم پٹی سے فارغ ہو کر مسلمانوں نے دشمن پر پھر حملہ کیا اور ان کو مکّہ کی طرف بھگا دیا۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی ۷۰ اہم شخصیتیں، جن میں حمزہؓ بھی شامل تھے، شہید ہوئیں۔ جنگِ اُحد کے چند پہلو، خواہ اس معرکہ کو مسلمانوں کی فتح کہیں یا شکست یا صرف بے نتیجہ جنگ، قابلِ ذکر ہیں۔

اوّل۔ اس جنگ کی کمان رسول مقبولؐ نے خود بطور سپہ سالار کی اور لڑائی کے درمیان آپؐ برابر مجاہدین کو حکم دیتے رہے۔ آپؐ نے خنجر سے ایک دشمن کو بھی ہلاک کیا۔

دوم۔ اس جنگ میں دونوں طرف سے عورتوں نے حصّہ لیا۔ مکّہ کے لشکر کے ساتھ مکّہ کی عورتیں جنگِ بدر میں اپنے عزیزوں کے مارے جانے پر ڈھولک کے ساتھ نوحہ خواں تھیں۔ اسلامی لشکر کی عورتیں مجاہدین کو پانی پلاتی تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ اسلام دشمن ہندہ نے فوجی لباس پہنا ہوا تھا اور وہ لڑائی میں شریک تھی۔ ابو دجانہؓ نے جن کے پاس آنحضرتؐ کی تلوار تھی اس کو قتل کرنا چاہا مگر کچھ سوچ کر تلوار میان میں ڈال لی اور کہا کہ رسول اللہ کی تلوار کو عورت پر استعمال کرنا تلوار کی توہین ہے۔ کچھ ایسا ہی واقعہ ۱۱۳۹ء میں پیش آیا جب مجاہدین نے الفانسو ہفتم کی ملکہ کو قلعہ بند کیا ہُوا تھا۔ ملکہ نے مجاہدین سے مخاطب ہو کر کہا کہ اسلام کے مجاہدین کی یہ کیا بہادری ہے کہ ایک عورت کو قلعہ میں محصور کر رکھا ہے۔ محاصرین میں سے کسی نے جواب دیا کہ اگر تم عورت ہو تو نقاب اُٹھا کر سامنے

آوُ ۔ جب ملکہ نے نقاب اُٹھا کر مجاہدین کو کھڑکی میں سے اپنا چہرہ دکھایا تو مجاہدین نے ملکہ کو سلام کیا اور محاصرہ اُٹھا لیا۔

جنگِ خندق (۶۲۶-۶۲۷ء)

ہجرت کے پانچویں سال جو جنگ مدینہ کے مسلمانوں اور مکّہ کے کفار کے درمیان ہوئی اس کو جنگِ خندق کہتے ہیں۔ مدینہ کے بنی نضیر یہودنے، جو مدینہ چھوڑ کر خیبر آبسے تھے، قریشِ مکّہ اور ایک اور قبیلہ کے ساتھ مل کر مدینہ کو فتح کرنے کی سازش کی۔ اس غرض سے دس ہزار کا ایک پوری طرح مسلح لشکر ابوسفیان کی قیادت میں مدینہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں اور قبائل بھی اس لشکر کے ساتھ مل گئے۔ قبیلہ بنوقریظہ کے یہودی بھی، جو مدینہ میں رہ گئے تھے اور جن کے ساتھ ایک صلح کا معاہدہ ہو چکا تھا، اپنا عہد توڑ کر مکّہ کے لشکر کے ساتھ جا ملے۔ دشمن جب مدینہ کے قریب پہنچے تو یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ایک چوڑی اور گہری خندق نے، جو مدینہ کے اردگرد کھودی گئی تھی، شہر پر حملہ کرنا ناممکن بنا دیا ہے۔ دشمن نے خندق کے اردگرد خیمے نصب کیے۔ ان کے ساتھ اہلِ مدینہ کی چند جھڑپیں بھی ہوئیں۔ جن میں پیکرِ ہمّت و جرأت حضرت علیؓ نے، جو بدر اور اُحد میں بھی اپنی شجاعت کے جوہر دکھا چکے تھے، بے حد عقلمندی اور بہادری کا مظاہرہ کیا۔ جب محاصرے کو ایک مہینہ گزر گیا تو شہر میں خوراک کی کمی محسوس ہونے لگی۔ اُدھر دشمن کا بھی سامانِ خوراک ختم ہونے لگا اور اس پر مستزاد یہ کہ بادوباراں کا ایک طوفان آیا جس نے خنک راتوں کو اور بھی خنک کر دیا، دشمن کے خیموں کو اکھاڑ پھینکا اور کھانا پکانے کے برتنوں تک کو اِدھر اُدھر بکھیر دیا۔ ابوسفیان کے لیے اب کوئی اور چارہ نہ رہا کہ وہ مہم سے دستبردار ہو کر ناکام مکہ لوٹ جائے۔ اس طرح مدینہ دشمن کے حملہ سے محفوظ رہا اور پھر کفار کے کسی لشکر نے مدینہ کا رخ نہ کیا۔ اب مدینہ نئی مملکت کا دارالخلافہ بن گیا۔

اس کے بعد مسلمان اردگرد کے قبائل پر، جن سے اچانک حملہ کا ڈر لگا رہتا تھا، حملہ آور ہوتے رہے۔ ان قبائل میں سے بہت سے اسلام پر ایمان لے آئے اور اس طرح اِسلامی مملکت کی شمالی حد شام کی سرحد سے جا ملی جو اس وقت سلطنتِ بازنطینہ کا حصّہ تھا۔

صلح حدیبیہ (۶۲۷ء)

ہجرت کے چھٹے سال نبی کریمؐ اپنے صحابہ اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ، جن کی تعداد ۱۴۰۰ سے ۱۷۰۰ تک بتائی جاتی ہے حج کے لیے عازمِ مکّہ ہوئے۔ اس قافلہ والوں نے احرام

باندھے ہوئے تھے مگر کسی کے پاس کوئی اسلحہ نہ تھا۔ البتہ قربانی کے جانور ساتھ تھے۔ قافلے نے حدیبیہ کے مقام پر قیام کیا جو مکّہ سے سات میل کے فاصلے پر تھا۔ جب رسول اللہ کو اطلاع ملی کہ مکّہ والوں کی طرف سے مخالفت ہوگی اور لڑائی چھڑ جانے کا اندیشہ ہے تو مکّہ والوں کو بذریعہ قاصد پیغام بھیجا کہ ہم حج کی نیت سے آئے ہیں، لڑائی لڑنے نہیں آئے۔ مگر تھوڑی دیر بعد یہ اطلاع موصول ہوئی کہ عثمان جن کو قاصد کے طور پر بھیجا گیا تھا شہید کر دیئے گئے ہیں، حج کی اجازت بھی نہیں ملی اور اگر مکہ میں داخل ہونے کی کوشش کی گئی تو اس کی مخالفت ہوگی، تو رسول اللہ نے اپنے ہمراہیوں سے حلف لیا کہ اگرچہ وہ غیر مسلح ہیں اگر ان پر حملہ کیا گیا تو وہ بھی لڑیں گے خواہ ان کی جان جاتی رہے۔ کیونکہ قریش اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ لوگ کس طرح جان پر کھیل جانے والے ہیں۔ اس لیے انہوں نے صلح کا ہاتھ بڑھانے میں ہی مصلحت سمجھی۔ چنانچہ مشورے شروع ہوئے اور آخر کار فریقین کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا۔ یہ عہد نامہ صلح حدیبیہ کہلاتا ہے اور اس کی اہم شرائط یہ تھیں۔

(۱) رسول کریم صلحنامہ پر دستخط بطور محمد بن عبداللہ کریں نہ کہ بطور رسول اللہ۔ اس شرط پر مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو مگر حضورؐ نے حضرت علیؓ کے ہاتھ سے دستاویز چھین کر رسول اللہ کے الفاظ کاٹ کر بہ حیثیت محمد بن عبداللہ دستخط کر دیے۔

(۲) قافلہ اس سال بغیر حج کیے واپس مدینہ لوٹ جائے مگر اگلے سال حج کے لیے آسکتا ہے اور حاجی تین دن مکّہ میں ٹھہر سکتے ہیں۔ یہ بھی طے ہوا کہ اہل مدینہ اپنے ساتھ ہتھیار لا سکتے ہیں مگر غلافوں میں چھپا کر۔

(۳) دس سال فریقین میں کوئی لڑائی نہیں ہوگی۔

(۴) مکہ کا کوئی شخص، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، قافلہ کے ساتھ مدینہ نہیں جا سکے گا۔ اور اگر مدینہ سے کوئی شخص مکّہ آئے گا تو اس کو واپس مدینہ جانے کی اجازت نہ ہوگی۔ قریش کی طرف سے دستخط سہیل نے کیے۔ جس کے بیٹے ابوجندل نے پہلے سے اسلام قبول کر لیا ہوا تھا اور مکہ والوں نے اس کو سخت ایذا پہنچائی تھی۔ ابوجندل حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، ضربوں کے نشانات دکھائے اور درخواست کی کہ مزید ایذا سے بچنے کے لیے اس کو مدینہ حاجیوں کے ساتھ جانے کی اجازت مل جائے۔ کیونکہ اس سے پہلے صلحنامہ پر دستخط ہو چکے تھے۔ حضورؐ نے اس کو مدینہ لے جانے سے انکار کیا اور فرمایا کہ صلحنامہ کے مطابق اس کو مکّہ ٹھہرنا پڑے گا۔ چند صحابہ نے اس فیصلہ پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ مگر اس کی تعمیل کا حکم دیا گیا۔

اسی طرح کے ایک اور واقعہ کا یہاں ذکر کر دینا مناسب ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ ایک مسلمان جس کا نام عتبہ تھا مکّہ والوں کا بے رحمانہ سلوک برداشت نہ کر سکا اور مکّہ سے

بھاگ مدینہ آگیا ۔ معاہدے کے مطابق اس کو مکّہ واپس جانے کا حکم ہوا اور جب دو محافظ اس کو مکّہ لے جا رہے تھے عتبہ نے ایک محافظ کو تو مار ڈالا اور دوسرا ڈر کر بھاگ گیا ۔ عتبہ نے ساحل بحرِ احمر پر واقع ایک مقام پر رہائش اختیار کر لی ۔ اس کے بعد اور بہت سے لوگوں نے بھی عتبہ کے پاس پناہ لی اور اس طرح اس مقام پر مسلمانوں کی ایک خاصی بستی آباد ہو گئی ۔ مکّہ سے شام کا راستہ اسی مقام سے ہو کر گزرتا تھا ۔ جب قریش نے اس بستی کی اہمیت کو سمجھا اور اس خطرے کو محسوس کیا جو مکّہ کی شام کے ساتھ تجارت کو لاحق ہو گیا تھا ۔ تو انہوں نے خود اس شرط کو صلحنامہ سے حذف کرنا منظور کر لیا جس سے مدینہ کے مسلمانوں پر لازم آتا تھا کہ مسلم پناہ گزینوں کو وہ مدینہ سے مکہ واپس کر دیں گے ۔ ابو جندل اور عتبہ کے واقعات اور رسول اللہ کے صلحنامہ حدیبیہ پر اپنے دستخط قریش کی خواہش کے مطابق کرنے سے معلوم ہو جانا چاہیئے کہ رسول اکرمؐ صلح کی کتنی خواہش رکھتے تھے اور معاہدوں کو آپؐ کتنا مقدّس سمجھتے تھے ۔ زمانہ حال میں بین الاقوامی معاہدات یا تو کاغذ کا معمولی پرزہ سمجھے جاتے ہیں جن کو کسی وقت کسی مصلحت کے تابع پھاڑا جا سکتا ہے یا ان پر عمل کرنا کمزوری کی نشانی یا فریقین کی مرضی پر منحصر خیال کیا جاتا ہے ۔ یہ کوئی بیجا الزام نہیں بلکہ حالیہ تاریخ اس کی صداقت کی شاہد ہے ۔ مگر تاریخ کوئی ایسی مثال پیش نہیں کر سکتی کہ رسول کریمؐ کی زندگی میں یا آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کے صحابہ کے عہد میں کسی عہد نامہ سے انحراف کیا گیا ہو ۔ اس بات سے کہ صلح نامہ حدیبیہ میں سے آنحضرتؐ نے رسول اللہ کا لفظ فریق ثانی کے اصرار پر قلمزن کر دیا تھا آپؐ کی رسالت پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ اس واقعہ کی بنا پر اگر کوئی دلیل گھڑنے کی کوشش کی جائے تو وہ بالکل غیر متعلقہ ہوگی ۔ نہ تو یہ واقعہ اس بات کا اقبال تھا کہ آپؐ اللہ کے رسول نہیں ۔ اور نہ اس امر کا اعتراف کہ آپؐ پر جو وحی نازل ہوتی تھی وہ من گھڑت افسانہ تھا ۔ فریق ثانی نے یہ الفاظ کاٹنے پر اس لیے اصرار کیا تھا کہ الفاظ کا صلحنامہ میں ہونا آپؐ کو دراصل اللہ کا رسول ماننے کے مترادف ہوتا ۔ اعتراض صرف عہد نامہ کی شکل پر تھا اور رسول اللہ کو معلوم تھا کہ جو تعلق آپؐ کے اور اللہ کے درمیان ہے اس پر اس فعل کا کوئی اثر نہیں پڑے گا ۔ صرف صلح جوئی کی خاطر آپؐ نے فریق ثانی کی تجویز کو قبول کر لیا ۔ اگرچہ چند صحابہ اس فعل سے ناراض ہوئے ، پوری حقیقت اللہ اور اس کے رسول کو معلوم تھی ۔

فتح خیبر (۶۲۸ء)

مسلمانوں کی ایک مشہور فتح یہود خیبر اور دیگر یہودیوں کی بستیوں کی ہے ۔ خیبر ایک خوشحال شہر تھا جس میں وہ یہودی آباد تھے جو مصر سے نکل آئے تھے یا مدینہ چھوڑ کر یہاں آباد ہوئے تھے ۔ کچھ یہودی شروع سے ہی یہاں رہتے تھے ۔ یہ شہر کئی مضبوط قلعوں سے ایک محفوظ مقام بنا دیا گیا تھا جن

میں سے بعض کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا۔ کہ وہ ناقابل تسخیر ہیں ۔ وادی شاداب اور سرسبز تھی اور شہر کے لوگ ہر لحاظ سے خوش حال نظر آتے تھے ۔ یہاں کے یہودیوں کا قریشِ مکّہ اور دُوسرے کفار قبائل کے ساتھ، خواہ وہ یہودی ہوں یا عرب، گہرا گٹھ جوڑ تھا۔

قریش کو بے بس بنانے کے بعد اسلامی لشکر نے رسول اللہ کے سیاہ عَلَم کے نیچے خیبر کی جانب کوچ کیا ۔ عَلَم پہلے حضرت ابوبکرؓ اُٹھائے ہوئے تھے ۔ بعد میں یہ عَلَم حضرت عمرؓ نے اور پھر حضرت علیؑ نے اٹھایا ۔ اسلامی لشکر میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو حدیبیہ میں بھی رسول اللہ کے ساتھ تھے ۔ یہودیوں نے حملہ آوروں کی سخت مزاحمت کی اور پھر وہ مضبوط قلعوں میں پناہ لینے کے لیے داخل ہو گئے ۔ قلعوں کا محاصرہ ایک ماہ تک جاری رہا ۔ آخر کار یکے بعد دیگرے وہ تسخیر ہونا شروع ہوئے ۔ اور جب سب سے بڑے اور مضبوط قلعہ کے دروازہ کو حضرت علیؓ نے توڑ ڈالا تو یہودیوں کو شکست تسلیم کرنی پڑی ۔ بہت سا مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا ۔ اس معرکے میں ۱۵ مجاہد شہید ہوئے اور پچاس زخمی ۔ خیبر فتح ہونے کے بعد دونواحی بستیوں وادیٔ القریٰ اور فدک نے ہتھیار ڈال دیے ۔ قیدیوں میں ایک خاتون صفیہ تھی جو کنانہ کی زوجہ تھی ۔ اس خاتون نے رسول اللہ کے عقد میں آنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ حضورؐ نے اس کی خواہش کو شرفِ قبولیت بخشا۔

ایک یہودی عورت نے آنحضرتؐ کو زہر دینے کی کوشش کی مگر یہ کامیاب نہ ہوئی ۔ اگرچہ ایک مسلمان، جس نے زہر آلود کھانا کھایا تھا، جان کھو بیٹھا ۔ یہودیوں نے التجا کی کہ ان کو اپنی زمینوں پر قابض رہنے دیا جائے ۔ یہ درخواست بھی منظور ہوئی مگر اس شرط پر کہ وہ اسلامی حکومت کو پیداوار کا نصف حصّہ دیا کریں ۔ اسی طرح بحرین کے یہودیوں اور مجوسیوں کو جن کے حکمران المنظر نے اسلام قبول کر لیا تھا، اپنے مذہب پر قائم رہنے کی اجازت دے دی گئی بشرطیکہ وہ جزیہ ادا کریں ۔

صلح حدیبیہ کی شرائط کے مطابق حضورؐ اپنے ان ساتھیوں کو جو پچھلے سال بھی آپؐ کے ہمراہ تھے اور چار سو دیگر افراد کو لے کر مکّہ کی طرف عازمِ حج ہوئے ۔ حج کرنے کے بعد تین دن وہاں قیام فرمایا ۔ ان دنوں کے لیے قریش نے مکّہ خالی کر دیا تھا ۔ کیونکہ رسول اللہ کے ساتھ دو ہزار مسلح آدمی تھے اگر آپؐ چاہتے تو مکّہ پر قابض ہو سکتے تھے ۔ کیونکہ مکّہ پر آپؐ کا اتنا ہی حق تھا جتنا قریش کا ۔ حضورؐ کے سامنے تجویز پیش بھی کی گئی کہ آپؐ ایسا کریں ۔ مگر یہاں

بھی معاہدوں کی پابندی کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپؐ نے ارشاد فرمایا، معاہدے معاہدے ہوتے ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونا فرض ہے۔
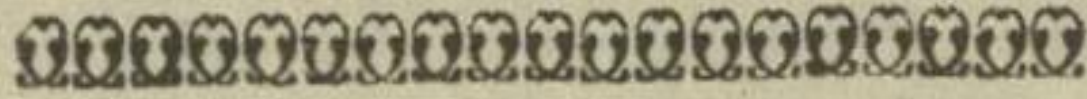
باب ۵

فتح مکہ ۔ حکمرانوں کو دعوتِ اسلام

تبلیغ اسلام رسول اللہ کا فرض تھا۔ جو خدا نے آپ کو سونپا تھا۔ آپ نے اپنے ارد گرد کی دنیا پر نظر ڈالی۔ عرب کے دائیں طرف خسروانِ فارس کی شہنشاہی تھی جس کی حدود آجکل کے ایران سے بہت زیادہ وسیع تھیں۔ شمال میں بازنطینہ یعنی مشرقی رومہ کی شہنشاہی تھی جس کے حکمران یونانی النسل تھے اور بائیں طرف مصر اور حبشہ کا ملک تھا۔ جس کا حکمران عیسائی تھا جو نجاشی کہلاتا تھا۔ شمال کا سارا علاقہ سلطنتِ بازنطینہ کا محکوم تھا۔ جس کا انتظام ایک سے زیادہ گورنروں کے سپرد تھا۔ ایک گورنر کے ماتحت غسان اور دوسرے کے ماتحت یمامہ کا علاقہ تھا۔ مگر یہ گورنر برائے نام بازنطینہ کے ماتحت تھے۔ مصر پر جس کو عرب سے بحر احمر جدا کرتا ہے۔ عزیز حکمران تھا مگر مصر بھی اس وقت بازنطینہ کا علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ اگر اسلام کو ایک عالمگیر مذہب بنانا مقصود تھا تو ارد گرد کے حکمرانوں کو اسلام سے واقف کرانا اور ان کو دعوتِ اسلام دینا، ایک ضروری قدم تھا۔ چنانچہ ۶۲۹ء میں رسول اللہ نے ان حکمرانوں کے نام ایک خط بھیجا جس میں ان کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ جو خط عزیزِ مصر کو لکھا گیا تھا وہ اب تک موجود ہے۔ حالیہ تحقیقات نے اب ظاہر ہوا ہے کہ اصل خط جو ہرقل شہنشاہِ بازنطینہ کو لکھا گیا تھا لندن میں موجود ہے اور ابوظہبی کے ثقافتی مرکز کی زینت بننے والا ہے۔ اس خط کی ایک نقل نوائے وقت مورخہ ۸ مئی ۱۹۷۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔ عزیزِ مصر کے نام کے خط اور مہر نبوت کا عکس قارئین کی زیارت کے لیے اسی باب میں دیا گیا ہے روایت ہے۔ مگر یہ غلط معلوم ہوتی ہے کہ خط موصول ہونے پر نجاشی حبش مسلمان ہو گیا۔ مگر خسرو پرویز نے یہ خط پھاڑ ڈالا اور یمن کے گورنر کو جو اس وقت خسرو پرویز کے ماتحت تھا حکم دیا کہ نبی اکرمؐ کو گرفتار کر کے اس کے دربار میں بھیجا جائے۔ جب وہ شخص جس کے پاس گرفتاری کا حکم تھا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے فرمایا کہ جس حاکم نے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے وہ تو مر چکا ہے اور یہ بات سچ بھی تھی کیونکہ پرویز اپنے ہی بیٹے کے ہاتھ سے قتل ہو چکا تھا جب گورنر یمن کو اس بات کی تصدیق ہو گئی تو وہ مسلمان ہو گیا۔ ہرقل شہنشاہ بازنطینہ نے قاصد کا باعزت

بسم الله الرحمن الرحیم من محمد عبد الله ور
سوله الی المقوقس عظیم القبط سلام علی
من اتبع الهدی اما بعد
فانی ادعوک بدعایة الاسلام اسلم تسلم
یؤتک الله اجرک مرتین
فان تولیت فعلیک اثم القبط
یا اهل الکتاب تعالوا الی کلمة
سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا الله
ولا نشرک به شیئا ولا یتخذ بعضنا
بعضا اربابا من دون الله فان
تولوا فقولوا اشهدوا بانا مسلمون

عکس ـــــ فرمانِ نبوی ﷺ

استقبال کیا اور نئے دین کے متعلق ابو سفیان سے جو اس وقت دربار میں حاضر تھا کچھ سوال پُوچھے تاریخ سے پتہ نہیں چلتا کہ عزیز مصر پر اس خط کا کیا اثر ہوا - غسان کے گورنر شرجل نے قاسد کو مروا ڈالا - شرجل کی گستاخی پر برہم ہو کر رسول اللہ نے ۶۳۰ء میں اس کی سرزنش کے لیے ۳۰۰۰ کا ایک لشکر تیار کیا جس کی کمان زیدؓ کے سپرد ہوئی - یہ زیدؓ وہی غلام ہیں جن کو آنحضرتؐ نے اپنی شادی کے وقت آزاد کر دیا تھا - دیکھیے نئے انقلاب میں انسان کی یکسانیت اور اس کا مرتبہ - ممتاز صحابہ کرام بھی ایک سابقہ غلام کی ماتحتی میں خوشی سے جنگ میں شریک ہوتے ہیں اور اس کو باعث عار نہیں سمجھتے اور نہ ہی اپنی بزرگی اور رسول اللہ کی شرف صحابیت کی وجہ سے کسی ممتاز حیثیت کے طلبگار ہوتے ہیں - صحابہ کی بزرگی کے لحاظ سے لشکر کی قیادت ان میں سے کسی ایک کے سپرد ہونی چاہیے تھی - مگر دوران جنگ زہد و تقویٰ اور بزرگی اور چیز ہے اور فنِ حرب میں جو خوبیاں اور صفات درکار ہوتی ہیں وُہ اور چیز - زیدؓ میں فنِ سپاہ گری کی سب صلاحیتیں موجود تھیں -

معرکۂ موتہ (۶۳۰ء)

شہنشاہِ بازنطینہ کو جب یہ خبر ملی کہ لشکرِ اسلام اس کی شمالی سرحد پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے تو اس نے ایک لاکھ سپاہیوں کا لشکر تیار کیا اور اسی تعداد میں عرب عیسائی بھی اس لشکر میں شامل ہو گئے دونوں لشکروں کا مقام موتہ پر مقابلہ ہوا - گھمسان کی لڑائی ہوئی جس کے بارے میں صرف ایک یورپی مؤرخ کے بیان سے اقتباس دینا کافی ہو گا - ممتاز مورخ گبن اپنی مشہور زمانہ کتاب[1] میں لکھتا ہے -

"مقدس علم زید کے سپرد ہوا اور اس اٹھتی ہوئی تحریک کے معتقدین میں وہ جوش و خروش اور ایسا نظم و ضبط تھا کہ بڑے سے بڑے اور ممتاز سے ممتاز صحابہ ایک سابقہ غلام کے ماتحت خدمت گزاری پر خوشی سے رضامند ہو جاتے تھے - اگر زیدؓ مر جائے تو لشکر کی کمان جعفرؓ کے سپرد ہونا تھی اور اگر وہ بھی مارا جائے تو کمان عبد اللہؓ کے ہاتھ جانا تھی - اگر یہ تینوں قتل ہو جائیں تو فوج کو اختیار تھا کہ جس کو وُہ چاہیں اپنا کمانڈر منتخب کر لیں - یہ تینوں کمانڈر پہلی ہی لڑائی میں مارے گئے - زید ایک سپاہی کی طرح اگلی صف میں لڑتے ہوئے گرا - جعفر کی موت ایک شجاع کی موت تھی جو یاد رکھنے کے قابل ہے - اس کا دایاں ہاتھ کٹ گیا تو اس نے علم اپنے بائیں ہاتھ میں تھام لیا - بایاں ہاتھ کا اگلا حصّہ بھی جسم سے علیحدہ ہوا تو اس نے خون بہتے بازو کے باقی حصّے سے علم دبائے رکھا حتیٰ کہ وہ پچاس زخموں سے نڈھال ہو کر زمین

---

[1] DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE

پر گر پڑا۔ عبداللہؓ کی باری آئی تو اس نے للکار کر کہا، آگے بڑھو۔ فتح یا بہشت دونوں میں سے ایک چیز یقیناً آپ کی ہے۔ مگر ایک رومی سپاہی کے نیزے سے وہ بہشت کا حقدار بن گیا گرتے ہوئے علم کو خالدؓ بن ولید نے، جو مکہ میں اسلام قبول کر چکا تھا، سنبھالا اور وہ ایسی بہادری سے لڑا کہ نو تلواریں اس کے ہاتھ میں یکے بعد دیگرے ٹوٹ گئیں۔ فتح اسی کی ہوئی خالدؓ نے عیسائیوں کو جو تعداد میں بہت زیادہ تھے شکست فاش دی۔"

فتح مکہ۔ مکہ کے بُت اوندھے

رسول اللہؐ جن کو اللہ کی طرف سے ایک مشن سونپا گیا تھا غیر متزلزل ایمان رکھتے تھے اور آپؐ صاف طور پر دیکھتے تھے کہ جب تک آپؐ کے مشن کی مکہ سے مخالفت جاری رہے گی اسلام تمام عرب کا مذہب نہیں بن سکتا۔ نظریاتی تضاد کی وجہ سے بھی مکہ اور مدینہ اکٹھے زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ اسلام کا پہلا اصول وحدانیت تھا۔ اس کے برعکس قریش بے شمار بتوں پر ایمان رکھتے تھے۔ ہجرت کے بعد قریش کے بار بار مدینہ پر حملہ آور ہونے سے ثابت ہو چکا تھا کہ جب تک مکہ میں قریش کی طاقت اور ان کے نظریہ کو ختم نہ کیا جائے۔ مسلمانوں کو مدینہ میں سکون کی زندگی بسر کرنا اور تبلیغ اسلام کا فرض پورا کرنا ناممکن تھا۔ مکہ پر چڑھائی کا جواز اس واقعہ سے ملا جس میں ایک شبخون کے دوران ایک اتحادی قبیلہ کے ۲۰ آدمی مکہ والوں نے مار ڈالے۔ مسلمانوں کے ایک اتحادی قبیلہ کے افراد کو مار دینا اہل مدینہ پر یہ فرض عائد کرتا تھا کہ مکہ والوں سے اس خلافِ انسانیت فعل کا بدلہ لیا جائے۔ اور اتحادی قبیلہ بھی اہل مدینہ سے یہی توقع رکھتا تھا۔ کیونکہ یہ فعل صلح حدیبیہ کی اس وجہ سے خلاف ورزی تھا کہ مقتولین کا قبیلہ اور قاتلوں کا قبیلہ دونو صلح حدیبیہ میں فریق تھے۔ مقتولین کا قبیلہ مدینہ والوں کی طرف سے اور قاتلوں کا قبیلہ قریش کی طرف سے۔ مقتولین کے قبیلہ کے چالیس آدمیوں نے رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس خلاف ورزی کی شکایت کی حضورؐ کو بہت غصہ آیا اور کھڑے ہو کر آپؐ نے فرمایا کہ اگر اس وقت مظلوم قبیلہ کی مدد نہ کی گئی تو اللہ بھی ہماری مدد نہیں کرے گا۔ ابو سفیان نے، جن کی دختر ام حبیبہ حضورؐ کے نکاح میں آ چکی تھیں، تجویز پیش کی کہ صلحنامہ کی از سر نو تجدید کافی ہوگی مگر یہ تجویز مسترد ہوئی اور دس ہزار مجاہدین نے پوشیدہ طور پر مکہ کا رخ کیا۔ مجاہدین کے ساتھ دو اور قبائل بھی شامل ہو گئے جن میں ہر ایک کے ساتھ سات سو افراد تھے۔ اس لشکر نے مکہ کے قریب ایک اونچے مقام پر قیام کیا اور حسب ہدایت ہزار جگہ آگ روشن کر دی۔ یہ دیکھ کر اور لشکر کی تعداد سے ڈر کر ابو سفیان حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام میں شامل ہو گیا۔ مکہ جا کر اس نے علان کیا کہ ہر وہ شخص جو اس کے مکان میں پناہ لے گا یا اپنے مکان میں چھپ جائے گا وہ امان میں رہے گا۔

جب یہ دس ہزار سے زائد لشکرِ اسلام کے علم کے نیچے مکہ میں داخل ہوا تو کسی نے بھی اس کی مزاحمت نہ کی۔ ایک گروہ نے خالدؓ کی مزاحمت کی اور ان پر تیر برسائے۔ اس وقت خالدؓ دائیں بازو کی کمان کر رہے تھے اور ان کو حضورؐ کی طرف سے ہدایت تھی کہ اس روز کسی کو نہ مارا جائے۔ البتہ اگر دشمن میں سے کوئی گروہ قاتلانہ حملہ کرے تو اس کو پسپا کیا جائے۔ خالدؓ نے حملہ کا جواب دیا اور جس گروہ نے خالدؓ پر حملہ کیا تھا اس کے ۲۸ آدمی جن میں ۲۴ قریش تھے، مارے گئے۔ خالدؓ کے بھی تین مجاہد شہید ہوئے۔

اسلامی لشکر کا مکہ میں داخلہ فوجی نمائش کے نقطہ نگاہ سے ایک شاندار نظارہ تھا۔ قبیلۂ سلیم کا دستہ سب سے پہلے داخل ہوا۔ اس کے بعد مازینہ کا دستہ اور اس کے پیچھے قبیلۂ جاحینہ کا دستہ۔ سب سے پیچھے حضورؐ کی سواری تھی جس کے دونو جانب مہاجرین و انصار محافظ تھے۔ اس نظارہ سے متاثر ہو کر ابوسفیانؓ نے عباسؓ سے کہا کہ آج سے آپ کے بھتیجے کی بادشاہت شروع ہو گئی ہے۔ عباسؓ نے جواب دیا۔ یہ بادشاہت نہیں نبوت ہے۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد رسول اللہ کعبہ تشریف لے گئے جہاں آپؐ نے طواف کیا۔ اس وقت کعبہ کے اندر اور باہر ۴۰۰ بُت تھے جو لکڑی اور پتھر سے گھڑے گئے تھے۔ ان سب بتوں کو مسمار کر دیا گیا۔ ان بتوں میں دو بڑے بُت عزّا اور منات تھے جن کو بہت متبرک سمجھا جاتا تھا۔ ان دونوں کی مسماری کا حضورؐ نے خود حکم دیا۔ جب بلالؓ نے کعبہ کی چھت سے آذان دی اور نماز کے بعد حضورؐ ایک مختصر سا خطبہ دے چکے تو چند لوگوں کو، جن میں کچھ عورتیں بھی تھیں جن کو اسلام سے سخت دشمنی رہی تھی، قتل کر دیا گیا۔ باقی سب لوگوں کے لیے عام معافی کا اعلان کیا گیا۔ ان شخصوں کے لواحقین کو جن کو خالدؓ کے دستے نے قتل کر دیا تھا معاوضہ ادا کیا گیا اور حضورؐ نے اللہ اور ان کے لواحقین سے معافی بھی مانگی۔ کعبہ کی کنجی اس کے محافظ اور اس کی اولاد کے لیے مخصوص کر دی گئی۔ اس طرح ہجرت کے آٹھویں سال مکہ کی تسخیر مکمل ہوئی اور اس کے ساتھ ہی وہ مکروہ شکل بت مع ان توہمات اور اس مفروضہ طاقت کے قصوں کے، جو صدیوں سے ان کے گرد گھڑے گئے تھے اور جن پر قریش کے چند خاندان پل رہے تھے، ختم ہوئے اور خدائے وحدہٗ لاشریک کی حاکمیت حقیقت بن کر نظر آنے لگی۔

حنین (۶۳۰ء)

فتح مکہ کے بعد دو غیر مسلم قبائل وادی حنین میں جو مکہ سے تین دن کا سفر ہے کفار مکہ کی امداد کے لیے اکٹھے ہوئے۔ رسول پاکؐ بارہ ہزار کی جمعیت لے کر خود ان کی طرف روانہ ہوئے مگر وادی میں پہنچ کر دیکھا کہ دشمن وادی کے دونوں طرف اونچے اونچے مقامات پر قبضہ کیے بیٹھا ہے اور فوجی نقطہ نگاہ سے

وادی کے اندر کی فوج ان کے مقابلہ کے لیے بے بس ہے ۔ یہ دیکھ کر مجاہدین کے لشکر نے سوائے حضورؐ کے دستہ کے واپس ہونا شروع کر دیا مگر جب ان کو پکارا گیا تو وہ لوٹ آئے اور ایک زبردست لڑائی شروع ہوئی ۔ دشمن نے شکست کھائی اور پسپا ہونا شروع کیا ۔ اس کا تعاقب کر کے اس پر حملہ کیا گیا اور اس کے بہت سے آدمی مارے گئے ۔ مگر رسول اللہ کے حکم کی تعمیل میں کسی بچہ کو نقصان نہیں پہنچایا گیا ۔ ۶۰۰ دشمن قید ہوئے ۔

طائف

دشمن نے طائف میں پناہ لی مگر اس کا محاصرہ کیا گیا ۔ اس قصبہ کی فصیل بہت مضبوط تھی اور منجنیقوں کے استعمال کے باوجود ناقابلِ شکست ثابت ہوئی ۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جب رسول کریمؐ تبلیغ کی غرض سے طائف تشریف لائے تھے تو قصبہ کے لونڈوں نے آپؐ کو پتھروں سے زخمی کر کے شہر سے نکال دیا تھا ۔ اب اسی قصبہ پر منجنیقوں کے ذریعہ پتھر برسائے گئے ۔ مگر پھر بھی فصیلِ شہر نہ ٹوٹی اور یہ قصبہ فتح نہ ہو سکا ۔

تبوک (۶۳۰ء)

فتح مکّہ کے بعد قریباً سارا عرب مطیع ہو کر داخل اسلام ہو چکا تھا ۔ مگر معرکۂ موتہ کے بعد متواتر خبریں موصول ہوتی رہیں کہ ہرقل شہنشاہ بازنطینہ اور اس کے محکوم اور اتحادی عرب قبائل مسلمانوں پر حملہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں ۔ ویسے بھی بازنطینہ ان ملکوں کی فہرست میں شامل تھا جن کا فتح کرنا اسلام پھیلانے کے لیے ضروری تھا ۔ کیونکہ اس طرف سے ہمیشہ خطرہ لگا رہتا تھا مگر جس وقت اس سلطنت کے علاقہ پر حملہ کیا گیا حالات نامساعد تھے ۔ گرمی میں کئی سو میل لمبا ایک وسیع اور خشک صحرا عبور کرنا تھا جب انسانی طاقت سست پڑ جاتی ہے ۔ اس کے علاوہ بادِ سموم فوج کو کسی وقت بھی گھیر کر خطرے کا باعث بن سکتی تھی ، آمد و رفت ، خوراک اور پانی کے انتظام کی مشکلات بھی درپیش تھیں ، فصل کی کٹائی بھی انہی دنوں میں ہوتی تھی اور کسانوں کا اپنی زمینوں کو طویل عرصہ کے لیے چھوڑنا ان کی بربادی کا باعث ہو سکتا تھا ۔ مگر جب جنگ کا علم بلند ہوا اور لشکر مدینہ کی گلیوں سے گزرا تو اس کی تعداد دس ہزار گھوڑ سوار اور تیس ہزار پیادہ مجاہدین تھی ۔ طویل مسافت طے کرنے کے بعد لشکر رومی صوبہ شام کے اس مقام تک پہنچ گیا جو مدینہ سے دس دن کی مسافت پر واقع تھا اور اس نے چھوٹے سے نخلستان میں چشمہ تبوک پر قیام کیا ۔ اس اسلامی لشکر کی نقل و حرکت سے شاہ ہرقل اور اس کے اتحادی عرب ایسے متاثر ہوئے کہ انھوں نے صلح پر آمادگی کا اظہار کیا ۔ جو مقامی عرب روم کے محکوم تھے انہوں نے اپنی آزادی کا اعلان

کر دیا اور اسلامی حکومت کی اطاعت قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وُہ خراج دینے پر بھی آمادہ ہو گئے۔ ہرقل مقام حمص پر ہی رک گیا اور لڑائی میں شریک ہونے کا حوصلہ نہ کر سکا۔ مگر خالدؓ نے لڑائی کا آغاز کر دیا۔ اور اکیدر کو قید کر لیا۔ اس کے بھائی حُسان کو قتل کر ڈالا۔ اِس لیے ان دونوں کے ہمراہی بھاگ نکلے۔ اکیدر کو رسول اللہ کی قیام گاہ پر بھیج دیا گیا اور خالدؓ نے دومۃ الجندل پر قبضہ کر لیا۔ اکیدر اور مقامی لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس جنگی مہم کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ دریائے فرات سے ایلہ تک، جو بحر احمر کے سرے پر واقع ہے، کا سارا علاقہ مملکتِ اسلامیہ میں شامل ہو گیا۔ مشہور مؤرخ گبن اس جنگی مہم کے متعلق لکھتا ہے۔

"یہ کوچ نہایت دشوار تھا۔ نقاہت اور پیاس کی شدت میں جھلسا دینے والے سورج اور صحرا کی زہر آلود ہوا نے اضافہ کر دیا۔ دس آدمی باری باری اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔ حالت یہاں تک نازک تھی کہ مجاہدین کو اونٹ جیسے مفید جانور کے پیٹ سے پانی نکال کر پیاس بجھانی پڑی۔

یسوع کے پیروبیہ دیوں کے دشمن سے راہ و رسم بڑھانے لگے اور یہ بات فاتح کے مفاد میں تھی کہ دشمن دنیا کے نہایت طاقتور مذہب سے شکست کھا کر مناسب شرائط پیش کرے اور اپنی شکست تسلیم کرے۔"

وفود کی آمد

تبوک کی فتح کے بعد عرب قبائل کے ۳۷ وفود یکے بعد دیگرے مدینہ آئے اور اسلام قبول کیا۔ مگر یمن کے بعض عیسائی قبائل نے تبدیلیٔ مذہب پر خراج دینے کو ترجیح دی۔ اس کے عوض ان کو جان و مال کی حفاظت کا یقین دلایا گیا۔ ان کے پادریوں کو اپنے عہدوں پر رہ کر اپنا کام کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ طائف کے ایک قبیلہ نے درخواست کی کہ ان کو اپنے بُت توڑنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ یہ درخواست بھی منظور ہوئی اور ان کے بتوں کو انہیں خود توڑنے پر مجبور نہ کیا گیا۔ اُن لوگوں کو جو ایمان لے آئے ان کی جائداد اور مال و جان کا تحفظ دیا گیا۔ مگر ادائیگیٔ زکوٰۃ ایک مذہبی فرض تھا۔ اِس لیے اس فرض کی ادائیگی سے ان کو مستثنٰی نہ کیا گیا۔ اس طرح ہجرت کے دسویں سال (۶۳۲ء) کے اختتام سے پہلے تمام عرب قبائل سوائے ال یمامہ کے مسیلمہ کذّاب اور بنی اسد کے یا تو اسلام میں شامل ہو گئے یا انہوں نے اسلامی حکومت کی اطاعت قبول کر لی۔

عرفات پر آخری خطبہ

بیسویں صدی ہجری (۶۳۲ء) کے ذیقعد کے مہینے میں رسول اللہ آخری دفعہ مکہ تشریف لائے۔ آپؐ کے ہمراہیوں کی تعداد نوّے ہزار سے ایک لاکھ تیرہ ہزار تک بیان کی جاتی ہے۔ عرفات کے مقام پر آپؐ نے لوگوں کو آخری خطبہ سنایا جس میں اسلامی معاشرے کے تمام موٹے موٹے اصول بیان کیے گئے۔ اگرچہ خطبہ کے الفاظ کے متعلق مؤرخین میں کچھ اختلاف ہے۔ نفس مضمون پر کوئی اختلاف نہیں۔ آپؐ نے فرمایا:-

"لوگو! میری طرف متوجہ ہو اور میری بات غور سے سنو کیونکہ آئندہ سال شائد میں آپ سے نہ مل سکوں۔ آپ کی جانیں اور جائدادیں قیامت تک آپ کے درمیان محفوظ ہیں قیامت کے دن آپ کو اپنے اعمال کا حساب دینا پڑے گا۔ اگر کسی شخص کے پاس دوسرے کی امانت ہے اُسے چاہیئے کہ امانت کی شرائط پوری کرے۔ اگر کسی شخص نے سُود پر روپیہ دیا ہے تو اس کو چاہیئے کہ وُہ صرف زر اصل وصول کرے اور مقروض بھی زر اصل ہی ادا کرے کیونکہ اللہ سُود کو پسند نہیں کرتا۔ جو سُود عباس کو واجب الادا ہے وہ آج چھوڑا جاتا ہے۔ زمانۂ جاہلیت کے قتل اب بھول جانے چاہئیں ان قتلوں میں رابعہ کا قتل ہے وُہ آج معاف کیا جاتا ہے۔

اے لوگو! آپ کو عورتوں پر حقوق ہیں اور آپ کی عورتوں کو آپ پر۔ آپ کو حق ہے کہ اپنی عورتوں سے کہیں کہ تم کسی ایسے شخص کو جس کو آپ پسند نہیں کرتے اپنے ساتھ فرش پر نہ بیٹھنے دیں۔ مبادا کہ وہ کوئی نازیبا حرکت کریں۔ اگر وہ یہ بات نہ مانیں تو خدا آپ کو اجازت دیتا ہے کہ ان کو ان کے کمروں میں بند کر دیں اور ان کو سزا دیں۔ مگر سزا سخت نہیں ہونی چاہیئے اگر وہ اپنی اصلاح کر لیں تو ان کو اچھا کھانا دو۔ اچھا لباس پہناؤ اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ وُہ آپ کے پاس امانت ہیں۔ ان کے اپنے پاس کچھ نہیں اور ان کو آپ نے خدا کی ضمانت پر رکھا ہوا ہے۔

سنو اے لوگو! میری بات سنو اور اپنی عقل سے کام لو۔ مَیں نے سب باتیں آپ کو کہہ دی ہیں اور اپنے پیچھے مَیں کتاب اللہ اور اپنے عمل کو چھوڑ رہا ہوں۔ اگر آپ ان دونوں پر عمل پیرا ہوں گے تو آپ سیدھے راستے سے کبھی نہیں بھٹکیں گے۔

توجہ سے سنو اے لوگو میری بات اور اس کو سمجھو۔ ہر ایک مسلم دوسرے مسلم کا بھائی ہے۔ کوئی دوسرے کا مال نہیں لے سکتا تاوقتیکہ مالک خود اس کو نہ دے۔ ایک دوسرے

کے ساتھ زیادتی مت کرو۔ آپ کے غلام آپ کے ہی غلام ہیں۔ ان کو وہی کھانا دو جو تم کھاتے ہو۔ اور پہننے کے لیے ان کو ویسا ہی لباس دو جو تم پہنتے ہو۔ اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو پھر ان غلاموں کو کسی دوسرے کو دے دو۔ ان کو ایذا کبھی نہ پہنچاؤ۔"

اس خطبہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک یورپی مؤرخ (H. G. WELLS) جس کو کسی طرح بھی اسلام دوست نہیں کہا جا سکتا، اپنی کتاب[ل] کے صفحہ ۶۰۶، ۶۰۷ پر لکھتا ہے۔

"اس خطبہ نے مسلمانوں کے درمیان جن کی دنیا میں تعداد ۳۵ کروڑ ہے (اب اسی کروڑ) سب جھگڑوں اور لڑائیوں کو ختم کر دیا۔ اور مسلم حبشی کو خلیفہ کے برابر بنا دیا۔ مساوات کا تصور، جو اب تمام مہذب قوموں کے دستور کا جزو ہے، کسی طرح بھی اس سادگی اور راست بازی کو نہیں پہنچتا جو اس خطبہ کا نمایاں پہلو ہے اور یہ الفاظ ازمنۂ وسطےٰ کے شروع میں ایک ایسی ہستی کی زبان سے نکلے جس کو مسلّمہ طور پر اُمّی (ان پڑھ) کہا جاتا ہے۔"

رسول کریمؐ کی زندگی میں آخری مہم شام پر حملہ کرنا تھا۔ شام کی سرحد پر صلح کے بعد تیس ہزار کا لشکر ایلہ کے عیسائی شہزادے یوحنّا کو مطیع کر کے اور اس کو خراج دینے پر رضامند کر کے اکتوبر ۶۳۰ء میں واپس مدینہ آیا۔ خطبۂ عرفات کے بعد واپس ہونے پر حضورؐ نے شام پر چڑھائی کا حکم دیا اور اس حکم کی تعمیل میں جب لشکر جمع ہوا تو اس کا علم اسامہ بن زید کے سپرد کیا گیا۔ اس کے بعد حضورؐ کسی عارضہ میں مبتلا ہو گئے اور آپ کی زندگی میں شام پر حملہ نہ ہو سکا۔ خطبۂ عرفات میں حضورؐ نے اشارہ کیا تھا کہ میں شاید اگلے سال آپ کو نہ مل سکوں۔ اس اشارہ سے اور اس آیت کے نزول سے، جس کا مفہوم یہ تھا کہ میں نے آج آپؐ کے دین کی تکمیل کر دی ہے اور اپنی سب نعمتیں آپؐ کو عطا کر دی ہیں اور آپؐ کے دین کے لیے اسلام کا نام منتخب کیا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں ڈر پیدا ہو گیا تھا کہ شاید آپؐ دیر تک زندہ نہ رہ سکیں۔

عارضہ نے سر درد کی صورت اختیار کر لی جس کا تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد حملہ ہوتا تھا۔ آخر حضورؐ نے ہجرت کے گیارھویں سال ربیع الاوّل کے مہینہ (بمطابق ۶۳۲ء) میں وفات پائی۔ آپؐ کی عمر اس وقت تریسٹھ سال تھی۔ وفات سے کچھ دن پہلے جب آپؐ بیماری کے دوران گھر سے باہر نکلے تو آپؐ نے فرمایا تھا کہ

"میں آپ کی طرح ایک انسان ہوں۔ اس لیے آپ کے مجھ پر کچھ حقوق ہیں اور میرے حقوق آپ پر۔ اگر میں نے کسی کو ایذا پہنچائی ہے تو اس ایذا کے بدلے میرا جسم حاضر ہے۔

ل OUTLINES OF THE HISTORY OF THE WORLD

اگر مَیں نے کسی کا کوئی مالی نقصان کیا ہے تو جو کچھ میرے پاس ہے معاوضہ ادا کرنے کے لیے حاضر ہے۔ اور ایسے شخص سے مَیں معافی مانگتا ہُوں تاکہ جب مَیں اپنے رب کے پاس پہنچوں تو مجھ پر کوئی بار نہ ہو۔ اور اگر کسی شخص کو مجھ سے کوئی اور نقصان پہنچا ہے تو مَیں اس شخص کے لیے صرف دُعا کر سکتا ہُوں"۔

رسول اللہؐ کو اسی جگہ دفن کیا گیا جس جگہ آپ کی وفات ہوئی تھی۔ وفات کے وقت آپؐ کی شخصی جائداد چند سکّے، ایک سفید خچر، کچھ اسلحہ اور چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا تھا جس کو آپؐ پہلے ہی سے مسافروں کی سہولیت کے لیے وقف کر چکے تھے۔ باقی جائداد یعنی فدک، خیبر اور مدینہ حکومت کی ملکیت تھی جو کسی کو ورثہ میں نہیں مل سکتی تھی۔

مَیں نے رسول اللہ کی زندگی کے حالات، سیرت و کردار کا مختصر ذکر کیا ہے۔ آپؐ کے بچپن کے حالات پہلے بیان کیے جا چکے ہیں۔ آپؐ یتیمی کی حالت میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں آپؐ کا کردار ایسا بے لاگ تھا کہ لوگ آپؐ کو امین کہہ کر پکارتے تھے۔ آپؐ کی عمر بارہ سال کی تھی جب آپؐ کے چچا آپؐ کو ایک تجارتی سفر پر شام لے گئے۔ شام اس وقت شہنشاہ بازنطینیہ کے زیرِ نگیں اور مذہبی مباحثوں کا مرکز تھا۔ آپؐ نے غالباً ان مباحثوں کو سُنا ہوگا مگر ان مباحثوں کے آپؐ کو متاثر کرنے کی کوئی علامت یا شہادت نہیں ملتی۔ اس سفر سے واپسی پر آپؐ تیرہ سال مکّہ کے گرد و نواح کے صحراؤں میں پھرتے رہے۔ جہاں وہ اپنے چچا کی بکریاں چراتے تھے۔ آپؐ کی خاموش اور الگ رہنے والی طبیعت سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ کسی گہرے خیال میں مستغرق رہتے تھے۔ آپؐ کے اردگرد ہر جگہ مٹّی، پتھر یا دھات کے بتوں کی عام پرستش ہوتی تھی۔ آپؐ کو ضرور یہ خیال آتا ہوگا کہ لوگ ان بیجان بتوں کی کیوں پرستش کرتے ہیں۔ یہ بت نہ سوچ بچار کے لیے کوئی دماغ رکھتے تھے، نہ کسی قسم کے احساس کی قوّت۔ ان کا گلا اور شاید زبان بھی تھی مگر وہ بول نہیں سکتے تھے۔ ان کے ناک تھے مگر وہ سونگھ نہیں سکتے تھے۔ ان کے کان تھے مگر وہ سن نہیں سکتے تھے۔ ان کے جسم اور اعضا تھے مگر وہ ہل نہیں سکتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ ان کو انسانی ہاتھوں نے مٹّی وغیرہ کے مادے سے بنایا تھا مگر یہ بات کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ مادہ جس سے یہ بت گھڑے گئے تھے کس طرح پیدا ہُوا۔ کس نے اس کو پیدا کیا۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ بت ہزار ہا سال سے اپنی پرستش کرنے والوں کی زندگی پر حکمرانی کر رہے تھے۔ وہ انسانی اور حیوانی جانوں کی قربانی مانگتے تھے اور ان کے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ آپؐ کو یہ بات قابلِ قبول نظر نہیں آتی تھی کہ بڑی اَن گھڑی بھیانک اور بیجان شکلیں انسانی زندگی پر اثر انداز ہو سکتی ہیں یا اپنے پجاریوں کو کوئی نقصان یا فائدہ پہنچا سکتی ہیں کیونکہ ان کی پرستش کی غرض صرف ان سے فائدہ کی امید رکھنا تھی۔ اس ماحول کے

خلاف آپؐ کی طبیعت پر ایک ردِّ عمل ہوتا ہوگا اور اس وجہ سے آپؐ کو کسی ایسے حل کی تلاش رہتی ہوگی جو یہ معمہ سلجھا سکے کہ اگر انسانی زندگی خود بخود اپنا راستہ نہیں بناتی تو وہ کونسی طاقت ہے، زندگی جس کے تابع ہے۔ صحرا میں پھرتے ہوئے آپؐ دیکھتے تھے کہ ہوا ریت کے ٹیلوں کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ جا پھینکتی ہے۔ مضبوط اور خشک چٹانیں کھڑی ہیں۔ کیونکہ آسمان کہیں ایسا صاف نظر نہیں آتا جیسا کہ بعض اوقات عرب میں، آپؐ آسمان کی وسعت اور اس میں بیشمار ستاروں کو دیکھ کر حیران ہوتے ہوں گے۔ ان عجائبات کے مشاہدے سے آپؐ کے دل میں ضرور یہ خیال پیدا ہوتا ہوگا کہ کوئی ہستی ایسی ضرور ہے جس کے حکم سے کائنات میں سب تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اور ان تبدیلیوں کے باوجود عالم میں ایک ایسا نظام اور ترتیب نظر آتی ہے۔ جس کا تصوّر بغیر کسی ہستی کے جو اس نظام کو چلاتی ہے نہیں ہو سکتا۔

پیشتر اس کے ہم اس باب کو بند کریں چند اور کلمات رسول اللہ کی سیرت کے متعلق بیان کرنا مناسب ہیں۔ جب اسلامی حکومت قائم ہوئی اور آپؐ سارے عرب کے حکمران بن گئے تو مدینہ میں دولت کے انبار لگ گئے۔ مگر آپؐ کو حصولِ زر سے ہمیشہ نفرت رہی۔ خالق نے آپؐ کو ایک حسّاس اور نہایت دردمند دل دیا تھا۔ کفّار نے آپؐ کو طرح طرح کی اذیتیں دیں جو حضورؐ نے بڑے تحمل سے برداشت کیں۔ آپؐ کو گالیاں دی گئیں، دیوانہ اور جادوگر کہا گیا مگر آپؐ نے جواب تک نہ دیا۔ قریش نے تذلیل اور تضحیک میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی مگر سب کچھ صبر سے برداشت کیا۔ آپؐ کا مقاطعہ کیا گیا مگر شکوہ کا ایک لفظ زباں پر نہ آیا۔ طائف کے لونڈوں نے آپؐ کو پتھروں سے زخمی کیا مگر جواب میں نہ پتھر پھینکا اور نہ کسی پر ہاتھ اٹھایا۔ غریبوں کی سی زندگی گزاری مگر خیرات میں کمی نہ کی۔ عوام سے عرفات پر اور بیماری کے دوران خطاب کیا۔ دو دفعہ ان لوگوں سے معافی مانگی جن کو آپؐ نے کبھی نقصان نہیں پہنچایا تھا اور نہ ان کی کبھی دلآزاری کی تھی۔ غلاموں کو آپؐ نے غلام نہ سمجھا۔ سب سے پہلے اپنا غلام آزاد کیا۔ دوسرے غلاموں کو ان کے آقاؤں کے ہم پلّہ بنا دیا۔ عورتوں کو وہ درجہ دیا کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ دورانِ جنگ عورتوں اور بچّوں کا قتل اور فصلوں کا اجاڑنا اور درختوں کا کاٹنا ممنوع ٹھہرایا۔ اہلِ کتاب کے مذہب میں مداخلت نہ کرنے کی تاکید کی۔ قیدیوں سے، جب یا تو وہ مار دیے جاتے تھے یا غلام بنائے جاتے تھے، وہ سلوک کیا جس کا انسانیت تقاضا کرتی تھی۔ آپؐ کے دشمن آپؐ کو قتل کرنے کے ارادہ سے چند قدم پر کھڑے تھے مگر آپؐ نہ ہراساں ہوئے اور نہ اللہ سے مایوس۔

اس مرحلہ پر مجھے یورپ کے ایک مشہور افسانہ نویس (ARTHER CONAN DOYLE) کی کہانی، جو اس نے 'سرخ ستارہ' (RED STAR) کے عنوان سے لکھی ہے، یاد آتی ہے۔ جس میں

ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ کے نامور دانشوروں کی آپؐ کے متعلق کیا رائے ہے۔ کہانی یوں ہے:-

"تین متمول عیسائی استنبول میں کھانا کھانے کے بعد باسفورس کے کنارہ پر واقع ایک شاندار عمارت کے برآمدہ میں بیٹھے مصروف گفتگو تھے۔ ۴ نومبر ۱۸۶۳ء کا دن تھا۔ مغرب میں آسمان پر ایک سُرخ ستارہ چمک رہا تھا۔ تجویز یہ ٹھہری کہ تینوں اپنی اپنی سب سے عجیب کہانی سنائیں۔ دو دوست جب اپنی اپنی کہانی سنا چکے تو تیسرے کی باری آئی۔ اس نے کہا کہ میری سب سے عجیب کہانی مجھے اس سرخ ستارے کے دیکھنے سے یاد آتی ہے۔

مَیں نے افریقہ کے سفروں سے بہت سا روپیہ کمایا۔ دس سال پہلے کی بات ہے کہ ایک دفعہ ایک تجارتی سفر پر مجھے قسطنطنیہ سے یروشلم جانا پڑا۔ جب ساحلِ بحرِ احمر سے خشکی پر اُتر کر ہم نے اونٹوں پر بیش قیمت سامان لادا اور ہم مکہ سے گزر کر صحرا میں پہنچے تو ہم ایک جگہ آرام کرنے کے لیے بیٹھ گئے۔ وہاں مَیں نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ کیا دیکھتا ہُوں کہ سامنے ایک ریت کے ٹیلے پر ایک آدمی کھڑا ہے۔ جس کا قد ۴۰ فٹ کے لگ بھگ ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک نیزہ ہے جس کی لمبائی جہاز کے مستول کے برابر ہے۔ پھر اس شخص کے ساتھی بھی ٹیلہ پر چڑھ آئے۔ یہ لوگ دلواس (DILWAS) کے قبیلہ کے رہزن تھے۔ ان کا غیر معمولی قد سورج کی شعاؤں اور صحرا کی گرم ہوا کی وجہ سے ایک فریبِ نظر تھا۔ راہزن آہستہ آہستہ چھپ کر ہمارے پاس پہنچ گئے اور ہمیں لوٹنا شروع ہی کرنے والے تھے کہ دفعتاً مکہ کی جانب سے ایک شور سنائی دیا۔ مڑ کر دیکھا تو ایک بڑا قافلہ ۵۰۰ اونٹوں پر مشتمل ایک سردار کی سربراہی میں ہماری طرف آرہا ہے۔ عرب میں یہ دستور ہے کہ راہزنی کے وقت اگر دو تجارتی قافلے اکٹھے ہو جائیں تو دونوں مل کر راہزنوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ مکہ کی جانب سے آتا قافلہ جب ہمیں نظر پڑا تو ہمارا خیال تھا کہ یہ قافلہ بھی ہمیں لوٹے گا کیونکہ اس نے نیم دائرہ بنا کر ہمیں گھیر لیا تھا۔ مگر جب میری گفتگو اس قافلے کے سردار سے ہوئی، جس کے چہرے سے متانت، دبدبہ اور وقار ٹپکتا تھا، تو ہماری جان میں جان آئی۔ ہمارا اور مکہ کا قافلہ اکٹھے مل گئے۔ یہ دیکھ کر راہزن رفوچکر ہو گئے۔ اس قافلہ کے ساتھ ایک نوجوان علی بھی تھا۔ اس نوجوان نے سردارِ قافلہ کو ہمیں لوٹنے کا اشارہ کیا مگر سردار نے کہا ـ "علی نہیں۔ اس قافلہ کا رہنما بت پرست نہیں۔ رومی معلوم ہوتا ہے اس لیے اس سے بت پرستوں کا سا سلوک جائز نہیں"۔ علی نے کہا یہ شخص تو کافر ہے۔

سردار نے پھر کہا۔ "نہیں علی نہیں۔ ہم آج تک صرف تین سو مسلمان ہیں اور اگر ہم نے قتل و غارت شروع کر دیا تو اس مصروفیت میں ہم اپنا مقصد بھول جائیں گے۔ برخوردار یاد رکھو۔ خیرات اور دیانتداری ہمارے سچے مذہب کے ناک کی نکیل اور گلے کی رسی ہیں (مطلب یہ کہ دیانتداری اور خیرات سے ہی ہمارا مذہب سیدھے راستے پر چل سکتا ہے)
شام ہو گئی۔ ہم نے کھانا تیار کیا۔ وہ سردار نماز باجماعت پڑھنے کے بعد میرے پاس آیا۔ اس کے لیے اچھے سے اچھا کھانا تیار کیا گیا اور بہتر سے بہتر شراب کی بوتل کھولی گئی تھی مگر اس نے نہ ہمارا کھانا کھایا اور نہ شراب کو ہاتھ لگایا۔ صرف خشک روٹی خشک کھجوروں اور پانی سے پیٹ کی آگ بجھائی۔ رات کو اکٹھے بیٹھے ہماری گفتگو ہو رہی تھی آگ کی روشنی میں اس کا شاہانہ چہرہ اور جذبات بھری آنکھیں چمک رہی تھیں۔ یہ نظارہ میری آنکھوں سے کبھی محو نہیں ہوگا۔ میں اپنے سفروں کے دوران بہت سے دانشوروں اور مشہور زمانہ شخصیتوں سے مصروفِ گفتگو ہوا ہوں مگر مجھ پر کسی شخص نے ایسا گہرا اثر نہیں چھوڑا جتنا اس سردار نے۔ اس نے جن ارادوں کا مجھ سے اظہار کیا وہ اس کے مرنے کے بعد بھی پورے ہوتے رہے۔ میں خود عربی دان ہوں۔ اس کی آواز کبھی اونچی ہو جاتی تھی کبھی دھیمی اور کبھی صرف گنگناہٹ بن کر رہ جاتی تھی جس کو میں سمجھ نہیں سکتا تھا۔ مگر جب وہ خالق، فرشتوں اور آخرت کا ذکر کرتا تھا تو اس کی زبان میں ایسی فصاحت آجاتی تھی کہ مجھے یقین ہو جاتا تھا کہ میں کسی ایسے شخص کی صحبت میں بیٹھا ہوں جو فانی نہیں اور خدا کا بھیجا ہوا رسول ہے۔ ہمارے سر پر ایک روشن ستارہ چمک رہا تھا۔ اس کی طرف اشارہ کر کے وہ کہنے لگا کہ "یہ عیسیٰ کا ستارہ ہے۔ صلح و آشتی کا ستارہ۔ عیسیٰ ابراہیم اور موسےٰ سے بڑے تھے۔ وہ خالق کی مخلوق تھے۔ مگر مخلوق نے ان کو خالق بنا ڈالا"۔
وہ سرخ ستارہ جس سے میں نے اس کہانی کی ابتدا کی تھی اب بھی چمک رہا ہے۔ وہ سردار جس کا میں نے ذکر کیا ہے یا تو اپنے کام میں مصروف ہے یا کسی نے اس کو قتل کر دیا ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو اس کی آنکھوں اور مختصر صحبت نے مجھ پر ایسا اثر کیا ہے کہ مجھے یقین ہے کہ محمد بن عبداللہ، جو اس کا نام ہے، کسی نمایاں طریقہ سے اس ایمان کا ثبوت دے گا جو میں نے اس میں پایا۔"

یہ واقعہ میں نے کسی تاریخ میں نہیں دیکھا۔ اگر یہ صرف افسانہ ہے تو اس سے صرف یہی ظاہر نہیں ہوتا کہ دنیا کے ممتاز دانشوروں کی رائے میں رسول اکرمؐ نئے دین کو دیانتداری اور فیاضی کے سیدھے راستے پر چلانے کی کتنی خواہش رکھتے تھے۔ بلکہ اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ

یورپ کے دانشور آپؐ کے اخلاق اور ایمان کی صداقت کی وجہ سے آپؐ کو کتنا قابلِ تعظیم سمجھتے ہیں ۔ یہ رائے صرف ایک ہی نامور مصنّف کی نہیں بلکہ کارلائل (CARLYLE) جیسا انگریز مصنّف بھی آپؐ کو اپنی شہرۂ آفاق کتاب[1] میں سارے برگزیدہ نبیوں میں سے بطور نمونہ چنتا ہے ۔

معصومیّتِ نبی

عام طور پر یہ تسلیم شدہ حقیقت سمجھی جاتی ہے کہ نبی معصوم ہوتا ہے اور کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا ۔ یہ حقیقت صرف مذہبی امور اور مبنی بر وحی افعال تک محدود ہے ۔ رسول اللہ کی فوقیت دوسرے انسانوں پر اسی وجہ سے ہے کہ آپؐ انسان ہی نہیں تھے بلکہ اللہ کے رسول بھی تھے ۔ جن پر وحی نازل ہوتی تھی ۔ مولانا حالی اس خصوصیّت کو اس طرح بیان کرتے ہیں ۔ کہ "بندہ ہوں مَیں اور ایلچی بھی"۔

اس لیے جس فعل کے پیچھے وحی نہ تھی وہ حضورؐ کی اپنی فراست پر مبنی فعل تھا جس میں غلطی ہو سکتی تھی ۔ خواہ یہ فعل سیاست یا کسی اور دنیوی معاملے سے تعلّق رکھتا ہو ۔ مدینہ میں اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد آپؐ کو کچھ ایسے فیصلے کرنے پڑے جو وحی پر مبنی نہ تھے ۔ اس لیے ان میں غلطی کا امکان ہو سکتا تھا اور یہ امکان معصومیّتِ نبی کے مسئلے کے خلاف نہ تھا ۔

جنگ بدر میں حباب بن منذر نے آپؐ سے پوچھا کہ لڑائی کا جو مقام حضورؐ نے مقرر فرمایا ہے وُہ وحی پر مبنی ہے یا نہیں ۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اس مقام کے مقرر کرنے کی وجہ کوئی وحی نہیں ہے۔ حباب نے پھر تجویز پیش کی کہ اس کی رائے میں ایک چشمہ پر قبضہ کر کے کنوؤں کو بیکار کر کے لڑنا بہتر ہوگا اور آپؐ کا اس رائے کو منظور کرنا اور جنگ بدر اور جنگ اُحد شروع ہونے سے پہلے حضورؐ کا صحابہ کے ساتھ مشورہ کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حضورؐ کے ہر فعل کے پیچھے وحی نہ ہوتی تھی اور اپنی آپؐ اپنی فراست اور تدبّر سے کام لیتے تھے ۔

اس مسئلے سے متعلّق حضورؐ کی رائے کہ کھجور کے درخت کی نشوونما آپؐ کے بتائے ہوئے طریقے سے بہتر ہو سکتی ہے اور اس رائے پر عمل کرنے سے کھجور کا کمزور ہو جانا اور اس طرح آپؐ کی رائے کا غلط ثابت ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ دنیوی معاملات میں وحی آپؐ کی ہمیشہ ہدایت نہیں کرتی تھی ۔ حضورؐ کا جواب اس شخص کو جس کو آپؐ نے صلاح دی تھی یہ تھا کہ دنیا کے معاملات آپ خود بہتر سمجھ سکتے ہیں ۔

---

[1] HERO AND HERO WORSHIP

باب ۶

اِسلام کے عقائد و فرائض

اِسلام کیا ہے ؟ اس کی ابتدا کب ہوئی ؟ قرآن کے ساتھ؟ قرآن کی ابتدا کوئی ہے یا یہ ازلی ہے؟ اِسلام کے عناصر، جزئیات اور فرائض کیا ہیں ؟ ان سوالات کے جواب میں اختلاف رائے کیوں ہے ؟ فرقوں کی اتنی کثرت کیوں ہے ؟ اور یہ فرقے ایک دوسرے کی تکفیر کیوں کرتے ہیں ؟

ایک حدیث کے مطابق اسلام میں تہتر فرقے ہوں گے جن میں سے صرف ایک بہشت میں جائے گا۔ جب رسول اللہ سے پوچھا گیا کہ وہ کونسا خوش نصیب فرقہ ہوگا تو ارشاد ہوا۔ کہ وُہ فرقہ جو میرے اور صحابہ کے مذہب کا پیرو ہوگا۔ اہل سنّت ایسا فرقہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ناجیہ فرقے کا نام دیتے ہیں۔ (مشکات و کتاب اوّل و باب ۶ حِصّہ ۳)

جناب شیخ عبدالقادرؒ کے مطابق اسلام میں فرقوں کی تعداد ۱۰۵ سے کم نہیں ۔ رسول اللہ کی وفات کے تھوڑے عرصہ بعد مکّہ کے نزدیک چار مختلف فرقوں کے عَلم لہراتے نظر پڑتے تھے ۔ ایک عَلم عبداللہ بن زبیر اہل مکّہ کا، دوسرا عبدالمالک اہل دمشق کا، تیسرا اہل تشیع کے مہدی کا اور چوتھا نجد ابن امین خارجی کا۔

غیر مسلم دنیا کے سامنے ہم کس فرقہ کے اسلام کو بطور صحیح اسلام پیش کر سکتے ہیں؟ عقیدہ اور عمل میں کیا تعلق ہے اور ان میں سے کس کو ترجیح حاصل ہے ؟ کیا عقیدہ عمل میں یکسانیت پیدا کرتا ہے یا کر سکتا ہے ؟ اگر کسی دوسرے مذہب اور اسلام کی اخلاقی اقدار میں یکسانیت ہو تو کیا اس سے اسلامی عقیدہ کی اہمیّت یا ملے جلے معاشرے پر کوئی اثر پڑتا ہے ؟ کیا قومیّت اور وطنیّت کے تصور اور اسلام کے نظریّہ میں کوئی بنیادی تضاد ہے ؟ اگر ہے تو کیوں ؟ یہ ایسے سوالات ہیں کہ اگر مجھ جیسا محدود علم رکھنے والا شخص ان کا جواب دینے کی کوشش بھی کرے تو اس کتاب کا حجم دس گنا ہو جائے گا اور جو نظریّہ مَیں اس چھوٹی سی کتاب میں پیش کرنا چاہتا ہُوں تو ان جوابوں کی دُھند میں چھُپ جائے گا ۔

اِسلام کیا ہے اور مسلمان کون ہے؟ یہ سوال آج ہی پیدا نہیں ہُوا ۔ نکاح، طلاق، ولدیّت

وغیرہ کے تنازعوں میں کئی دفعہ یہ سوال کہ مسلمان کون ہے عدالتہائے عالیہ کے سامنے قبل از تقسیم برصغیر پیدا ہو چکا ہے۔ جن ججوں نے اس سوال کا جواب دیا ان میں علاوہ پریوی کونسل کے ارکان کے شریعت کے ماہر مسٹر جسٹس محمود جج ہائی کورٹ الٰہ آباد، سر عبدالرشید چیف جسٹس پاکستان اور کئی انگریز جج شامل ہیں۔ فیصلہ متفقہ طور پر یہ دیا گیا ہے۔ کہ مسلم وہ شخص ہے جو "کلمہ طیبہ" لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِؐ پر ایمان رکھنے کا اقرار کرے۔ پریوی کونسل تو یہاں تک گئی ہے۔ کہ عدالت نے یہ نہیں دیکھنا کہ واقعی ایک شخص اس کلمہ پر اعتقاد رکھتا ہے یا نہیں کیونکہ عدالت کے لیے کسی شخص کی اندرونی نیت کا معلوم کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے مسلمان کہلانے کے لیے کلمہ طیبہ پر اعتقاد رکھنے کا اقرار کافی ہے۔

ان فیصلوں میں ختم نبوت پر نہ بحث ہوئی اور نہ فیصلہ دیا گیا۔ مگر اس آیت سے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "میں نے آج آپؐ کے دین کی تکمیل کر دی اور اپنی نعمتوں سے آپؐ کو نواز دیا اور آپؐ کے دین کا نام اسلام منتخب کیا" یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کہ رسول اللہ کی وفات پر وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اس کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ رسول اللہ سے متعلق "خاتم النبیین" کے الفاظ سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

علامہ اقبال کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ اسلام کے مکمل ہونے پر وحی کی ضرورت نہیں رہی۔

اگر مسلمانوں کے لیے کوئی ایسا مسئلہ پیدا ہو جس پر وحی یا سنت حاوی نہیں تو اس مسئلہ کا جواب بذریعہ اجتہاد تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بات عین اسلام کے مطابق ہے۔ بعض علما عقیدہ میں اور بھی جزئیات شامل کرتے ہیں۔ یعنی رسولوں اور ان پر جو کتابیں نازل ہوئیں پر ایمان لانا فرشتوں پر ایمان لانا اور یوم آخرت پر ایمان لانا۔ ڈکشنری آف اسلام کے مطابق اسلام کے اساسی عناصر چار ہیں۔ یعنی قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس۔ اسلامی قوانین، خواہ وہ دنیوی ہوں یا مذہبی رسوم اصول نہیں فروع ہیں۔ آخر الذکر شجر اسلام کی جڑ نہیں۔ شاخیں ہیں۔ (صفحہ ۶۵۶)

مسٹر الطاف گوہر کی نئی کتاب ترجمہ قرآنؐ میں جو مولانا مودودی کی کتاب تفہیم القرآن پر مبنی ہے اسلام کے بنیادی اصول چار بتائے گئے ہیں۔

(۱) اللہ کی وحدانیت (۲) قرآن (۳) رسول اللہ کی آخری نبوت اور (۴) یوم الآخرہ۔ ان کی رائے میں دیگر تمام ادارات اور قوانین ان چار عناصر سے لیے گئے ہیں۔

مفتوحہ ملکوں کے بتوں کو توڑنا بظاہر کوئی بڑی بات نہیں۔ تاوقتیکہ بت شکنی یا بت پرستی کی

ممانعت میں کوئی ایسا راز مضمر نہ ہو جو ملّت کے اتحاد اور نظریہ کو استوار کرتا ہو۔ اسلام نے صرف عرب کو ہی نہیں بلکہ دنیا کے ایک بڑے حصّہ کے ممالک کو ایک ملّت یا قوم میں متحد کیا۔ اس لیے درست طور پر یہ دعوےٰ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی قوت، فتوحات اور تہذیب نئے دین کا نتیجہ تھیں جس کی بنیاد توحید کا تصوّر تھا۔ اس لیے اسلامی عقیدہ میں سب سے زیادہ اہمیت لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پر ایمان لانے کو حاصل ہے۔ کیونکہ اللہ کی ہستی اور صفات سے وحی اور رسالت ایک منطقی نتیجہ ہیں۔

ارکانِ اسلام

ایک نقطہ نگاہ سے اسلام کے پانچ ارکان بیان کیے جا سکتے ہیں۔ پہلا رکن یعنی اللہ پر ایمان لانا اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ کلمہ طیبہ کے دوسرے حصّہ کے مطابق حضرت محمدؐ کو رسُولُ اللّٰہِ ماننا پڑتا ہے اور حضرت کی رسالت پر ایمان لانے سے قرآن پر ایمان لانا لازم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ قرآن ایک پیغام ہے جس کو لا کر حضرت رسول کہلائے۔ باقی چار ارکان یہ ہیں۔

۱۔ صلوٰۃ یعنی نماز

۲۔ صوم یعنی ماہ رمضان میں روزے رکھنا۔

۳۔ زکات یعنی اپنی دولت میں سے ۲½ فیصدی سے ۱۰ فیصدی تک دولت کی قسم کے مطابق راہِ اللہ میں یا حکومت کو دینا۔

۴۔ حج کعبہ۔

یہ ایسے ارکان ہیں جو ہر مسلمان سمجھتا ہے۔ ان میں سوائے پہلے رکن یعنی کلمہ طیبہ پر ایمان لانے کے سارے ارکان عمل سے تعلق رکھتے ہیں۔ صرف پہلا رکن عقیدہ سے متعلق ہے۔

اللّٰہ

زمانۂ حال اور اسلام کے ابتدائی دور میں اللہ کی ہستی اور اس کی صفات کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ موجودہ بحث کی بنیاد سائنس اور فلسفہ ہیں۔ جس کا بعد میں مفصل ذکر آئے گا مگر ایک مسلمان کے لیے بے چوں و چرا اللہ پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہ اَور بات ہے کہ دلائل سے بھی خدا کی ہستی ثابت ہو سکتی ہے۔ قرآن میں اللہ کا بکثرت ذکر آتا ہے۔ فقہا اور علمائے کے نزدیک خداوند تعالیٰ کی صفات ۹۹ سے ۱۰۳ تک قرآن میں بیان کی گئی ہیں۔ ان صفات کو عام طور پر تین

قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے مگر اس تقسیم کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے یہ بات سمجھنا ضروری ہے۔ کہ اللہ کوئی مادی شئے نہیں اور اگرچہ قرآن میں اللہ کے ہاتھ (۳۸/۷۵ - ۵/۶۴ - ۱۱۵/۳) اس کی گرفت (۳۹/۶۷) اس کی آنکھوں (۵۴/۱۴) اس کے چہرے (۲/۱۱۵) اور تخت پر بیٹھنے (۲۰/۵) کا ذکر آتا ہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ انسان کی طرح ایک مادی چیز ہے۔ آیات جن کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے صرف استعارہ کی حیثیت رکھتی ہیں نہ کہ تشبیہ کی۔ ان آیات سے اللہ کی انسان کے ساتھ مماثلت ثابت نہیں ہوتی۔ البتہ اللہ کی صفات کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ اللہ کا کوئی مادی جسم نہیں۔ اگر اس کا کوئی جسم ہوتا تو اس کے لیے کسی خالق کی ضرورت ہوتی۔ مگر اللہ تو سب چیزوں کا پیدا کرنے والا خود ہے۔ اس کو کسی نے پیدا نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اگرچہ حضرت موسےٰؑ طور پر اور رسول اللہؐ نے دوران معراج اللہ کا قرب حاصل کیا۔ نہ ہی حضرت موسےٰؑ نے اور نہ ہی رسول اللہ نے اللہ کی شکل کی کوئی تفصیل دی ہے۔ اسی طرح جہاں اللہ سے انسانی جذبات مثلاً رحم، غصہ، صبر وغیرہ منسوب کیے گئے ہیں وہ دراصل انسانی جذبات نہیں۔ یہ الفاظ بھی صرف انسان کو سمجھانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

اللہ کی صفات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ وہ صفات جو صرف اللہ سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً: الاوّل، الآخر، الظاہر، الباطن، القیوم، الواحد، الحیّ وغیرہ۔ اللہ زمین و آسمان کا نور ہے۔

۲۔ وہ صفات جو تخلیق کے متعلق ہیں مثلاً: الخالق، المحی، الحافظ، الجبار، مالک الملک، الوالی، الوارث، المقتدر وغیرہ۔ سوائے اللہ کے کوئی قوت یا طاقت نہیں۔

۳۔ وہ صفات جن کا تعلق مخلوق کے ساتھ ہے مثلاً: ربّ العالمین، الرّحمٰن الرّحیم، الغفار، العلیم، الرّؤف وغیرہ۔

قرآن

چونکہ حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اللہ کے رسول تھے اس لیے مخلوق کے لیے آپؐ کو ایک پیغام دیا گیا اور یہ پیغام قرآن ہے جو وحی کے ذریعہ نازل ہوا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ اسلام کی ابتدا قرآن اور رسول اللہ سے ہوئی۔ اسلام کے ابتدائی دور میں اس مسئلہ پر گرماگرم بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ کہ کیا قرآن پیدا کیا گیا یا یہ ازلی ہے۔ مگر اب علما متفق ہیں کہ قرآن لوح محفوظ پر کندہ تھا اور وہیں سے اللہ نے اسے رسول اللہ کے ذریعے لوگوں تک پہنچایا۔ قرآن کی آیات کو بہت لوگوں نے آنحضرتؐ کی زندگی میں ہی حفظ کر لیا تھا اور کچھ آیات معرض تحریر میں بھی آ چکی تھیں۔ قرآن کی موجودہ ترتیب

حضرت عثمانؓ نے کی۔ حضرت علیؓ نے آیات کو ان کی تاریخ نزول کے مطابق جمع کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی کیونکہ قرآن کا کوئی مجموعہ تاریخ وار موجود نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی بکھری ہوئی آیات کو یکجا کرنا شروع کیا تھا۔ مگر وہ مجموعہ بھی ناپید ہے۔ قرآن ۲۳ سال کی وحیوں کے نزول کا نتیجہ ہے۔ سب سے پہلی وحی غار حرا میں نازل ہوئی۔ مکہ کی آیات مقابلتاً چھوٹی اور سادہ ہیں اور فلسفیانہ لحاظ سے اعلیٰ درجہ رکھتی ہیں۔ صرف چند آیات جو جنگِ اُحد کے بعد نازل ہوئیں ان پر سبقت رکھتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مدینہ کی بہت سی آیات دنیوی احکام سے متعلق ہیں۔ ہجرت کے بعد مدینہ اسلام کا دار الخلافہ بن گیا تھا اور بہت عرصہ تک مہاجرین و انصار کفار کے ساتھ جنگوں میں مصروف رہے۔ ان جنگوں کا ایک یہ نتیجہ تھا کہ بہت سا مالِ غنیمت اور قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ اس لیے کئی مسائل ایسے پیدا ہو گئے جن کے متعلق ہدایت کی ضرورت تھی مثلاً قیدیوں اور غلاموں کا کیا درجہ ہو اور ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ مالِ غنیمت کس طرح تقسیم کیا جائے۔ معاہدوں اور صلح ناموں کی، جو کفار اور یہودیوں کے ساتھ کیے گئے تھے، کن حالات میں پابندی لازم ہے؟ مذہبی رواداری، عائلی تعلقات مثلاً نکاح، طلاق، ولدیت، ہبہ، وصیت اور ورثہ وغیرہ کے لیے بھی قواعد و ضوابط کی ضرورت تھی کیونکہ بغیر ایسے قانون کے معاشرے میں یکسانیت پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے مدینہ کی آیات میں دنیوی امور اور قانون کی زیادہ جھلک ہے۔ قرآن یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ اس میں تمام موجودہ علوم مثلاً فلکیات، کیمیا، طبیعیات، ریاضی، سائنس یا جملہ قوانین وغیرہ شامل ہیں۔ قرآن کا منشا تو یہ تھا اور ہے کہ نئی ملت کے افراد کے طرزِ عمل کے لیے ہدایات دی جائیں۔ اسی واسطے قرآن کو متقی لوگوں کے لیے ہدایت کی کتاب کہا گیا ہے۔ قرآن سچے اور سیدھے راستے کی نشاندہی کرتا ہے اور خلق کو اس راستے پر چلنے کا اختیار دیتا ہے مگر کسی شخص کو یہ راستہ پکڑنے پر مجبور نہیں کرتا۔ اگرچہ اس راستے پر چلنے یا نہ چلنے کے نتیجے سے اس کو آگاہ کرتا ہے۔ اسلام کیونکہ خدا کی وحدانیت پر زور دیتا ہے۔ اس لیے اس میں اللہ کی وحدانیت، اس کی طاقت اور اس کے اوصاف، مومنین کی برابری اور برادری وغیرہ کا فصاحت اور وضاحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن میں دو قسم کی آیات ہیں۔ ایک وہ جو صریح المعنی ہیں۔ یہ آیات قرآن کا جوہر ہیں اور ان کو محکمات کہا جاتا ہے۔ دوسری قسم کی آیات استعارات یا متشابہات ہیں۔ ان آیات کی مختلف تعبیریں کی جا سکتی ہیں اور یہ مختلف تعبیریں تفرقہ پیدا کر سکتی ہیں۔ ان کی حیثیت بمقابلہ پہلی قسم کی آیات کے ثانوی ہے (۳/۷) مگر بعض مفسر ان دونوں قسم کی آیات کو ایک ہی درجہ دیتے ہیں۔

زبور، توریت اور انجیل کی طرح قرآن ایک الہامی کتاب ہے۔ جس طریقے سے رسول اللہؐ کو الہام ہوتا تھا یا ان پر وحی نازل ہوتی تھی اس کا تذکرہ علما اور فقہا کی تصانیف میں مقابلتاً کم ملتا ہے۔

قرآن خود کہتا ہے کہ اللہ کسی فانی انسان کے ساتھ یا تو بذریعہ وحی بات کرتا ہے یا وہ کسی مخفی طریقہ سے یا کوئی رسول بھیج کر جو اللہ کی اجازت سے جو اللہ چاہے بیان کرتا ہے۔ وحی کی نوعیت سمجھنے کے لیے علوم مافوق الفطرت سے واقفیت ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں خواب، اوبا اور فرشتوں کا ذکر آتا ہے۔ بخاری، ترمذی، احمد بن حنبل، مسلم اور طبری اپنے مکتوبات میں رسول اللہ کی اس حالت کا ذکر کرتے ہیں جو آپؐ پر نزول وحی کے وقت طاری ہوتی تھی۔ مختصراً یہ حالتیں اس طرح بیان کی گئی ہیں:۔

"وحی کبھی گھنٹی بجنے کی صورت میں، جس سے سخت تکلیف ہوتی تھی، آتی تھی۔ بعض اوقات فرشتہ ظاہر ہو کر حضورؐ سے مخاطب ہوتا تھا۔ کبھی رسول اللہ اپنے چہرے کے گرد شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سنتے تھے۔ رسول اللہ کی پیشانی پر پسینہ نمودار ہو جاتا تھا خواہ دن کتنا ہی سرد ہو حضور اپنا سر ڈھانپ لیتے تھے۔ آپؐ کی پیشانی سرخ ہو جاتی تھی آپؐ خراٹے بھرنے لگتے تھے۔ کبھی آپؐ کے منہ سے ایسی آواز نکلتی تھی جیسی اونٹ کے بچّے کے منہ سے۔ کبھی رسول اللہ معانقہ میں چلے جاتے تھے۔ آپؐ سخت درد محسوس کرتے تھے۔ صحابہ سے اپنے آپ کو علیحدہ کر لیتے تھے اور اپنے سر کو کپڑے سے ڈھانپ لیتے تھے۔"

وحی کسی وقت بھی نازل ہو سکتی تھی۔ مثلاً جب آپ کسی سوال کا حل چاہتے تھے۔ یا آپؐ سر دھو رہے ہوتے تھے یا جب آپؐ کھانا کھا رہے ہوتے تھے یا جب آپؐ اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔

وحی کی حقیقت

جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کو خدا کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔ تو ایسے دعویٰ کی صداقت یا کذب کو پرکھنے کے لیے تین امکانات کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔

اوّل امکان یہ ہے کہ مدعی سراسر جھوٹا اور دغاباز ہو۔ رسول اللہ نے خود فرمایا ہے کہ اس سے بری اور شرانگیز اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ کوئی شخص یہ کہے کہ اسے وحی ہوتی ہے جبکہ دراصل اس کو وحی نہ ہوتی ہو۔

دوسرا امکان یہ ہے کہ وہ شخص دانستہ جھوٹ نہ بولتا ہو۔ مگر اس پر کوئی ایسی حالت طاری ہو جو اس کے دماغ کو وجد یا دیوانگی کی طرف لے جاتی ہو۔

تیسری صورت یہ ہے۔ کہ جو کچھ وہ کہتا ہے سچ ہو۔

اگر رسول اللہ کی زندگی، اعمال و اقوال کی روشنی میں ان تینوں امکانات کا جائزہ لیا جائے تو اس کے سوا کہ جو کچھ وہ فرماتے تھے سچ تھا اور کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک شخص کو جو چالیس سال کی عمر سے گذر چکا ہو اور اس وقت تک اس کی زندگی بے لاگ رہی ہے اور اس کو کوئی طمع، لالچ یا خود غرضی نہ ہو، جھٹلانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی گذشتہ زندگی میں کسی دھوکے، دغا یا دروغ گوئی کی کوئی مثال ملتی ہو۔ رسول اللہ کی زندگی میں آپؐ کے دشمن بھی کوئی ایسا عیب نہیں بتا سکتے۔ اس بات پر سب کو اتفاق ہے اور آپؐ کے دشمن یا نکتہ چیں بھی اس سے منکر نہیں کہ آپؐ میں کوئی اس قسم کی برائی نہیں تھی۔ اس کے برعکس آپؐ کا کردار اتنا صاف اور بے داغ تھا کہ لوگ آپؐ کو شباب میں ہی امین کے لقب سے پکارتے تھے اور اس دیانتداری کی وجہ سے متفقہ طور پر آپؐ کو خانہ کعبہ کی دیوار میں سنگِ اسود نصب کرنے کے لیے چُنا گیا تھا۔ آپؐ کی نیک نامی کی اس شہرت پر ہی سیدہ خدیجہؓ نے آپؐ کو اپنی تجارت کا منتظم مقرر کیا۔ اور جب تک آپؐ اس حیثیت سے کام کرتے رہے آپؐ پر کسی کو بے ایمانی یا بددیانتی کا شائبہ تک نہ ہوا۔ انسان بددیانتی یا کسی جھوٹ اور دغا کا مرتکب ہوتا ہے تو اپنے کسی مفاد کے لیے۔ مگر آپؐ کو جو نفع ملا وہ گالی گلوچ، تذلیل، تضحیک، اذیت اور سماجی مقاطعہ۔ دیوانہ سمجھ کر آپؐ پر طائف کے لونڈوں نے پتھر برسائے۔ آپؐ کے اور آپؐ کے ساتھیوں کے ساتھ مکہ والوں نے ایسا وحشیانہ سلوک کیا کہ بہت سے ذی عزت مسلمان مردوں اور عورتوں کو حبشہ ہجرت کرنی پڑی۔ پھر کفار نے آپؐ کو قتل کرنے کی سازش کی مگر اللہ نے آپؐ کو بچا لیا۔ آپؐ کو روپیہ، سرداری اور عورتوں کا لالچ دیا گیا جو بالکل غیر مؤثر ثابت ہوا۔

آپؐ کی وفات پر آپؐ کی ساری شخصی جائداد چند سکے، ایک خچر اور ایک تلوار تھی۔ زندگی میں آپؐ کے نصیب صرف غربت، بھوک، پھٹے پرانے کپڑے اور اپنی جوتیوں کی مرمت تھی۔ ان واقعات کو مدنظر رکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ آپؐ کے دعوئ نبوت میں، جو خطرات سے خالی نہیں تھا، کوئی نفسانی غرض پنہاں تھی یا آپؐ کا مدعا جلبِ منفعت تھا۔ ان سب تکلیفوں کو آپؐ کی صدق دلی ہی برداشت کر سکتی تھی۔ دھوکہ اور جھوٹ کب تک چل سکتا ہے۔ ایک دفعہ، دو دفعہ، کئی دفعہ نہ کہ ساری عمر۔ کیا اسی کروڑ لوگ جو دنیا کے ہر گوشہ میں موجود ہیں جن میں سے کم از کم نصف خداوند تعالیٰ کو پانچ وقت سجدہ کرتے ہیں اور قرآن پڑھتے ہیں کسی معمولی انسان کے دھوکے میں آئے ہوئے ہیں؟ کیا ماضی کے ایسے فلاسفر اور دانشور جنہوں نے دنیا میں نام پیدا کیا اور لکھوکھا ایسے لوگ جو سچائی کے لیے اپنی جانیں نذر کر چکے ہیں سب ایک جھوٹے، عیار اور دھوکہ باز آدمی کے لیے صدیوں پیرو رہنے میں فخر محسوس کرتے رہے ہیں؟۔

دیوانگی اور مجذوبیت کا الزام صرف وہی لوگ دے سکتے ہیں جو خود اپنی عقل اور دانائی کھو

بیٹھے ہوں ۔ یا عقل و دانش کا ملکہ ان کو کبھی ودیعت ہی نہ ہوا ہو ۔ کیا کسی دیوانے کبھی ایسے معاشرے، طرزِ زندگی اور تہذیب و شائستگی کی بنیاد ڈالی جس نے دنیا کی کایا پلٹ دی ہو ۔ طاقتور سے طاقتور سلطنتوں کو تہ و بالا کر دیا ہو ۔ تختِ کسریٰ کو کھنڈر بنا چھوڑا ہو اور رستم جیسے جرنیل کو مع اس کے تخت و مسند خاک میں روند ڈالا ہو ۔ جس نے قرآن جیسی کتاب پیچھے چھوڑی ہو جس کو سر دھنکر لوگ پڑھتے ہیں اور جس کی چند آیات کی تلاوت سے عمر جیسا متعصب بت پرست ایسا متاثر ہوا ہو کہ یہ سمجھ کر کہ یہ کلام انسان کا نہیں ہو سکتا ۔ فوراً اسلام پر ایمان لے آیا ہو ۔ ان واقعات اور کوائف کو پوری اہمیت دینے کے بعد اور کوئی نتیجہ نکالنا ناممکن ہے سوائے اس کے کہ آپؐ نبی تھے ۔ رسول تھے ۔ جن کو اللہ نے دنیا کی حالت سدھارنے کے لیے مبعوث کیا تھا اور جن کو اپنے کلام کا شرف بخشا جس کلام کا نام وحی ہے ۔

سُنّت اور حدیث

قرآن کے بعد سُنّت اور حدیث کی تشریح دینِ اسلام کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کیونکہ ابتدائے اسلام سے قرآن اور سنّت اسلامی تخیل اور عمل کی بنیاد تصوّر کیے جا رہے ہیں ۔

سنّت رسول اللہ کے فعل و قول اور کسی دوسرے شخص کے قول و فعل پر رسول اللہ کے اظہارِ پسندیدگی کو کہتے ہیں ۔ سنّت کے مجموعات کو جو محدّثین نے مرتب کیے حدیث کہا جاتا ہے ۔ کثرت استعمال سے سنّہ اور حدیث مترادف خیال کیے جانے لگے ہیں ۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مجموعاتِ حدیث رسول اللہ کی وفات کے دو تین سو سال بعد مرتب ہوئے ۔ رسول اللہ کے ہر فعل و قول کو اتنی اہمیت حاصل تھی کہ صحابہ اور دوسرے لوگ ان کو ذہن میں محفوظ رکھتے تھے اور اس کے مطابق عمل کرتے تھے ۔ دنیا میں کوئی شخصیت ایسی نہیں گزری جس کی زندگی کی اتنی چھان بین ہوئی ہو جتنی رسول اللہ کی زندگی کی اور جس کے قول و فعل پر اتنی توجہ دی گئی ہو اور اتنی کتابیں لکھی گئی ہوں جتنی رسول اللہ کی تیئس (۲۳) سالہ نبوت پر ۔ اس لیے رسول اللہ کے اقوال اور افعال آپ کی زندگی ہی میں شریعت کا ایک جزو بن چکے تھے ۔ اس طرح سنّہ پر صحابہ کرام اور تابعین کی زندگی میں عمل ہو کر یہ ملّت کے عقائد اور عمل کا جزو بن چکی تھیں ۔ حدیثوں کا یاد رکھنا کچھ مشکل بات نہیں تھی ۔ عام طور پر یہ مختصر اقوال ہیں جو آسانی سے ذہن نشین ہو جاتے تھے ۔ محدّثین نے مجموعات رسول اللہ کی وفات کے اڑھائی تین سو سال بعد مرتب کیے وُہ زیادہ تر اپنے زمانے کے مروجہ عمل پر مبنی تھے جس کی بنیاد خود احادیث تھیں ۔ اس لیے احادیث کے مجموعات کو صرف اس بنا پر مسترد کرنا یا ناقابلِ اعتماد ٹھہرانا کہ وہ رسول اللہ کی وفات کے بہت عرصہ بعد لکھی گئیں درست نہیں ۔

صحیح مسلم کے مطابق آنحضرتؐ نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ میری احادیث نہ لکھو۔ جس نے قرآن کے علاوہ کچھ لکھا ہے ۔ اس کو مٹا دیا جائے ۔ اسی طرح کی روائتیں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے منسوب ہیں ۔ اس ممانعت کی وجہ یہ بیان کی گئی تھی کہ احادیث پر زیادہ توجہ مبذول کرنے سے قرآن کی اہمیت پر اثر پڑتا ہے ۔ اس ممانعت کی خاص وجوہات تھیں اور جب وہ رفع ہو گئیں تو احادیث کی کتابت کی اجازت مل گئی ۔ حضورؐ نے خود عبداللہ بن عمرو کو احادیث لکھنے کی اجازت دی۔ حضرت عائشہؓ کے قول کے مطابق حضرت ابوبکرؓ نے پانچ سو احادیث قلمبند کیں ۔ اس طرح رسول مقبول کے زمانے میں ہی احادیث کی کتابت شروع ہو گئی تھی ۔ مگر یہ بات نظر انداز نہیں ہونی چاہیئے کہ منافقوں کا ایک طبقہ تھا جو اسلام کی خالصیت کو گندا کرنا چاہتا تھا اور اس غرض سے فرضی احادیث گھڑ لیتا تھا ۔ خلافت راشدہ کے بعد مختلف فرقوں مثلاً شیعہ، سُنّی، خارجی اور برسر اقتدار خلفاء کی بھی یہ خواہش تھی کہ ان فرقوں کی تائید میں اور حکمرانوں کا اقتدار قائم رکھنے کے لیے فرضی احادیث رواج پا جائیں۔ اس لیے سُنّہ کے ثبوت میں احادیث کے صحیح ہونے کا قابلِ اعتبار معیار یہی ہو سکتا ہے کہ کیا کوئی عمل یا فعل رسول اللہ سے شروع ہو کر محدّثین کے زمانے تک صحیح سمجھا گیا اور اس کے مطابق عمل ہوتا رہا ۔ دوسرا معیار کسی حدیث کے پرکھنے کے لیے یہ تھا ۔ کہ کیا متنازع حدیث قرآن کی کسی صریح نص سے تو متصادم نہیں ۔ اگرچہ چند علماء کا یہ خیال بھی ہے کہ حدیث بعض اوقات قرآن پر ترجیح حاصل کر جاتی ہے۔ ویسے تو احادیث کی اٹھارہ کتابیں ہیں مگر محدّثین میں سے چھ کو خاص شہرت حاصل ہے ۔ ذیل میں ان کے نام اور سالِ وفات درج ہیں ۔

نام	سالِ وفات
البخاری	۸۷۰ ء
مسلم	۸۷۵ ؍؍
ابوداؤد	۸۸۸ ؍؍
ترمذی	۸۹۲ ؍؍
النسعی	۹۱۵ ؍؍
ابن ماجہ	۸۸۶ ؍؍

ان محدّثین کے سالِ وفات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب تقریباً ہمعصر تھے اور ان کے مجموعات تیسری صدی ہجری میں مرتب ہوئے ۔ یہ مجموعات محنت شاقہ اور دماغ سوزی کا نتیجہ ہیں اور ان کی صحت کے متعلق محدّثین کوئی شک نہیں رکھتے تھے ۔ اس وجہ سے ان کو صحاح ستہ کا نام دیا جاتا ہے ۔

اہل تشیع مجتہدین کے مجموعات بہت بعد میں تیار کیے گئے ۔ ان کے نزدیک حدیث کے صحیح اور

قابل قبول ہونے کا معیار بھی مختلف ہے ۔ یہ مجموعات دسویں اور گیارہویں صدی میں مرتب ہوئے اور ان احادیث پر مبنی ہیں جو حضرت علیؓ یا شیعہ اماموں سے منسوب ہیں ۔ مشہور مجموعات کے نام ذیل میں درج ہیں ۔

نام	سال وفات محدث
۱۔ الکافی مرتبہ محمد بن یعقوب	۹۳۹ء
۲۔ تہذیب الاحکام	
۳۔ الاستبصار مرتبہ محمد الطوسی	۱۰۶۷ء
۴۔ نہج البلاغہ ۔ صرف حضرت علیؓ کے اقوال کا مجموعہ ہے جس کو علی بن طاہر الشریف المرتضٰی نے مرتب کیا ۔ علی بن طاہر کا سال وفات ۱۰۴۴ء ہے ۔	

سنہ اور حدیث کے مندرجہ بالا تذکرہ سے یہ بات قاری پر ظاہر ہو چکی ہوگی کہ سنہ کی تمام تر شہادت احادیث میں پائی جاتی ہے اور چونکہ سنہ پر رسول کریم کی زندگی ہی میں نہیں بلکہ صحابہ کی زندگی میں بھی عمل ہوتا تھا ۔ اس لیے تائیدی عمل سنہ اور حدیث کی صحت کا ضامن تھا ۔ اس طرح پر سنہ ایک ایسا قانون بن گیا تھا جیسا کہ انگلستان میں "کامن لا" (COMMON LAW) جو دیرینہ رسم و رواج اور ججوں کے فیصلوں پر مبنی تھا ۔ اگر کسی عمل کا تواتر رسول کریمؐ یا صحابہ کی زندگی سے شروع ہو کر محدثین تک پہنچتا تھا تو اس سنہ یا حدیث کی صحت میں کوئی شک نہیں ہو سکتا تھا جو اس عمل کی بنیاد تھی ۔ عمل محدثین کے سامنے تھا جو سنہ اور حدیث متعلقہ کی صحت کا ثبوت تھا ۔ مگر مجموعات میں جو ایسی حدیثیں ہیں جن کو کسی وجہ سے عمل کی تائید حاصل نہ تھی اور اس کی کئی وجوہات ہو سکتی تھیں تو ایسی احادیث کی نوعیت مختلف ہے ۔ محدثین سابقہ شہادت پر فیصلہ کرتے تھے اور انسان چونکہ سہو و خطا کا پُتلا ہے ۔ اِس لیے محدثین سے غلطی ہو جانا ناممکن نہیں تھا اور ایسی حدیث کو غلط یا صحیح قرار دینے کا بعد کی نسلوں کو ایسا ہی حق ہے جیسا کہ محدثین کو تھا ۔ اگرچہ رسول اللہ کی وفات کے اڑھائی سو تین سو سال گزرنے کے بعد اب یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے ۔ کہ کسی حدیث کو صحیح قرار دینے میں محدثین نے غلطی کی ۔ تاہم اگر کسی سابقہ واقعہ کو مورخین تاریخ کے عام اصول کے اطلاق سے غلط قرار دے سکتے ہیں ۔ تو کوئی وجہ نہیں ۔ کہ موجودہ نسل کے علما اور حکما کسی غیر تائیدی حدیث کے متعلق اپنی رائے کا اظہار نہ کر سکیں ۔

کچھ دانشور احادیث کو وہ درجہ یا منزلت نہیں دیتے جو اُوپر بیان کی گئی ہے ۔ مثلاً ڈاکٹر طہسانی کا خیال ہے ۔ کہ کیونکہ احادیث کی ترتیب اس طرح پر نہیں ہوئی جیسے قرآن کی اس لیے ان میں غلطی کا کافی امکان ہے احادیث کو خلفائے عباسیہ کے عہد میں ترتیب دیا گیا اور اس وجہ سے مجموعات میں بہت سی غیر مستند

احادیث شامل ہوگئیں۔

کسی حدیث کی صحت دریافت کرنے کے دو اور طریقے بھی ہو سکتے ہیں۔ احادیث قدسی جن کی بنیاد وحی ہے۔ قرآن کا درجہ رکھتی ہیں۔ کیونکہ وہ رسول اکرم کو بذریعہ وحی حاصل ہوئیں۔ اور ان کی صداقت میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جس حدیث پر محدثین اور آئمہ اربعہ متفق ہوں وہ بلاحیل وحجت قبول کی جاسکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ قرآن کے کسی نص سے متصادم نہ ہوں۔ اگرچہ ایک مکتب خیال کے فقہا کا خیال ہے۔ کہ حدیث بھی قرآن پر سبقت رکھ سکتی ہے۔ حدیث کے اطلاق کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ مسئلہ متنازع پر پوری طرح حاوی ہو۔

اجتہاد اور اجماع

اجتہاد اور اجماع دو منسلک مسئلے ہیں۔ کسی مسئلہ پر مجتہدین کے متفق ہونے کو اجماع کہتے ہیں۔ اجماع کا درجہ اس حدیث پر مبنی ہے۔ جو ابنِ ماجہ نے بیان کی ہے۔ اس حدیث کے مطابق رسول اللہ کا ارشاد ہے۔ کہ میری اُمت کسی غلط بات پر متفق نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اگر مجتہدین متفق ہیں۔ تو وہ غلط نہیں ہو سکتے۔ اس طرح اجماع کے ذریعہ حل کیے ہوئے مسئلے شریعت کا جزو بن چکے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ اجتہاد کا حق صرف مجتہدین یعنی ان اشخاص کو پہنچتا ہے۔ جن کو قرآن اور حدیث پر عبور ہے۔ عوام اجتہاد نہیں کر سکتے۔ اجماع اور اجتہاد میں فرق یہ ہے۔ کہ جہاں اجتہاد ایک فرد یعنی جو اس کے قابل ہو کر سکتا ہے۔ اجماع کے لیے اتفاقِ مجتہدین ضروری ہے۔ اجتہاد کے معنی کسی مسئلہ کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کرنا ہے۔ مگر اس کے لیے یہ شرط ضروری ہے۔ کہ جو شخص اجتہاد کرتا ہے وہ اس کے قابل یعنی صاحب علم ہو۔ اور جو قرآن اور سنّہ سے بخوبی واقف ہو۔ اجتہاد کا یہ مفہوم کچھ عرصہ بعد اجتہاد مطلق میں تبدیل ہوگیا۔ جس سے یہ مطلب لیا گیا کہ اجتہاد کا حق صرف آئمہ اربعہ یعنی امام بخاری، مالک، شافعی اور ابن حنبل کو ہی تھا۔ مگر وقتاً فوقتاً ایسے مفکر بھی پیدا ہوئے جو اپنے آپ کو اجتہاد مطلق کا پابند نہیں سمجھتے تھے۔ اور خود اجتہاد کرنے کے حق کا دعوےٰ کرتے تھے۔ ان میں سے ایک تو ابنِ تیمیہ (سال وفات ۷۲۸ء) تھے۔ ان کے دوسرے ہم خیال سیوطی (سال وفات ۹۱۱ء) تھے۔ جو ہر صدی میں کسی مجتہد کا ہونا اتنا ہی ضروری سمجھتے تھے جتنا کہ ہر صدی میں کسی مجدد کا ظہور۔ اہل تشیع اجتہاد مطلق کے پابند نہیں اور ان میں اپنے مجتہدین متواتر چلے آئے ہیں۔ جن کو مخفی امام کا نائب سمجھا جاتا ہے۔

صوفی بھی اس اجتہادِ مطلق سے بے نیاز ہیں۔

اسلام میں قانون دستور اور دیگر قوانین میں کوئی فرق نہیں۔ ہر دو کا ماخذ قرآن اور سنہ ہیں۔
سید امیر علی اپنی کتاب (HISTORY OF THE SARACENS) میں لکھتے ہیں۔

"عرب مسلمانوں کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے۔ کہ اگرچہ ہر قوم اپنے معاشرے کی تجدید اپنے ذہن (نظریہ) کے مطابق کرتی ہے: تاہم جو قوم اپنے آپ کو ماضی کے مردہ کمبل میں لپیٹے رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ سوائے خودکشی کے کچھ اور نہیں ہوتا" علامہ اقبال بھی اپنے مشہور چھ لیکچروں میں اس سے ملتا جلتا خیال ظاہر کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

"ایک معاشرے (اسلامی) کے لیے جس کی بنیاد حقیقت کے ایسے تصور پر مبنی ہو۔ ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں دو اصولوں میں مطابقت پیدا کر کے ان پر عمل پیرا ہو۔ کچھ اصول تو دوامی ہوں اور کچھ تبدیلی کے متقضی۔ اپنی اجتماعی زندگی کے انضباط کے لیے اُسے کچھ دوامی اصول اپنانے چاہئیں کیونکہ یہ اصول ہر ایک لمحہ بدلتی ہوئی دنیا میں پاؤں ٹیکنے کے لیے جگہ مہیا کرتے ہیں۔ مگر ان دوامی اصولوں سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ ان میں کبھی کوئی تبدیلی ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ تبدیلی تو خدا کی نشانیوں میں ایک بڑی نشانی ہے اور ایسے اصولوں کو ناقابل تبدیل سمجھنا ایک ایسی چیز کو جو اپنی نوعیت سے ہی حرکیاتی ہے۔ منجمد کرنے کے مترادف ہوگا۔ پہلے اصول کی وضاحت یورپ میں سیاسی اور سماجی سائنسوں کی ناکامی سے ہوتی ہے۔ اور دوسرے اصول کی تصدیق اسلام میں گذشتہ پانچ سو سال کے جمود سے ہوتی ہے۔ تو پھر اسلام میں حرکیاتی اصول کیا ہے۔ اس اصول کا نام اجتہاد ہے۔"

آئمہ واربعہ، جن کے اجتہاد کو اجتہادِ مطلق کا درجہ دیا جاتا ہے، کے نام اور تواریخ وفات ذیل میں درج ہیں۔

نام	تاریخ وفات
۱۔ امام ابوحنیفہ النعمانی	۱۵۰ ہجری
۲۔ امام ابوعبداللہ مالک بن انس	۱۷۹ ہجری
۳۔ امام محمد ابن ادریس الشافعی	۲۰۴ ہجری
۴۔ امام ابوعبداللہ احمد بن حنبل	۲۴۱ ہجری

خلافت راشدہ کے دوران خلیفۃ الوقت صحابہ کرام سے متنازع مسائل میں مشورہ لیتے تھے خلافت راشدہ کے بعد آئمہ اربعہ نے خاندان امیہ کے ۱۳۲ ہجری میں ختم ہونے کے بعد قانون کی تشریح کی۔ ان آئمہ میں سب سے مشہور نام امام ابوحنیفہ کا ہے۔ جو کوفہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے نہ تو قانون کو بطورِ پیشہ اختیار کیا اور نہ وہ حکومت کے کسی عہدہ پر فائض ہوئے جس کا قانون سے تعلق ہو۔ قانون کی تشریح

ہیں وہ قرآن کو بنیاد رکھتے تھے اور احادیث پر کم انحصار کرتے تھے۔ انہوں نے بہت ہی کم احادیث پر انحصار کیا۔ البتہ قیاس اور رائے کو وہ ضرور اہمیت دیتے تھے۔ قرآن کی کسی آیت کی تشریح کرتے ہوئے بعض اوقات آپ قیاس کو قرآن پر بھی ترجیح دے جاتے تھے۔ یعنی بنیاد تو آیت ہی رہتی تھی۔ مگر اس آیت کا اصول دریافت کرنے میں آپ کچھ آزادی سے کام لے کر بذریعہ قیاس ایسا نتیجہ نکالتے تھے۔ کہ اکثر اوقات وہ آیت کے الفاظ کے معنوں سے ظاہرہ طور پر مختلف ہوتا تھا تشریح کرتے ہوئے آپ قدیم رسم ورواج کو بھی مدنظر رکھتے تھے۔ اور استصلاح سے کام لے کر متن کی ایسی تعبیر کرتے تھے جو ملت کے مفاد میں ہو۔ قانون کی مفصل تشریح کسی مقدمہ کے فیصلہ کرنے میں ہوتی ہے۔ مگر کیونکہ مقدمات کے فیصلہ کرنے کا فرض امام ابو حنیفہ کے سپرد نہیں تھا۔ آپ کی رائے اور قیاس ایک قسم کی خلا میں تشکیل پاتے تھے۔ امام موصوف نے اپنے پیچھے کوئی تصنیف یا تحریر نہیں چھوڑی مگر آپ کے شاگرد امام یوسف نے، جو خلیفہ ہارون الرشید کے وقت میں قاضی کے عہدے پر متمکن تھے اور امام محمد نے امام ابو حنیفہ کی پیروی کرتے ہوئے، مگر چند مسئلوں میں ان سے اختلاف رکھتے ہوئے، مجموعاتِ قانون تیار کیے۔

امام مالک ابن انس نے، اپنا مکتب فکر قائم کیا۔ ان کا ایک مجموعہ موطا اب تک موجود ہے جس میں ۱۷۰۰ احادیث مضمون وار جمع کی گئی ہیں۔ ان کے خیال میں مدینہ احادیث کا گھر تھا۔ اور کیونکہ وہاں اجماع کی بھی نظائر موجود تھیں۔ انہوں نے مدینہ کے اجماع کو قرآن اور حدیث کے بعد اپنی دلیل کی بنیاد بنایا اور اس طریقہ کو قیاس پر ترجیح دی۔ آپ امام ابو حنیفہ کیا تھہ مباحثوں میں شریک ہوتے تھے۔

امام شافعی رسول اللہ کے خاندان سے تھے اور قانون کے بڑے ماہر شمار ہوتے ہیں۔ وہ تیسرے مکتب خیال کے بانی بنے۔ وہ حدیث کو بہت اہمیت دیتے تھے اور ثابت شدہ احادیث کو وحی کا درجہ دیتے تھے یہاں تک کہ اگر کوئی حدیث قرآن کی کسی آیت کے نزول کے بعد کی ہو تو وہ اصول ناسخ ومنسوخ استعمال کرکے قرآنی آیت کو بھی منسوخ قرار دے جاتے تھے اور حدیث پر عمل کرتے تھے۔ جب وہ اپنی رائے قائم کر لیتے تھے اور متنازع مسئلہ پر کوئی حدیث نہیں ملتی تھی تو وہ فرض کر لیتے تھے۔ کہ متنازع مسئلہ پر ضرور کوئی حدیث ہو گی جو لاپتہ ہو گئی ہے۔ وہ اجماع کو بھی عمل رسول پر ترجیح دیتے تھے۔ اور ہمیشہ قرآن کی آیات اور حدیث کے اصول کو دریافت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور جو اصول وہ کسی آیت یا حدیث سے اخذ کرتے تھے اس پر اپنی رائے قائم کرتے تھے۔ آپ امام احمد بن حنبل کے شاگرد تھے۔ آپ کی سب سے پہلی تصنیف 'الاصول' ہے دیگر تصانیف میں سنان اور مسند شامل ہیں۔ آپ کی ایک کتاب علم دین پر چودہ جلدوں پر مشتمل ہے۔

بخاری اور مسلم آپ کے شاگرد تھے۔

چوتھے امام احمد بن حنبل اپنی مُسند کی وجہ سے مشہور ہیں۔ اس مجموعہ میں تیس ہزار احادیث کا حوالہ دیا گیا ہے اگرچہ ان کو مضمون وار ترتیب نہیں دیا گیا۔ ایک طرح سے وہ امام شافعی کی پیروی کرتے تھے جن کے وہ اکثر لیکچر بغداد میں سنتے تھے۔ آپ کا تیس ہزار کا مجموعہ ایک لاکھ پچاس ہزار احادیث سے چنا گیا ہے۔ اس مسئلہ پر کہ کیا قرآن ازلی ہے یا پیدا کیا گیا آپکا خلیفۂ الوقت المعتصم سے اختلاف ہوا اور آپ کو قید کر دیا گیا۔ مگر المعتصم کے جانشین المتوکل نے آپ کو قید سے آزاد کر دیا۔ اور آپ کے ساتھ بڑی عزت و احترام سے پیش آیا۔ اشرفیوں کا تحفہ پیش کیا۔ مگر آپ نے لینے سے انکار کر دیا آپ کے جنازہ میں آٹھ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتیں شامل تھیں۔

دور حاضرہ میں مسئلہ اجتہاد نے ایک خاص اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں آئمۂ اربعہ کی زندگی اور ان کے مجموعات سے یہ بات ثابت ہے۔ کہ ان آئمہ نے تجزیہ قرآن اور احادیث کی تحقیقات میں اپنی عمریں گزار دیں۔ اور اس مشکل کام کو ایسی محنت، انہماک اور تدلل سے انجام دیا۔ اور تعبیر کے ایسے اصول وضع کیے۔ کہ ان کی شہرت سوائے چند افراد اور فرقوں کے ساری اُمّت میں پھیل گئی۔ اور ان کے خیالات کو جلد ہی وہ درجہ حاصل ہو گیا۔ کہ ان کے نتائج کے خلاف کوئی بات کہنا اسلام کے خلاف سمجھا جانے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد آئمۂ اربعہ کے اجتہاد کو حرف آخر سمجھا جانا گیا، مزید تعبیر کا دروازہ بند ہو گیا۔ اور اسلام میں ایک قسم کا جمود پیدا ہو گیا۔ عبدہٗ اس جمود یعنی اندھی تقلید کو اسلام کے زوال کا ایک باعث سمجھتا ہے۔ کیونکہ نہ ہی معاشرہ اور نہ ہی دنیا ایک مقام پر پہنچ کر رک جاتے ہیں۔

اور جو تبدیلیاں سوسائٹی اور دنیا میں ہر وقت واقع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ قوانین اور ضوابط، جو ایک وقت معاشرے کے لیے ضروری سمجھے جاتے تھے، ان تبدیلیوں کی وجہ سے یا تو بیکار ہو جاتے ہیں یا ان میں مناسب تبدیلی کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ اجتہاد کے لیے جو شرائط مقرر کی گئی تھیں۔ ان کو آج کل بہت کم لوگ پورا کرتے ہیں اور ملت کے مختلف ممالک اور حکومتوں میں تقسیم ہو جانے کے بعد اجماع اپنی اصلی صورت میں بالکل ناممکن ہو گیا ہے۔ اس لیے دور حاضرہ میں آزاد خیال مفکر اسلام کے مفاد میں اجماع کو چھوڑ کر اجتہاد کا نیا نظریہ پیش کر رہے ہیں۔ تاکہ اسلام اپنی ساخت کی بنیاد کو قائم رکھتے ہوئے نئے مسئلوں کا حل پیش کر سکے۔ اوپر ذکر آچکا ہے۔ کہ کس طرح حضرت عمرؓ نے نص کی وجہ اور اصول کو اخذ کرتے ہوئے اپنے عہد میں چند تبدیلیاں کیں۔ جو قرآن کے لفظی معنوں سے مختلف تھیں۔ اور آج کل ترقی یافتہ طبقہ جو دنیا میں تبدیلیوں کے رجحان کو سمجھتا ہے مصر ہے۔ کہ قدیم اجتہاد کے نظریہ کو بذریعہ اجتہاد ہی بدلا جائے۔ اسی لیے ترکیہ کی تاریخ کا مطالعہ کر کے اور اسی ملک

کے حالات دیکھ کر علامہ اقبال نے خیال ظاہر کیا ہے ۔کہ اتاترک نے جو تبدیلیاں ملک کے سیاسی اور مذہبی نظام میں کیں وہ ایک قسم کا اجتہاد تھا۔آپ نے خلیفۃ الوقت کی معزولی کو اسلام کے مطابق قرار دیا۔ اور جو تبدیلی خلیفہ کی معزولی سے عمل میں آئی ۔یعنی قانون ساز اسمبلی کا قیام بذریعہ انتخاب اس کو بھی درست قرار دیا۔ اصل مشکل جو مسئلہ اجتہاد سامنے لاتا ہے وہ یہ ہے ۔کہ کیا مسئلہ متنازع دین کی بنیاد سے تعلق رکھتا ہے یا امور دنیا سے۔ اس سوال کے جواب دینے میں کافی دقتیں ہیں ۔ مگر سوال ایسا نہیں جس کا جواب نہ مل سکے۔ دیکھنا یہ ہے۔کہ متنازع تبدیلی اسلام کی بنیادی اساس سے ٹوٹکر نہیں کھاتی ۔ اس سلسلہ میں جو تبدیلیاں حضرت عمر نے اپنے عہد میں کیں ان سے یہ اصول واضح ہو جاتا ہے ۔حضرت نے قطع یدین کی سزا کو اس واسطے موقوف کیا ۔کہ یہ سزا ایک فارغ البال معاشرہ کے افراد کے لیے ہے ۔جن کو چوری کی ضرورت نہ ہو۔اس لیے آپ نے قحط کے دوران اس سزا کو معطل کر دیا۔اسی طرح اگرچہ قرآن میں مال غنیمت کی تقسیم مقرر تھی۔آپ نے مفتوحہ زمین کی مجاہدوں میں تقسیم کو بند کر دیا کیونکہ ایسے مال میں عوام اور حکومت بھی حقدار تھے ۔صدقہ قرآن کے مطابق ان لوگوں کی تالیف قلوب کے لیے استعمال ہو سکتا تھا۔جو نئے نئے ایمان لائے تھے ۔مگر صدقہ کی اس تقسیم کو آپ نے اس لیے اور اس وقت بند کیا جب اسلام کو اتنی طاقت اور خوشحالی حاصل ہو چکی تھی کہ تالیف قلوب کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔اسی طرح حضرت عمر نے ایسے طلاق کو جو تین دفعہ ایک ہی وقت میں دیا جائے ۔خلافِ رواج الوقت طلاقِ بائن ٹھہرایا۔مسئلہ ناسخ و منسوخ بھی جو عام طور پر مسلمہ مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تبدیلی کون و زماں سے قرآن کی سابقہ آیت دوسری آیت سے جو وقت کے تقاضہ کے مطابق ہو منسوخ ہو جاتی ہے ۔ناسخ و منسوخ کی ایک مناسب مثال شراب کے امتناع کی ہے۔ سورۃ النحل (۱۶/۶۷) میں پہلے قرآن میں یہ کہا گیا: کھجور اور انگور کے پھل سے تم ایک ایسی چیز بناتے ہیں جو نشہ بھی دیتی ہے اور بہت اچھی قسم کی خوراک بھی ہے ۔یہ نشانی ہے اس قوم کے لیے جو عقل رکھتی ہے ۔"

اس آیت کے بعد جب لوگ شراب زیادہ پینے لگے یہاں تک کہ نماز میں بھی نشہ میں پڑھنے لگے تو سورۃ النساء میں آیا' اے ایمان والو! شراب کے نشے میں نماز مت پڑھو اگر جو کچھ آپ کہتے ہیں اس کو سمجھ نہ سکو (۴/۴۳) باوجود اس کے شراب کا استعمال جاری رہا۔صرف نماز کے وقت لوگ شراب نہیں پیتے تھے ۔ سورۃ البقرہ میں پھر ارشاد ہوا آپ خمر (نشہ) کے متعلق پوچھتے ہیں۔ تو اس میں خرابیاں زیادہ ہیں اور فائدے کم ہیں (۲/۲۱۹) ۔شراب پھر بھی بند نہ ہوئی۔تو سورۃ المائدۃ میں حکم ہوا کہ خمر نجس ہے اور شیطان کا ساعمل ہے اس لیے اگر آپ اپنی بھلائی چاہتے ہیں تو اس سے اجتناب کرو۔ (۵/۹۰ پمپلٹ ہال ایڈیشن) اور اس کی وجہ بھی ساتھ ہی بتا دی کہ شیطان نیز شراب

سے آپ میں دشمنی اور نفرت پیدا کرتا ہے اور اللہ اور اللہ کی پرستش سے دور رکھتا ہے۔ (۵/۹۱) ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ قرآن تبدیلی کون وزماں کا خیال رکھتا ہے۔ اور وقت کے مطابق ہدایت کرتا ہے۔ اس لیے احقر کی رائے میں اجتہاد کا موجودہ نظریہ خلاف اسلام نہیں بلکہ وقت کا تقاضا ہے۔ اور مصری مصلح عبدہٗ اندھی تقلید کو اسلام کے زوال کا ایک باعث سمجھتا ہے۔

جہاد

جہاد کے رکن اسلام ہونے پر اتفاق نہیں۔ فرقۂ خارجیہ اس کو اراکین اسلام میں شامل کرتا ہے۔ اور قرآن کی آیات سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہ جہاد کا مقصد حفاظت خود اختیاری ہے۔ جنگِ بدر، جنگِ احد، جنگِ خندق، جنگِ موتہ، جنگ خیبر اور فتح مکہ سب حفاظت خود اختیاری کے اصول کے تحت آتے ہیں۔ یہ خیال غلط ہے۔ کہ اسلام پھیلانے کے لیے ہر مسلمان دوسروں کو اسلام کی دعوت دے اور اگر یہ دعوت قبول نہ ہو۔ تو انکار کرنے والے کا سر کاٹ دیا جائے یا کہ ہر مسلمان ہاتھ میں تلوار لیے غیر مسلموں کو، خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا بت پرست یا ملحد، قتل کرتا پھرے۔ یا کہ ہر مسلمان ملک دوسرے ملکوں میں اسلام پھیلانے کے لیے ان کو فتح کرتا پھرے بعض علما کا خیال ہے۔ کہ ارکان اسلام کا تعلق صرف عقیدہ سے ہے۔ یعنی کلمہ طیبہ پر ایمان، قیامت پر ایمان، قرآن پر ایمان، سابقہ رسولوں اور ان کی کتابوں پر ایمان اور فرشتوں پر ایمان۔ یہ مسئلہ متنازع ہے۔ علما میں اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے اس کا جواب میری بساط سے باہر ہے۔ کیونکہ یہ کتاب تاریخی نقطۂ نگاہ سے لکھی جا رہی ہے۔ اس لیے دیگر اسلامی قوانین پر بحث کرنا بے مقصد اور طوالت کا باعث ہوگا۔ مگر اس ضمن میں دو مسئلوں پر مفصل بحث کیے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔ یعنی اسلام میں عورت کا درجہ اور غلاموں کیساتھ سلوک۔ یہ ہر دو مضمون ارتقاء بنی نوع انسان سے تعلق رکھتے ہیں۔

عورت کا مقام

اسلام پہلا مذہب ہے جس نے عورت کے حقوق تسلیم کیے۔ جو قانونی نقطۂ نگاہ سے آسانی سے بیان کیے جا سکتے ہیں۔ اسلام نے عورت کو جائداد منقولہ سمجھنے کی بجائے اسے انسانی مرتبہ دیا۔ اسلام سے پہلے پانچ اہم تہذیبیں گزر چکی تھیں، یعنی مصری، چینی، ایرانی، ہندستانی، یونانی اور رومی۔ ان سب میں کوئی بھی ایسی تہذیب نہیں، جس نے عورت کو اتنا اونچا مقام دیا ہو جتنا اسلام نے شہنشاہ ایران خسرو پرویز کے محل میں ۳۰۰۰ عورتیں تھیں جن سے مجامعت بغیر کسی قسم کی پابندی کے جائز تھی۔ امریکہ کا ایک رسالہ نیوز وِیک

اپنے شمارے مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۷۳ء میں بغیر کسی حوالہ کے لکھتا ہے۔ کہ یہودیوں کے بادشاہ دوم داؤد، جن کا تورایت میں ذکر آتا ہے، جوان کنواری عورتوں کے ساتھ اس لیے مباشرت کرتے تھے کہ ان کے جسموں کے اخراج کو جذب کرنے سے ان کی قوت جسمانی میں اضافہ ہو سکے۔ ان سے پہلے ایک نبی کے ساتھ اس کی دختران نے اس سے بھی قبیح حرکت کی جو توریت میں درج ہے۔ محرمات کے ساتھ مباشرت جو آجکل ایک گھناؤنا جرم سمجھا جاتا ہے فراعنہ مصر کا معمول تھا۔ اور وہ اپنی بہنوں سے شادی کرتے تھے۔ ہندو عورتوں کو ان کے شوہروں کے ساتھ ایک اٹوٹ رشتہ میں باندھ دیا جاتا تھا۔ اور شوہر کے مرنے پر وہ یا تو خود جل جاتی تھیں۔ یا ان کو زبردستی زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ یہودیوں اور عیسائیوں میں طلاق کی قسم کا کوئی قانون نہ تھا اور نہ کوئی ایسا رواج یا رسم۔ مذہب یہود میں عورت کے کم درجہ انسان ہونے کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی کہ ان کے قانون کے مطابق ایک مذہبی رسم میں جس کو منیان کہا جاتا ہے اور جس کے لیے دس افراد کی ضرورت ہوتی ہے عورت کو شامل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عیسائیوں کے چند ایسے فرقے اب بھی موجود ہیں جو عورت سے نفرت کرتے ہیں اور اس کے پاس جانا بھی ممنوع سمجھتے ہیں، انہیں عورت کی شکل سے بیزار رہنا بھی ایک مذہبی مجبوری ہے۔ عورت کی فطری کشش ان کو کتنا ہی اپنی طرف کھینچے ایسی کشش سے متاثر ہونا گناہ گنا جاتا ہے۔ اسی لیے عیسائی عورتیں جو خانقاہوں میں ایک دفعہ داخل ہو جاتی ہیں ان کو رہبانیت کی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ رومی خاندان کا سربراہ اپنے بیوی، بچے، پوتے، نواسے اور غلاموں پر اختیار مطلق رکھتا تھا اور قانون میں ان کے کوئی حقوق نہیں تھے۔ نہ ہی وہ کسی عدالت سے رجوع کر سکتے تھے۔ قدیم یونان کی جمہوریت میں، جس پر بڑا ناز کیا جاتا ہے اور جسے مثالی جمہوریت خیال کیا جاتا ہے، دو تہائی عورتیں تھیں مگر ان کو کوئی حق رائے دہندگی حاصل نہ تھا۔ عرب میں قبل از اسلام دختر کو دوسرے خاندان میں شادی میں دینا خاندان کی توہین خیال کیا جاتا تھا اس لیے نوزائیدہ دختراں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ عرب تاجر دوسرے ملکوں سے عورتیں خرید لاتے تھے اور ان کو سر بازار فروخت کیا جاتا تھا۔ خریدار کو حق ہوتا تھا کہ وہ بکنے والی عورت کے جسم کا جس طرح چاہے معائنہ کرے۔ یا ایسی عورتوں کو قحبہ خانوں میں بٹھا دیا جاتا تھا۔ قبائلی لڑائیوں میں عورتوں کو قید کر کے کنیز بنا لیا جاتا تھا۔ کنفوشیس نے جو تصویر مثالی معاشرے کی دی ہے اس میں وہ عورتوں کو شامل نہیں کرتا۔ انگلستان جیسے مہذب جمہوری ملک میں عورتوں کو حق رائے دہندگی دینا کل کی بات ہے۔ قدیم عرب میں نکاح کو کوئی تقدس حاصل نہ تھا۔ منکوحہ عورت جتنے آشنا رکھنا چاہے رکھ سکتی تھی۔ باپ کے مرنے پر اس کا بیٹا باپ کی بیویوں اور داشتہ عورتوں کو اپنی ملکیت خیال کرتا تھا اور سوائے اپنی حقیقی ماں کے سب کے ساتھ مباشرت کر سکتا تھا۔ ایک سے زیادہ شوہر رکھنا یا ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا ایک عام دستور تھا۔ اسلام نے عورت کے حقوق بہ وضاحت بیان کر کے عورتوں کو

قانون کی حفاظت دی ۔ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا۔کہ ان کے ساتھ شفقت سے پیش آؤ۔ان کو حقارت سے نہ دیکھو اسلام میں عورتیں جائداد کی مالک ہو سکتی ہیں، ورثہ میں حقدار ہیں، اپنی جائداد انتقال کر سکتی ہیں، مقدمات میں شہادت دے سکتی ہیں۔نکاح کرنے پر وہ مہر کی مستحق ہیں۔جو بذریعہ عدالت وصول کیا جا سکتا ہے۔طلاق کے لیے چند وجوہ کی بنا پر وہ عدالت سے تنسیخ نکاح کے لیے رجوع کر سکتی ہیں۔خاوند ان کو حق طلاق تفویض کر سکتا ہے۔جس کو وہ بغیر رضامندیٔ شوہر استعمال کر کے اپنے آپ کو طلاق دے سکتی ہیں۔ان کا بچوں کی تولیت کا حق کچھ حد تک شوہر کے مقابلہ میں قانون تسلیم کرتا ہے

قرآن میں مندرجہ ذیل حقوق عورت کے تسلیم کیے گئے ہیں۔

۱۔ اور عورتوں کے مردوں پر چند حقوق ہیں جیسا کہ مردوں کے عورتوں پر۔یہ حقوق انصاف پر مبنی ہیں (۲/۲۲۸) یہی بات رسول اللہ نے خطبۂ عرفات میں فرمائی۔

۲۔اگر تم ایمان رکھتے ہو۔تو تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ کسی رشتہ دار کے مرنے پر اس کی عورتوں کو ورثہ میں پاؤ (۴/۱۹)۔

۳۔اگر آپ ایک عورت کی جگہ دوسری عورت رکھنا چاہتے ہو اور پہلی عورت کو آپ کچھ مال متاع دے چکے ہو۔تو اس کو واپس مت لو (۴/۲۰)۔

۴۔مرد جو کچھ کماتے ہیں وہ ان کا حق ہے اور عورت کی کمائی عورت کا حق ہے دوسروں کی کمائی پر حسد مت کرو (۴/۳۲)

۵۔آپ اپنی بیویوں کے ساتھ انصاف کرنا مشکل پاؤ گے خواہ آپ اپنے دل میں اس کی کتنی ہی خواہش رکھتے ہوں۔ساری توجہ ایک بیوی پر مت رکھو اور دوسری کو تذبذب میں مت ڈالو (۴/۱۲۹)۔

۶۔اگر آپ سمجھتے ہیں۔کہ سب بیویوں کے ساتھ آپ یکساں انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر ایک پر اکتفا کرو یا ایسی عورت پر جس پر آپ کا دایاں ہاتھ حق رکھتا ہو۔اس طرح سے زیادہ ممکن ہے۔کہ آپ کوئی بے انصافی نہیں کر سکو گے (۴/۳)۔

۷۔اگر آپ کو ڈر ہو۔کہ شوہر اور بیوی میں نفاق پیدا ہو گا تو ہر ایک فریق اپنا ثالث مقرر کرے۔اگر وہ اپنے تعلقات میں اصلاح کی خواہش رکھتے ہیں، اللہ ان میں اتفاق پیدا کر دے گا (۴/۳۵)۔

۸۔اور وہ لوگ جو عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں، ایسی عورتوں پر کہ ان پر کسی برے فعل کا شبہ نہیں ہو سکتا، تو ایسے لوگوں پر دنیا اور آخرت میں پھٹکار ہے (۲۴/۲۳)۔

عورتوں کو گھروں سے نکلنے کی آزادی تھی۔وہ خطبات سننے جاتی تھیں اور خود مردوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہوتی تھیں۔مجاہدین کو پانی پلاتی تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔

تعدُّدِ ازدواج

اسلام میں تعدُّدِ ازدواج کی اجازت ہے۔ مگر اس اجازت کے ساتھ قرآن نے یہ شرط عائد کی ہے کہ اگر ایک سے زیادہ بیویاں ایک وقت نکاح میں ہوں تو ان کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے (۴/۳)۔ ایک دوسری جگہ قرآن بتلاتا ہے کہ یکساں سلوک کرنے کی شرط آپ خواہ کتنی ہی اس کی خواہش رکھتے ہوں پوری نہ کر سکو گے (۴/۱۲۹)۔ اور اگر یہ شرط پوری نہیں ہو سکتی تو صرف ایک بیوی پر اکتفا کرو (۴/۳) ان آیات سے جو اُصول اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی منکوحہ بیوی رکھی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اگر ایک سے زیادہ بیویاں ایک وقت میں ہوں تو ان کے ساتھ یکساں سلوک کرنا پڑتا ہے اور قرآن کے مطابق یہ شرط پوری کرنی بہت مشکل ہے۔ اِس لیے اگر بذریعہ قانون تعدُّدِ ازدواج ممنوع قرار دی جائے تو اس پر کوئی شرعی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایسی ممانعت اسلام کے اُصول کے مطابق ہو گی۔ مگر چونکہ ہر گھرانے کے مختلف حالات ہوتے ہیں اس لیے ممانعت کی مستثنیات بذریعہ قانون مقرر کی جا سکتی ہیں۔

پردہ

اگر کسی مسلم ملک کی آبادی کا جائزہ لیا جائے تو ساری آبادی میں قریباً نصف تعداد عورتوں کی ہو گی قرآن میں عورتوں کو نیچی آنکھیں کر کے چلنے اور اپنی قدرتی خوبصورتی اور مصنوعی زیبائش چھپانے کا حکم ہے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے چادر سے یا اوڑھنی سے اپنے سینے کو چھپانے کی خاص طور پر ہدایت ہے موجودہ پردے کا رواج حضورؐ کی زندگی میں رائج نہیں ہوا تھا۔ یہ رواج اس وقت شروع ہوا جب خلفائے عباسیہ کے زمانے میں ولید ثانی کے عہد میں چند درباری عورتوں کے ساتھ گستاخانہ سلوک کے مرتکب ہوئے۔ روایت کے مطابق حضورؐ نے عورتوں کو، جب وہ باہر کام پر نکلتی ہوں، ایک لمبے چوغے کی قسم کا لباس پہننے کی ہدایت فرمائی تھی۔ آجکل کا برقعہ عورت کے کام کاج میں حارج ہوتا ہے اور موجودہ زمانے میں عورتوں کو باہر کام کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ جو کچھ وہ کمائیں قرآن کے مطابق ان کا حق ہوتا ہے۔ بیشمار عورتیں کارخانوں دفتروں اور کھیتوں میں روزی کمانے کے لیے کام کرتی ہیں۔ اس لیے وقت کا تقاضا ہے۔ کہ اس اقتصادی مجبوری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے برقعہ کے موجودہ سسٹم میں ترمیم کی جائے۔ اتاترک نے برقعہ ختم کر دیا تھا اور ایسا کرنے میں اس نے اسلام کے کسی بنیادی اُصول کی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ آجکل جو صورت ہے وہ قرآنی ہدایت کے سراسر خلاف ہے۔ مگر یہ ہدایت اسلام کی ساخت کے کسی بنیادی پہلو سے تعلق نہیں رکھتی۔

ترقی پسند علماء عورتوں کو قانون ساز اداروں میں لینا یا ان کا حکومت کا سربراہ بننا یا حکومت کی

کلیدی اسامیوں کے فرائض انجام دینا ناجائز قرار دیتے ہیں ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تقریباً سارے اسلامی ممالک میں آج کل عورتیں حکومت کے اعلیٰ عہدوں تک پہنچ سکتی ہیں وہ پارلیمنٹ کا ممبر بن سکتی ہیں۔ وزارت کا عہدہ سنبھال سکتی ہیں ۔ عورتوں کا بطور آرٹسٹ شہرت پانا تو ایک عام بات ہے اور تاریخ میں ایسی عورتیں بھی گزری ہیں جو حکومت ملک کی سربراہ تھیں ۔ خلیفہ المقتدر کی والدہ عدالتِ مرافعہ کی صدر تھیں ۔ جس قرآنی پردے کی ہدایت ہے ۔ اس پر عام طور پر عمل نہیں ہوتا ۔ دیہات میں کام کرنے والی، مزدوری کرنے والی، اور پہاڑی علاقوں میں رہنے والی عورتوں کو اس پردے کا احساس ہی نہیں ۔ جس کی قرآن نے ہدایت کی ہے ۔ میں نے برقعہ پوش عورتوں کو بائیسکل چلاتے اور ٹینس کھیلتے دیکھا ہے ۔ مگر یہ صرف مستثنیات ہیں ۔ عام طور پر قرآنی پردہ شہروں اور دیہات میں ایک بھولی ہوئی استثنائی صورت ہے ۔ اگر قرآنی پردہ کی ہدایت کا اسلام کی تعمیر کے بنیادی اصولوں سے تعلق نہیں ۔ تو بہتر ہے ۔ کہ ایسے پردہ پر زور نہ دیا جائے ۔ کیونکہ ایسا کرنا ایک ناقابل عمل بات پر زور دینا ہوگا ۔ پردہ کرنا یا نہ کرنا ایک اختیاری اور انفرادی فعل ہونا چاہیئے ۔

غلامی

اسلام میں غلامی صریح طور پر ممنوع نہیں ہے ۔ البتہ غلاموں کے آزاد کرنے پر زور دیا گیا ہے ۔ رسول اللہ کے نکاح کے موقع پر سیدہ خدیجہ نے آپ کو ایک غلام زید بطور تحفہ دیا تھا ۔ مگر حضرت نے اس کو فوراً آزاد کر دیا ۔ یہ وہی زید ہیں جن کو موتہ کے معرکہ میں حضرت نے خود اسلامی لشکر کا کمانڈر مقرر فرمایا تھا ۔ اور ان کی کمان میں کئی ایک صحابہ نے لڑائی میں شرکت کی تھی ۔ زید صف اول میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے ۔ غلامی کا ان دنوں ایک اقتصادی پہلو تھا ۔ اور رسم غلامی زمانہ قدیم سے چلی آرہی تھی ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگرچہ اسلام نے غلامی ممنوع رسم قرار نہیں دی رسول اللہ اس رسم کو پسند نہیں فرماتے تھے ۔ اور غلاموں کے آزاد کرنے کو مستحسن فعل سمجھتے تھے اور آپ نے غلاموں کو عملی طور پر وہ درجہ دیا کہ ان میں اور عام شہریوں میں بظاہر کوئی فرق نہ رہا ۔ رسول اللہ اور صحابہ غلاموں کو خرید کر آزاد کرتے تھے ۔ اور چند ایک جرائم کی سزا میں خود قرآن غلاموں کو آزاد کرنا شامل کرتا ہے ۔ تاریخ شاہد ہے ۔ کہ قدیم تہذیبوں میں غلاموں کی حیثیت یہ تھی ۔ کہ ان کے ساتھ وحشیانہ سلوک جائز سمجھا جاتا تھا ۔ بیڑیوں سے جکڑ کر اور زنجیروں سے باندھ کر ان سے جہاز رانی کی سخت مشقت لے جاتی تھی ۔ تفریح کے طور پر ان کو آپس میں لڑایا جاتا تھا وقتیکہ ان میں سے ایک مغلوب ہو کر مارا نہ جائے ۔ ان کو شیروں اور چیتے جیسے خونخوار درندوں سے لڑوا کر مروا دیا جاتا تھا ۔ معمولی خطا پر ان کو قتل کر دیا جاتا تھا ۔ دیگر جائداد منقولہ کی طرح ان کو فروخت کیا جاتا تھا ۔ یہ بات کسی سے مخفی نہیں ۔ کہ افریقہ کے حبشیوں

کو جنگلی جانوروں کی طرح گھیر کر سفید فام تاجر ایک جگہ سمندر کے ساحل پر اکٹھا کرتے تھے اور پابند سلاسل کر کے امریکہ لے جاتے تھے۔ دوران سفر ان کے ساتھ ایسا بیرحمانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ کہ ان میں سے کئی ان ناقابل برداشت ایذاؤں سے تنگ آ کر سمندر میں چھلانگ لگا دیتے اور گہرے سمندر میں ڈوب مرتے۔

اسلام نے غلاموں کے ساتھ بیرحمانہ سلوک کرنا، ان کو بلاوجہ پیٹنا، ان پر جھوٹا الزام لگانا، ان کے ناک اور کان کاٹنا ممنوع قرار دیا (حجت البلاغہ مصنفہ شاہ ولی اللہ ترجمہ عارف ربانی صفحہ ۲۳۴-۲۳۵) رسول اللہ نے خطبۂ عرفات میں فرمایا کہ جو لوگ غلام رکھتے ہیں وہ ان کو وہی کھانا دیں جو وہ خود کھاتے ہیں۔ وہی لباس پہنائیں جو وہ خود پہنتے ہیں۔ اس حکم کی تعمیل میں حضرت ابوذر غفاری ایک دفعہ اپنے غلام کے ساتھ گھر سے باہر نکلے آپ وہی لباس پہنے ہوئے تھے جو ان کا غلام۔ حنین کی لڑائی میں جو لوگ قید ہو کر غلام بنائے گئے رسول اللہ نے ان سب کو بی بی حلیمہ کے دیور کی سفارش پر رہا کر دیا۔ غلامی ایک غیر انسانی رسم ہے۔ جو تمام قدیم تہذیبوں میں رائج تھی اور یونانی تہذیب میں تو یہ بات مسلمہ تھی کہ غلام محنت مشقت سے خوراک پیدا کر کے اپنے فلسفیوں کے پیٹ بھریں۔ تاکہ بے فکر ہو کر وہ اپنے فلسفہ میں مشغول رہیں۔ غلامی کی وجوہات تمام ممالک میں قریباً ایک سی تھیں یعنی جنگ میں پکڑے ہوئے قیدی، مقروض جو اپنا قرضہ ادا کرنے کے ناقابل تھے، خرید شدہ آدمی، غلاموں کی اولاد، خاندان کے سربراہ کے کنبہ کے افراد جن پر وہ اختیار مطلق رکھتا تھا سب غلاموں کی حیثیت رکھتے تھے مگر غلامی کی سب سے بڑی وجہ جنگ تھی جس میں پکڑے ہوئے آدمیوں کو غلام بنا لیا جاتا تھا۔ اس سے پہلے یہ رسم تھی۔ کہ جنگی قیدیوں کو مار دیا جاتا تھا۔ اس لحاظ سے غلامی کی رسم سابقہ رواج سے بہتر تھی۔ وہ قومیں بھی جو ترقی کے اعلےٰ مدارج تک پہنچ چکی تھیں غلام رکھتی تھیں۔ امریکہ کی ۱۸۶۱ء کی خانہ جنگی کی بڑی وجہ غلامی تھی۔ اب بھی کئی ملکوں میں غلامی کی رسم موجود ہے۔ مگر زمانۂ حاضرہ کا مہذب انسان اس سے نفرت کرتا ہے۔ اور متمدن ملکوں میں اس رسم کو قابل تعزیر بنا دیا گیا ہے۔

رسول اللہ نے غلامی کی سختی اور بیرحمی کو اپنی مثال سے نرم کیا۔ غلام اور آقا کو، سوائے ان کے اقتصادی رشتہ کے، برابر کا درجہ دیا۔ جو غلام اسلام قبول کر لیتے تھے، اگرچہ ان کی حیثیت غلاموں کی رہتی تھی تاوقتیکہ ان کو آزاد نہ کر دیا جائے، ان کا اور ان کے آقا کا درجہ یکساں ہو جاتا تھا اور آزاد ہو کر وہ اعلیٰ سے اعلیٰ مقام کے مستحق ہو جاتے تھے۔ اگر آقا کے طرز عمل میں کوئی قابل اعتراض پہلو پایا جاتا تھا تو اس کو غلام کی رہائی کا حکم دیا جاتا تھا۔ مگر اگر کوئی جھوٹی قسم کھائے تو اس کو اپنی غلطی کا خمیازہ بھگتنے کے لیے ایک غلام آزاد کرنا پڑتا تھا (۵/۸۹)۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو ماں کہہ کر پکارنے کے بعد اس سے رجوع کرنا چاہتا تو اس کو بھی ایک غلام آزاد کرنا پڑتا تھا (۵۸/۳) اور یہی سزا اس شخص کے لیے مقرر تھی جو بے ارادہ کسی مسلمان کو مارنے کا مرتکب ہو (۴/۹۲)۔ اس قسم کی اور بھی بہت مثالیں ہیں جہاں کسی غلطی

کے سرزد ہونے پر، خواہ وہ غلطی کبیرہ ہو یا صغیرہ، غلام کو آزادی دینی لازمی ہوتی تھی۔ اور یہ سزا دوسری سزا کے علاوہ بھی ہو سکتی تھی۔ آیات مندرجہ بالا اور رسول اللہ کے عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں چند صورتوں میں غلام کی آزادی لازمی تھی، غلام کو خود بخود آزادی کرنا ایک مستحسن فعل تصور کیا جاتا تھا۔ تاریخ کے طالب علموں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ غلامی کی قطعی ممانعت اُس زمانہ میں تقاضائے وقت کے خلاف سمجھی جاتی تھی۔ انگلستان میں ولبرفورس اور پارلیمنٹ کے چند ممبروں کی کوششوں اور غلامی کے خلاف عام احساس کے باوجود یہ قبیح رسم ۱۸۰۷ء سے پہلے ختم نہ ہو سکی۔ اور جس وقت اسے ممنوع قرار دیا گیا تو جزائر غرب الہند میں آٹھ لاکھ غلام آزاد کیے گئے۔ ہندوستان میں یہ رسم ۱۸۴۳ء تک جاری رہی۔ مسلمانوں کی ایک خاصیت یہ تھی۔ کہ وہ اپنے غلاموں کو آزاد کرتے تھے۔ اگرچہ زمانۂ حاضرہ کا ذہن اُس بیرحمی اور غیر انسانی سلوک، کو جو کہ غلامی کا نتیجہ تھا پسند نہیں کرتا اور غلامی گذشتہ صدی سے پہلے ختم نہیں کی گئی، رسول اللہ کے حساس ضمیر نے اس رسم کی برائی اور اس کے اخلاقی پہلو کو صدیوں پہلے محسوس کر لیا تھا۔ اور نبوت سے بھی پہلے آپ نے اپنا غلام آزاد کر دیا تھا۔

پاکستان میں دستور ساز اسمبلی نے غلامی کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اور یہ ممانعت اسلام کے مطابق ہے۔ غلامی کی وجوہات اقتصادی اور بین الاقوامی رواج تھے اور اب کیونکہ یہ رسم انسانیت کے خلاف سمجھی جاتی ہے اس کے جاری رکھنے کا کوئی جواز باقی نہ رہا۔ دستور ساز اسمبلی کا اس وحشی رسم کو ختم اور اس کو ممنوع قرار دینا ایک اسلامی اصول کی پیروی ہے۔

باب ۷
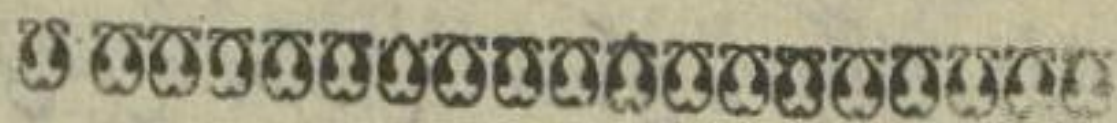
اخلاقیات ۔ اوامر و نواہی

ہر ایک معاشرے میں کچھ افعال قابل تعزیر ہوتے ہیں مگر بعض ایسے افعال بھی ہوتے ہیں جو قانون کی گرفت میں تو نہیں آتے مگر ان کی اچھائی برائی کا انسان کو ہمیشہ احساس رہا ہے ۔ نیکی اور بدی کا جواز اور امتناع اس علم کا حصہ ہے جس کے لیے خُلق یا اخلاقیات کا لفظ استعمال ہوتا ہے ۔ اس باب میں قابل تعزیر جرائم کا کم ذکر آئے گا ۔ صرف اخلاقیات پر بحث کی جائے گی ۔

جہاں تک کسی فعل کے لازمی طور پر کرنے یا نہ کرنے کا تعلق ہے ۔ قرآن میں قانون اور اخلاق میں بہت باریک فرق ہے ۔ عام طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس فعل کے لیے سزا مقرر ہے مثلاً کسی کو زندگی سے محروم کرنا اس کے عضو کو ایذا پہنچانا، اس کو جائداد سے محروم کرنا یا اس کی آزادی چھیننا ۔ یہ سب افعال زمانہ حاضرہ میں قانون کی زد میں آتے ہیں کیونکہ ایسا فعل سرزد ہونے پر عدالت سے رجوع کیا جا سکتا ہے اور عدالت قانون متعلقہ کا نفاذ کر سکتی ہے ۔ مگر جن افعال کا صرف اخلاق سے تعلق ہے اور وہ عدالت کے قابلِ سماعت یا دست اندازی نہیں ۔ وہ قانون کے دائرے میں نہیں آتے ۔ ایسے افعال کا امتناع یا جواز کیونکہ قانون سے متعین نہیں ہوتا اس لیے وہ اخلاق کے زمرہ میں آتے ہیں ۔ برے افعال سے احتراز کرنا اور مستحسن افعال کا اختیار کرنا مسلمانوں پر ایسی ہی پابندی عائد کرتا ہے جیسے قابل تعزیر افعال مگر ہر دو میں فرق ضرور ہے معاشرے کی ابتدائی منزلوں میں مذہب اور قانون میں بہت کم فرق تھا ۔ اسی طرح قانون اور اخلاقیات میں یا تو کوئی فرق نہیں تھا یا بہت کم ۔ اسلامی معاشرہ ایک ترقی پذیر معاشرہ تھا ۔ مگر اس میں بھی عقیدہ اور عمل میں فرق تھا ۔ ابتدائے اسلام میں فلسفیوں اور فقہا میں عقیدہ اور عمل کی ایک دوسرے پر ترجیح کے متعلق نہایت پُر مغز بحثیں ہوتی رہی ہیں ۔ مگر آخر کار عقیدہ کی ترجیح کو تسلیم کیا گیا ۔ اگرچہ موجودہ زمانہ میں معاملہ پھر مشکوک ہو گیا ہے ۔

قرآن اور حدیث نیک کاموں اور مستحسن افعال کی بہت تاکید کرتے ہیں اور ہر دو میں ایسے افعال کی ایک لمبی فہرست ہے ۔ جو نہیں کرنے چاہئیں یا جن کے کرنے کو مستحسن قرار دیا گیا ہے ۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جہاں اسلام سے پہلے کے مذاہب عام طور پر اچھائی اور برائی کے الفاظ استعمال کرتے تھے ۔ اسلام میں اچھے اور برے کاموں کی تفصیل سے وضاحت کی گئی ہے ۔ اگرچہ اچھائی برائی کے عام الفاظ بھی کہیں کہیں

استعمال کیے گئے ہیں۔

قرآن کئی مقامات پر کہتا ہے کہ اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

١۔ جو نیک عمل کرتے ہیں۔

٢۔ جو بدی سے بچتے ہیں۔

٣۔ جو متقی بننے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

۴۔ جو اپنی دولت میں سے غربا، محتاجوں، یتیموں اور مسافروں پر خرچ کرتے ہیں۔

۵۔ جو غلاموں کو آزاد کرتے ہیں۔

۶۔ جو دوسروں کے ساتھ رواداری رکھتے ہیں۔

۷۔ جو انصاف پسند ہیں اور خوش خلقی سے پیش آتے ہیں۔

اور اسی طرح کی فہرست ان لوگوں کی ہے جن کو اللہ پسند نہیں کرتا مثلاً

١۔ جو شرارتی اور سازشی ہیں۔

٢۔ جو دغاباز ہیں یا دھوکہ دیتے ہیں۔

٣۔ جو جھوٹ بولتے ہیں یا منافق ہیں یا دوسروں پر جھوٹا الزام لگاتے ہیں یا ان کی غیبت یا بدتعریفی کرتے ہیں۔

۴۔ جو متکبر ہیں۔

۵۔ جو اپنی دولت ضائع کرتے ہیں یعنی اسراف کے مرتکب ہوتے ہیں۔

۶۔ جو فحاشی میں مصروف رہتے ہیں اور دولت کا ضیاع کرتے ہیں۔

۷۔ جو اپنا عہد و پیمان توڑتے ہیں یا امانت میں خیانت کرتے ہیں اور دوسروں کا مال خورد برد کرتے ہیں۔

۸۔ جو رشوت لیتے یا دیتے ہیں۔

۹۔ جو زیادتی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

عہد شکنی اور خیانت

قرآن عہد و پیمان اور صلحناموں سے انحراف کو مذموم قرار دیتا ہے۔ خواہ یہ صلحنامے اور عہد و پیمان بت پرستوں کے ساتھ کیے گئے ہوں (۹/۳ - ١٧/٣۴٣) اس سلسلہ میں ایک قابل ذکر مثال ابوجندل کی ہے۔ اس شخص کے ساتھ مکہ والوں نے بہت بیرحمانہ سلوک کیا تھا اور اس کو مضروب کیا تھا۔ حضورؐ اس وقت مکہ میں تھے وہ شکایت لے کر رسول اللہ کے پاس آیا اور اپنی ضربات دکھائیں اور التجا

کی کہ اس کو مسلمانوں کے ساتھ مدینہ لے جائیں۔ مگر اس سے پہلے مکہ والوں کے ساتھ ایک عہد نامہ ہو چکا تھا کہ مسلمان مکہ سے مدینہ واپس ہوتے ہوئے کسی مکہ والے کو ساتھ نہیں لے جائیں گے۔ چنانچہ رسول کریمؐ نے اس کو مدینہ لے جانے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے عہد نامے کی خلاف ورزی ہوتی تھی۔

قرآن اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ جو چیزیں بطور امانت سپرد کی گئی ہوں تو امانت کی شرائط پوری کی جائیں۔ اسی طرح قرآن میں تاکید آئی ہے کہ یتیموں کی جو جائداد امانت رکھی جائے اس کو خورد برد نہ کیا جائے۔ ایسا کرنا آگ نگلنے کے برابر بیان کیا گیا ہے۔

تجارت اور سُود

اللہ نے تجارت کو مباح قرار دیا ہے اور سُود کو حرام (۲/۲۷۵ - ۳۰/۳۹) قرآن میں ارشاد ہے:-

'سود مت نگلو' ایسا سود جس میں کئی اضافے ہوتے رہے ہوں (۳/۱۳۰)۔

مقروض کا سُود معاف کرنا اللہ کے ایک فرض کو پورا کرنا ہے (۲/۲۷۸)۔

جو مقروض تنگ دست ہوں ان کو سود چھوڑنا مستحسن ہے (۲/۲۸۰)۔

وہ لوگ جو سُود کھائیں ان لوگوں کی طرح ہیں جن کو شیطان نے دیوانہ بنا دیا ہو اور وہ نہیں اُٹھ سکیں گے (۲/۲۷۵)۔

سورہ بقرہ کی ۲۷۴ سے ۲۸۱ تک کی آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو سود ربا کی تعریف میں آتا ہے ممنوع اور قابل مذمت ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے ایک مصری مفکر عبدہٗ کی رائے ہے کہ قرضہ جات پر سُود لینا جائز ہے۔ اس مسئلہ کا حل ربا کی تعریف اور جس مقصد کے لیے قرضہ لیا گیا ہے پر منحصر ہے۔ موجودہ زمانہ کے اقتصادی اور تجارتی حالات ان حالات سے بالکل مختلف ہیں جو متعلقہ وحیوں کے نزول کے وقت تھے اور کیونکہ سُود موجودہ تجارت اور بین الاقوامی قرضہ جات کی بنیاد ہے۔ اِس لیے اِس مسئلہ کے حل کے لیے اجتہاد کی ضرورت ہے۔ قرآن کی ایک مندرجہ بالا آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ربا کا مطلب سود در سود یا سود کی بھاری شرح یا بذریعہ سود نفع کمانے کا ہے۔ (۳/۱۳۰) سود دراصل منافع کمانے کی غرض سے دیا جاتا ہے اور مقروض کو اگر سود پر قرضہ لینے سے منافع ہوتا ہے تو واضح طور پر سود لینے والے کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ مقروض کو سود پر روپیہ دینے سے مقروض کو فائدہ ہوگا۔ سُود کے متعلق وحیاں نازل ہونے کے وقت عرب اور اسلامی دنیا میں تجارت کی صورت بالکل مختلف تھی اور حاجتمند مقروض کو اپنے سرمایہ میں سے سود ادا کرنا پڑتا تھا اور ایسی ادائیگی اس کی تباہی کا باعث ہو سکتی تھی۔

پہلی اسلامی مشاورتی کونسل کے صدر مرحوم جسٹس محمد اکرم نے اپنی رپورٹ میں ایسے روپیہ پر سود لینے یا دینے کو جو مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کو دیا جاتا ہے ربا کی ممانعت کے قاعدے سے خارج قرار دیا تھا۔

آجکل کے معاشرے میں جو شخص کوئی کاروبار کرنے کے لیے یا مکان کرایہ پر چڑھانے کے لیے قرض لیتا ہے تو وہ عام طور پر منافع حاصل کرنے کی غرض سے روپیہ ادھار لیتا ہے اور اس منافع میں سے سود ادا کرتا ہے۔ اگر ایسے سود کی ممانعت کر دی جائے تو شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو بلا تامل بغیر سود روپیہ قرض دے۔ اس طرح اقتصادی ترقی کے مسدود ہونے کا اندیشہ ہے۔ مشاورتی کونسل کو اس پیچیدہ مسئلہ کو جلد حل کرنا چاہیئے۔

مولینا مودودی نے اپنی تصنیف تفہیم القرآن میں اس مسئلہ پر پوری بحث کی ہے۔

کم وزنی

ناپ تول کے پیمانہ پر کڑی نظر رکھی جائے اور درست وزن سے ذرا بھی انحراف نہیں ہونا چاہیے (۱۷/۳۵) مال پورا تول کر دیا جائے اور ان لوگوں کی تقلید نہ کی جائے جو مال تولنے میں کمی کر دیتے ہیں۔ وزن درست ترازو سے کرو اور کسی کے مال کو کم تول کر اس پر ظلم نہ کرو۔ لعنت ان لوگوں پر جو جب مال خریدتے ہیں تو اس کے پورا ہونے پر اصرار کرتے ہیں۔ مگر جب وہ خود مال بیچتے ہیں تو خریدار کو کم تول کر نقصان پہنچاتے ہیں۔ (۸۳/۵-۲)

زر اندوزی اور ذخیرہ اندوزی

ذخیرہ اندوزی کی قرآن میں دو دفعہ مذمت آئی ہے۔ (۱) اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو دولت اندوزی کرتے ہیں۔ (۴/۳۷ - ۶/۳۴) (۲) ان لوگوں کو جن کو اللہ نے دولت بخشی ہے یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ کنجوسی ان کے لیے اچھی ہے۔ یہ بات یقیناً ان کے لیے بری ہے جو کچھ جمع کر کے وہ ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں۔ قیامت کے دن یہ ذخیرہ ان کو گردن سے پکڑے گا (۳/۱۸۰)۔ دولت کے حصول کے مقابلہ میں لوگ اللہ کو بھول جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اس دنیا میں ہی دوزخ کو دیکھ سکیں گے (۱۰۲/۱-۲)۔

بیع میں غلط بیانی

جو لوگ مال بیچتے ہیں ان کو اپنے خریداروں کو مال کے نقائص چھپا کر دھوکا نہیں دینا چاہیئے۔ ان پر یہ فرض ہے کہ مال کے سارے نقائص خریدار پر واضح کریں۔ (بخاری۔ کتاب البیوع)

ملاوٹ

یہ بات سخت قابل مذمت ہے کہ خریدار کو دھوکا دینے کے لیے بیچنے والا مال میں ملاوٹ کرے۔

یعنی کھرا مال اوپر رکھ کر ناقص مال نیچے رکھنے تاکہ خریدار یہ سمجھے کہ نچلا مال اُوپر کے مال جیسا ہی ہے۔
(بخاری ۔ کتاب البیوع)

سٹہ
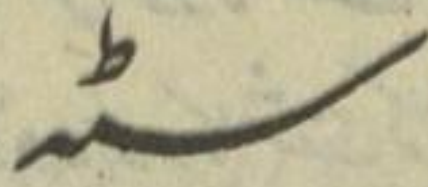
مسلم کے مطابق تاجروں کو مال خریدنے کی اجازت نہیں جب تک مال منڈی میں نہ پہنچ جائے۔ دوسری ہدایت یہ ہے۔ کہ کوئی سوداگر اپنا مال نہیں بیچ سکتا جو اس نے خرید کر اپنے قبضے میں نہ کر لیا ہو۔ پہلی ہدایت ناجائز نفع خوری کے خلاف ہے اور دوسری سٹہ باز کے۔

نیک اعمال کی اہمیت

نیک اعمال پر بہت سی حدیثوں میں زور دیا گیا ہے یہاں تک کہ بعض صورتوں میں نیک اعمال کو نماز اور روزہ پر فوقیت دی گئی ہے۔ یا ان فرائض کی ادائیگی کے برابر سمجھا گیا ہے۔ خلق کی خاص طور پر تاکید کی گئی ہے۔ ایک حدیث کے مطابق وہ شخص خواہ وہ کتنا ہی عابد ہو مگر اس کا خلق بُرا ہو جہنّم کے سب سے نچلے طبقے میں جائے گا۔ دوسری حدیث یہ ہے کہ وہ شخص بھی جو نماز روزہ کا پابند نہ ہو اپنے خلق کی وجہ سے وہ درجہ پائے گا جو نماز روزہ کا پابند شخص پائے گا۔ (رشید اختر ندوی ۔ حیاتِ سرورِ دو عالم صفحہ ۷۹)

رسول اللہ نے ایک دفعہ فرمایا ۔ مَیں آپ کو ایک بات بتاتا ہُوں جو نماز، روزہ اور صدقہ سے بھی بہتر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ صلح سے رہو کیونکہ باہمی چپقلش بربادی کا باعث ہو سکتی ہے۔ (شاکر رضوی بحوالہ ترمذی و ابوداؤد ۔ پاکستان ٹائمز مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۷۳ء)

ایک اور حدیث اس طرح ہے۔ کہ دو شخص جو نماز، روزہ، ادائیگی حج اور نیک عمل میں برابر تھے بہشت میں داخل کیے گئے۔ ایک میں وہ سب خوبیاں تھیں جو بیان کی گئی ہیں۔ دوسرے کے پاس اچھی عادات، انسان دوستی اور شفقت بھی تھی۔ مگر بہشت میں ان دونوں میں اتنا فرق تھا جتنا مشرق و مغرب میں (رشید احمد ندوی ۔ حیاتِ سرورِ دو عالم صفحہ ۷۸)۔

اور خوبیاں جن کی قرآن اور حدیث میں ہدایت کی گئی ہے۔ وہ اپنے والدین اور یتیموں کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا۔ جو مدد کے محتاج ہوں ان کی مدد کرنا اور غریب رشتہ داروں، پڑوسیوں اور پناہ گزینوں کی مالی مدد کرنا ہیں۔ ایک دوسرے کی اصلاح کرنا، دوستی، معافی، سچ بولنا، عہد و پیمان پورا کرنا، امانت کا مال واپس کرنا سب مستحسن اعمال ہیں۔ درحقیقت حکم یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ کیا ایک شخص اپنی امانت میں دیانتدار ہے۔ اس کے نماز روزہ پر ہی نظر نہیں ڈالنی چاہیئے۔ اگر ایک شخص جو مقروض ہے قرض ادا نہیں کر سکتا تو قرضخواہ پر لازم ہے کہ وہ دیے ہوئے قرض کو خیرات سمجھے۔

زمینداری

زمین کے معاملہ میں قاعدہ یہ تھا کہ جو شخص خود کاشت کرتا ہو اور زمین بھی اس کی ملکیت ہو تو وہ اتنی زمین ہی اپنے پاس رکھ سکتا تھا جس کو وہ خود کاشت کر سکے۔ باقی زمین ان لوگوں میں تقسیم کی جاتی تھی جو بے زمین تھے۔ ایسے لوگوں سے لگان جنس یا نقدی کی صورت میں نہیں لیا جاتا تھا۔ وہ لوگ جو کھیتوں میں کام کرتے تھے اپنی اُجرت کے حقدار تھے (کراء الارض صحیح مسلم - جزو ۵ - ۱۹)۔

خیبر کے یہود کو جو اپنی زمین لگان پر دیتے تھے پیداوار کا نصف حصّہ حکومت کو دینا پڑتا تھا۔ دراصل اس شرط پر ہی زمین ان کو دی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے زمین کو مالِ غنیمت کی تقسیم کے قاعدے سے مستثنیٰ قرار دے کر حکومت کی تحویل میں لے لیا تھا اور اس کو ایک قسم کے وقف کا درجہ دے دیا تھا۔

اقتصادی ڈھانچے کی تعمیر

اس باب میں جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس کی بنا پر سوچ سمجھ کے بعد اسلامی اقتصادی نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔ زکوٰۃ، صدقہ، غریبوں، یتیموں، بیواؤں اور محتاجوں کی مدد اور خیرات کی تاکید سے ایک ہی اصول اخذ ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ معاشرے میں سے محتاجی، تنگدستی اور غربت کو رفع کرنے کے ذرائع اختیار کیے جائیں۔ زمیندار اپنے قبضہ میں صرف اتنی زمین رکھے جو وہ خود کاشت کر سکتا ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ صرف اتنی زمین کا حقدار ہو جو وہ روائتی طور پر اپنے ہاتھ اور جانوروں کی مدد سے کاشت کرتا ہے۔ ایسے طریقۂ کاشت سے ملکی پیداوار متاثر ہو گی۔ اِس لیے اگر زمیندار مشینی طریقہ کاشت اختیار کر سکتا ہے تو وہ اتنی زمین اپنے زیرِ کاشت رکھ سکتا ہے جس کا وہ زراعت کے نئے طریقوں کے مطابق انتظام کر سکتا ہے۔ مگر گھر بیٹھے مزارعوں سے لگان وصول کرنے پر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنا مندرجہ بالا اصولوں کے خلاف ہو گا۔

تجارت کے موٹے موٹے اسلامی اصول بھی تفصیل سے اوپر بیان کر دیے گئے ہیں۔ تجارتی مال میں ملاوٹ خاص طور پر منع کی گئی ہے۔ اسی طرح غلط ناپ تول قابلِ مواخذہ بنایا جا سکتا ہے۔ خرید و فروخت میں غلط بیانی کی وہی حیثیت ہے جو غلط ناپ تول کی۔ سٹہ یعنی ایسے مال کا سودا کرنا بھی ممنوع ہے جو بائع کے قبضہ میں نہیں۔ آجکل یہ رسم عام ہے اور صرف جوئے کی ایک قسم ہے۔ کرسی پر بیٹھے اور بغیر کوئی کام کیے یا سرمایہ استعمال کیے لوگ لکھو کھا روپے سٹہ سے کماتے ہیں۔ کاہلی اور بیکاری اسلامی اصول کے خلاف ہے۔ کیونکہ قرآن میں صاف طور پر یہ بات آئی ہے کہ انسان صرف وہ کچھ حاصل کرتا ہے جس کے لیے وہ کوشش اور محنت (سعی) کرے۔ یہ خیال اشتراکیت (سوشلزم

کی پہلی منزل کا بنیادی اصول ہے ۔ سعی اور استحقاق کا اسلامی اصول کئی طریقوں سے اسلام کی اقتصادی ساخت میں استعمال کر کے مفید نتائج پیدا کیے جا سکتے ہیں ۔

مذہبی رواداری

خلافتِ راشدہ کے بعد کے خلفاء، سلاطین، امراء اور حکام کا کچھ ہی نظریہ یا عمل ہو قرآنی احکام مذہبی رواداری سے متعلق بالکل واضح ہیں اور اسی رواداری اور آزادیٔ دین کے تخیل کو کئی بار نئے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے ۔ اس معاملہ کے متعلق بنیادی آیت وہ ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں اور ہر شخص کا مذہب اس کا اپنا معاملہ ہے (۲/۲۵۶) ایک اور آیت کے حوالہ سے رسول کریمؐ غیر مسلموں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں "تم اللہ کے متعلق تنازعہ کرتے ہو۔ وہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی ۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے (۲/۱۳۹) اور اہل کتاب کے قبلہ کے متعلق اللہ تعالیٰ رسول اللہ سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں ۔ "کفار آپ کے قبلہ کی طرف منہ نہیں کریں گے اور نہ ہی آپ ان کے قبلہ کی طرف" (۲/۱۴۵) ۔ ایک تیسری آیت میں رسول اللہ کو کفار سے مخاطب ہو کر یہ کہنے کی ہدایت ہوئی "تم اس کی پرستش نہیں کرو گے جس کی میں کرتا ہوں" "تمہارا مذہب اور راستہ تمہارا ہے اور میرا دین اور راستہ میرا اپنا (۱۰۹/۱-۳) اور بت پرستوں کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کا فرمان ہے کہ اگر اللہ کا منشا ہوتا تو دنیا میں کوئی بھی بت پرست نہ ہوتا ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ سے مخاطب ہو کر کہا (اے رسول) میں نے آپؐ کو بت پرستوں کا محاسب بنا کر تو نہیں بھیجا ۔ اور نہ آپؐ ان کے افعال کے ذمہ دار ہیں ۔ (۶/۱۰۷) ذیل کی آیات سے مزید واضح ہوتا ہے کہ کفار کے متعلق قرآن کتنی رواداری برتتا ہے ۔

۱ ۔ جس شخص نے رسول کا حکم مانا اس نے اللہ کا حکم مانا اور جو شخص اس حکم سے روگردانی کرتے ہیں ہم نے آپؐ کو ان کا نگران بنا کر نہیں بھیجا (۴/۸۰) ۔

۲ ۔ ہم اللہ پر یقین رکھتے ہیں اور اس وحی پر جو ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، یعقوبؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ پر نازل ہوئی ۔ ان سب میں ہم کوئی امتیاز نہیں کرتے (۳/۸۴) ۔

۳ ۔ ان لوگوں کو طعن نہ دو جو اللہ کے سوا (کسی اور کو سجدہ کرتے ہیں) مبادا کہ وہ اپنی جہالت کی وجہ سے اللہ کو طعن دیں (۶/۱۱۵) ۔ اور اگر وہ (کفار) صلح کی طرف رجوع کریں تو آپؐ بھی اسی طرح ان کی طرف رجوع کرو ۔ اور اگر وہ دھوکا دیتے ہیں تو یقیناً اللہ ان کو سمجھنے کے لیے کافی ہے (۸/۶۱-۶۲)

۴ ۔ بت پرستوں کے ساتھ کیے ہوئے معاہدوں پر عمل کرو اگر انہوں نے کسی طرح آپؐ کے حقوق میں دست اندازی نہیں کی (۹/۴) ۔

۵ - اور اگر کوئی بت پرست آپ سے محافظت کا خواستگار ہو تو اس کو اپنی حفاظت میں لو تا کہ وہ اللہ کا پیغام سن سکے اور اس کے بعد اس کو اس کی محفوظ جگہ پہنچا دو۔ یہ اس لیے کہ وُہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں۔ (۹/۵)

۶ - اور ان کو (کفار کو) صبر سے برداشت کرو۔ آپ کی قوت برداشت اللہ کی مدد سے ہے۔ آپ ان کے لیے رنجیدہ نہ ہوں اور وہ جو کچھ کرتے ہیں اس سے مضطرب نہ ہوں (۱۶/۱۲۷)۔ رسول اللہ کا فرض سچائی کا پیغام پہنچانا تھا (۴/۸۴ - ۵/۶۸) لوگوں کو اس پیغام کو قبول کرنے پر مجبور کرنا آپ کا فرض نہ تھا (۵۰/۴۵)۔

۷ - اور جو کچھ وہ (کفار) کہتے ہیں اس کو صبر سے برداشت کرو اور ان کو خوش اسلوبی سے واپس کرو (۷۳/۱۰)۔

۸ - اور اے پیغمبر میرے بندوں سے کہہ دو یعنی ان سے جو دعوتِ حق پر ایمان لائے ہیں کہ مخالفوں سے جو بات کہو وہ خوبی کی بات ہو (۱۷/۵۳)۔

۹ - سوائے ان اہل کتاب کے جو ظلم کرتے ہیں سے کہو کہ ہم اس وحی پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ کے لیے بھی نازل ہوئی۔ آپ کا خدا اور ہمارا خدا ایک ہے اور اسی کے سامنے ہم جھکتے ہیں (۲۹/۴۶)۔

ان آیات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام جبراً تبدیلیٔ مذہب کا قائل نہیں اور نہ ہی اس میں کسی قسم کے تعصب اور تنگدلی کی گنجائش ہے۔ اس کے برعکس ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ جب کسی شخص نے دھوکے میں آکر یا جبراً یا کسی مصلحت کے زیر اثر اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کرنے کا اقرار کیا اور بعد میں وہ پھر اپنے مذہب میں داخل ہو گیا تو اس کو موت کی سزا اس بنا پر نہیں دی گئی کہ اس کا اسلام قبول کرنا صدق دل سے نہیں تھا اور مسلم کہلا کر بھی وہ دل میں اپنے مذہب پر قائم رہا اور ایسا شخص مرتد کی تعریف میں نہیں آتا۔

نظائر

حضرت معاویہؓ کی حکومت میں کئی عیسائی ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ عباسی خلیفہ المقتدر نے ان گرجاؤں کو دوبارہ تعمیر کرنے کا حکم دیا جن کو رملہ اور دیگر مقامات پر منہدم کر دیا گیا تھا۔ ہسپانیہ کی اسلامی حکومت کا دور تاریخ کا ایک درخشندہ دور ہے جس میں انصاف، مذہبی آزادی، تہذیب اور خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ وہاں مسلمانوں نے اپنے صدیوں کے دورِ حکومت میں کسی کو جبراً مسلمان نہیں بنایا اور مذہبی آزادی کے دور میں عیسائی اپنے کام کاج میں مصروف مسلمانوں کے ساتھ خوشی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ فرانس کے مشہور مؤرخ اور سائنسدان رینان (JOSEPH EARNEST RENAN) کا جس نے ابن رشد

پر مضمون لکھ کر ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی بیان ہے کہ سائنس اور ادب کے شوق نے، جو دسویں صدی میں دنیا کے اس کونے میں عروج پر تھا، ایسی مذہبی آزادی کو جنم دیا جس کی دنیا میں مثال نہیں ملتی۔ مسلمان، عیسائی اور یہودی ایک ہی زبان (عربی) بولتے تھے۔ ایک ہی طرح کے گیت گاتے تھے اور ایک ہی ادبی شوق اور سائنس میں برابر کا حصہ لیتے تھے۔ تمام رکاوٹیں جو ایک مذہب کو دوسرے مذہبوں سے جدا کرتی ہیں غائب ہو چکی تھیں اور مل جل کر سب لوگ مشترکہ تہذیب کی ترقی میں کوشاں تھے۔ اسی طرح ایک مشہور ہندو مؤرخ ایم۔ این رائے لکھتا ہے کہ عبدالرحمٰن سوئم نے حکومت کے سارے دروازے ہر مذہب کے پیرووں کے لیے کھول دیے تھے۔ تیسری صدی ہجری تک آتش پرستی کے قدیم مندر اپنی شان و شوکت سے نزدیک کی مسجدوں پر چھائے ہوئے تھے۔ عباسی خلیفہ ماموں کے عہد میں، جس کو اسلامی حکومت کا عظیم الشان دور کہا جاتا ہے، تمام ظاہرہ مذہبی اختلافات ختم ہو گئے تھے اور یہودی، عیسائی، آتش پرست اور صابعین حکومت کے بڑے سے بڑے عہدہ پر فائز ہونے کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ اس کے عہد میں گیارہ ہزار گرجا گھر تھے اور سینکڑوں یہودی عبادت خانے۔ اس نے اسکندریہ کی کتب اور یونانی فلسفیوں کی تصانیف جمع کیں جن کا ایک عیسائی اور برہمن نے ترجمہ کیا۔ اس کے کتب خانے کی فہرست ۴۴ جلدوں پر مشتمل تھی۔ حضرت عمرؓ نے یروشلم کی تسخیر کے بعد جو عہد نامہ ایلیا کے لوگوں کے ساتھ کیا اس کے چند الفاظ سُنیے:-

"یہ وہ امان ہے جو خدا کے بندے امیر المومنین عمرؓ نے ایلیا کے لوگوں کو دی۔ یہ امان ان کی جان، مال، گرجا، صلیب، تندرست یا بیمار آدمیوں اور اس کے تمام مذاہب والوں کے لیے ہے۔ اس طرح کہ ان کے گرجاؤں کو مسکن نہیں بنایا جائے گا۔ نہ وہ ڈھائے جائیں گے نہ انہیں یا ان کے احاطوں کو نقصان پہنچایا جائے گا۔ نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی۔ مذہب کے بارے میں ان پر کوئی جبر نہ کیا جائے گا۔ نہ ان میں سے کسی کے ساتھ بدسلوکی کی جائے گی۔"

جو کچھ اس عہد نامہ میں تحریر ہے اس کے لیے خدا کی، رسول کی، خلفاؐ کی اور مسلمانوں کی ضمانت ہے۔

عرب ممالک کے درمیان ایک ملک لبنان ہے جس میں اب تک عیسائیوں کی اکثریت ہے۔ اگر یہ الزام صحیح ہوتا کہ مسلمان ایک متعصب اور تنگدل قوم ہیں اور مفتوحہ ممالک کے غیر مسلموں کو قتل کرتے یا جبراً مسلمان بناتے ہیں تو آج یہ عیسائی اکثریت اس ملک میں موجود نہ ہوتی۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ اس ملک میں بھی جس میں عیسائی اور مسلمان پُرامن طور پر صدیوں اکٹھے بستے رہے۔ اب مذہب کی بنا پر فسادات بلوے اور جنگ شروع ہو گئے ہیں۔ باوجودیکہ مسلمانوں نے ہسپانیہ پر سات سو سال حکومت کی وہاں کی مقامی آبادی غیر مسلم ہی رہی۔ اسی قسم کی مثال ہندوستان کی ہے۔ سوائے اس بیوقوفانہ الزام کے کہ

اورنگ زیب ہندوؤں کے زنار ان کے بدن سے اتروا کر ڈھیروں میں جلا دیتا تھا۔ کسی مؤرخ نے نہیں کہا کہ اس ملک میں مسلمانوں نے اپنی سات سو سال کی حکمرانی میں ہندوؤں کو صرف ان کے مذہب کی بنا پر قتل کیا ہو یا ان کو جبراً مسلمان بنایا گیا ہو۔ یہ درست ہے کہ مسلمان بادشاہوں کی سکھوں اور مرہٹوں سے لڑائیاں ہوئیں جیسا کہ مسلمانوں کی آپس میں لڑائیاں ہوئیں مگر ان سب لڑائیوں کے اسباب سیاسی تھے نہ کہ مذہبی تعصب اور تنگدلی۔ شہنشاہ اکبر کے عہد میں ہندو بڑے بڑے عہدوں پر متعین تھے اور اس کے نورتنوں میں شامل تھے۔

ترکوں کی فراخدلی اتاترک کے زمانہ سے ضرب المثل رہی ہے۔ سینٹ صوفیہ کو جو عیسائیوں کا مشہور گرجا گھر تھا، اتاترک سے پہلے مسجد بنا لیا گیا تھا مگر اتاترک نے اس کو عجائب گھر میں تبدیل کر دیا۔ محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ نے ایک مسلم سپاہی کا سر قلم کروا دیا کیونکہ اس نے عیسائی تبرکات کو توڑ کر ان کی توہین کی تھی۔ فارس کے شہنشاہ عباس نے اصفہان کے یہودیوں کو بطور عام شہری زندگی بسر کرنے کی اجازت دے رکھی تھی اور اس اجازت پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔ جب ایک حاجی نے تبریز کے ایک سوداگر کو جو آرمینیا کا باشندہ تھا اس وجہ سے قتل کر دیا کہ اس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا تو گورنر اصفہان نے اس کو سزائے موت کا حکم سنایا جس کی تعمیل کی گئی۔ رسول اللہ کا قول ہے کہ جو شخص ہماری حفاظت میں آگیا تو اس کا خون ہمارا خون ہے اور اس کا خون بہا ہمارا خون بہا ہے۔ رسول اللہ نے ایک غیر مسلم بادشاہ نجاشیٔ حبش کی موت پر دعا کرنے کا حکم دیا کیونکہ یہ بادشاہ متقی تھا۔ رسول کریم اس بات پر بھی فخر کرتے تھے کہ آپؐ کی ولادت نوشیروان جیسے منصف مزاج بادشاہ کے عہد میں ہوئی۔

آزادیٔ ضمیر

مذہبی آزادی آزادیٔ ضمیر کا منطقی نتیجہ ہے۔ اس لیے جو کچھ مذہبی آزادی کے متعلق اوپر ذکر آیا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت میں ضمیر کی پوری آزادی تھی بشرطیکہ یہ آزادی حکومت کے استحکام کے منافی نہ ہو۔ اس آزادی میں ترکِ اسلام اور اس کی بجائے کوئی دوسرا مذہب اختیار کرنا شامل ہے۔ بشرطیکہ تبدیلیٔ مذہب کے پیچھے کوئی مخاصمانہ سیاسی مقصد نہ ہو۔ اس مضمون پر دو مفکروں نے تھوڑا عرصہ ہوا اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ان میں سے ایک تو ایس۔ اے رحمٰن صاحب سابق چیف جسٹس آف پاکستان ہیں۔ جنہوں نے ارتداد کے مضمون پر ایک پوری کتاب لکھی ہے جس کا نام (اسلام میں مرتد کی سزا)[1] ہے۔ دوسرے صاحب ایک مضمون نگار فخر الدین ہیں جنہوں نے پاکستان ٹائمز مورخہ

---

[1] APOSTACY IN ISLAM

۸، نومبر ۱۹۷۳ء میں زیر عنوان 'مسلم سوسائٹی میں آزادیٔ ضمیر' پر ایک آرٹیکل لکھا ہے - یہ ہر دو تحریریں بڑے تجسس اور گہری سوچ بچار کا نتیجہ ہیں - رحمٰن صاحب قرآن، حدیث اور فقہا کی تحریروں کا حوالہ دے کر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ارتداد جس کے پیچھے کوئی سیاسی مقصد ملک یا اسلامی معاشرے کو نقصان پہنچانے کا نہ ہو اور نہ ہی اس میں معاشرے کے نظام پر کوئی زد لگانے کی کوشش پنہاں ہو قابل تعزیر نہیں کیونکہ قرآن میں ارتداد کی کوئی سزا مقرر نہیں اور مرتد کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیئے اللہ کے ہاتھ میں ہے - مزید دلیل یہ ہے کہ ارتداد حقوق اللہ کے دائرے سے تعلق رکھتا ہے - نہ کہ حقوق العباد کے دائرے سے - حقوق اللہ کی خلاف ورزی اور سزا اللہ کے اختیار میں ہے - فخرالدین صاحب کا تدلل رحمٰن صاحب کی دلائل سے ملتا جلتا ہے - مگر ان کے مضمون میں بہت سی قرآنی آیات اور احادیث کا حوالہ دیا گیا ہے اور لا اکراہ کی آیت پر خاص طور پر انحصار کیا گیا ہے - سب سے اہم بات ان کے مضمون میں اس حدیث کو غلط ثابت کرنا ہے جو بخاری اور مسلم ایک یہودی کے متعلق بیان کرتے ہیں - حدیث اس طرح پر ہے کہ ایک یہودی نے مذہب اسلام قبول کیا مگر بعد میں وہ پھر اپنے مذہب میں داخل ہو گیا - ابو موسےٰ یمن کے گورنر تھے پھر ان کی جگہ معاض کو مقرر کیا گیا - جب معاض یمن پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ ایک شخص ابو موسیٰ کے مکان پر بندھا پڑا ہے - ابو موسےٰ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ شخص پہلے یہودی تھا پھر مسلمان ہو گیا اور اب پھر یہودیت کی طرف رجوع کر گیا ہے - یہ سن کر معاض نے کہا کہ جب تک اس شخص کو قتل نہیں کیا جاتا میں کھانے پر نہیں بیٹھوں گا - کیونکہ اللہ اور رسول کا یہی حکم ہے - اس پر اس شخص کو قتل کر دیا گیا - ارتداد کے لیے سزائے موت کے متعلق جو کچھ کتابوں میں لکھا گیا ہے اس کے لیے اسی حدیث پر انحصار کیا گیا ہے - مگر فخرالدین صاحب نے دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے - کہ یہ حدیث قابل اعتبار نہیں - انہوں نے بخاری کی اُس حدیث کو بھی ناقابل اعتبار سمجھا ہے - جس کے مطابق حضرت علیؓ نے کچھ زنادیق کو زندہ جلانے کا حکم دیا تھا - صاحب موصوف اپنے مضمون کو اس نتیجہ پر ختم کرتے ہیں کہ صرف اسلامی عقیدہ کی تبدیلی کے لیے قرآن اور سنّت میں کسی شخص پر پابندی نہیں -

اِرتداد کا مسئلہ اس احقر کے سامنے بطور صدر تحقیقاتی کمیٹی پیش ہوا تھا جس میں ۱۹۵۳ء کے فسادات پنجاب کی ذمّہ داری کا تعین کرنا تھا - علماء مسلمان کی تعریف پر متفق نہ تھے - ہر فرقہ دوسرے فرقہ کو کافر سمجھتا تھا - شیعہ، سنّی، اہل حدیث، اہل قرآن، دیوبندی، بریلوی اور احمدی ایک دوسرے کو کافر کہتے تھے - تکفیر کے اس شوق نے اسلام کو بہت نقصان پہنچایا ہے اور اسلامی اتحاد اور یگانگت پر ایک کاری ضرب لگائی ہے - بلکہ فرقہ بندی مسلمانوں کے انحطاط کے اسباب میں ایک بڑا سبب ثابت ہوئی ہے - تحقیقات کے دوران علماء قریباً متفق تھے کہ اسلام میں مُرتد کی سزا موت ہے اور اس

سلسلہ میں ایک رسالہ الشہاب کا بھی ذکر آیا تھا جس کے مصنف مولینا شبیر احمد عثمانی تھے جو شیخ الاسلام کہلاتے تھے۔ اس رسالہ میں بھی مرتد کے لیے سزائے موت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ غالباً ایک اسی طرح کا رسالہ مولینا مودودی نے بھی سپرد قلم کیا تھا۔ جس میں مولینا شبیر احمد کی رائے سے اتفاق کیا گیا تھا۔ میں نے اس بحث کو مندرجہ ذیل الفاظ پر ختم کیا تھا۔

"اس کے برعکس ان ہر دو خیالات میں سے ہر ایک خیال، ایک وہ جو سورۃ الکفرون کی چھ چھوٹی چھوٹی آیات میں مضمر ہے (۱۰۹/ ۱تا۶) اور دوسرا وہ جو دوسری سورۃ کی لا اکراہ آیت میں ہے (۲/ ۲۵۶)۔ اس نظریہ کو رد کرنے کے لیے کافی ہیں جو اشہاب میں مشتہر کیا گیا ہے۔ سورۃ الکافرون جو صرف ۳۰ الفاظ پر مشتمل ہے اور جس کی کوئی آیت ۷ لفظوں سے زیادہ نہیں انسانی خصلت کے اس پہلو کو ظاہر کرتی ہے جو انسان کی فطرت میں بالغ العقلی سے ہی ظاہر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور لا اکراہ کی آیت جس کے متعلقہ حصہ میں صرف ۹ الفاظ ہیں۔ انسانی دماغ کی ذمہ داری کو ایسی فصاحت سے بیان کرتی ہے کہ کوئی اور الفاظ اس ذمہ داری کو بیان نہیں کر سکتے۔ یہ دونوں آیات جن میں سے ایک مکہ میں وحی کے آغاز میں اور دوسری ہجرت کے بعد نازل ہوئیں فرداً فرداً اور مجموعی طور پر اس اصول کی بنیاد ہیں جو کہ انسانی معاشرہ صدیوں کی کشمکش، تنازعات، نفرت اور خونریزی کے بعد انسان کے ایک بنیادی حق کو حال ہی میں تسلیم کرنے کے قابل ہوا ہے اور یہ بنیادی حق آزادیٔ مذہب ہے۔ مگر پھر بھی ہم میں ایسے علماء اب تک موجود ہیں جو غلبۂ اسلام کے لیے تیغ زنی ایک ضروری ذریعہ خیال کرتے ہیں۔"

عدل

اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے (۵/ ۴۲) اور اللہ کے بہت سے ناموں میں سے حدیث کے مطابق ایک نام 'عادل' ہے۔ اس لیے انصاف کرنا مسلمان کا مذہبی فرض ہے اور اسلامی حکومت میں انصاف طلب کرنا ہر ایک مسلم اور غیر مسلم کا حق ہے۔ بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ انصاف اور احسان اسلام کی امتیازی صفات ہیں اور تعبدیت میں شامل ہیں۔ اسلام سے پہلے یہ صورت نہیں تھی۔ نہ ہی ہر فرد بذاتِ خود انصاف کا طلبگار ہو سکتا تھا اور جو شخص کرسیٔ انصاف پر متمکن ہو اس بات کا پابند نہیں تھا کہ سب کے ساتھ وہ یکساں انصاف کرے کیونکہ کئی ایک طبقے اور افراد مساوی انصاف کے حقدار نہیں سمجھے جاتے تھے۔ قانون کے کئی ضوابط میں انصاف کا معیار جسمانی ایذا پہنچا کر سچ جھوٹ کا پرکھنا ہوتا تھا مثلاً آگ، ابلتا ہوا پانی، زہر خورانی، دست بدست لڑائی کا نتیجہ جس میں ہتھیار بھی استعمال

کیے جاسکتے تھے، یہ سب ذرائع جرم یا بیگناہی کے دریافت کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ انگلستان میں مدعی اور مدعا علیہ میں لڑائی کے ذریعہ جرم یا بیگناہی ثابت کرنے کا طریقہ ۱۸۱۸ء تک جاری رہا۔ دوسرا طریقۂ انصاف قاتل کو یا اس کے کسی عزیز کو مقتول کے بدلے میں قتل کر دینا تھا اور کارسیدکا میں ۳۰ سال کے عرصہ میں ۲۸۰۰۰ آدمی قتل کے بدلے میں مارے گئے[1]۔ (نیشنل جیوگرافک ستمبر ۱۹۷۳ء)

قانون کے سامنے سب کی برابری اب ایک بنیادی اصول ہے۔ مگر دنیا کے دوسرے حصوں میں خاص طور پر امریکہ میں، یہ اصول اٹھارہویں صدی کے آخر میں تسلیم کیا گیا۔ موجودہ قانون کے مطابق جج کو اپنا عہدہ سنبھالنے سے پہلے حلف اٹھانا پڑتا ہے کہ وہ قانون کے مطابق بلا رورعایت، ذاتی دشمنی یا غرض کے انصاف کرے گا۔ مگر دیکھیے قریباً تیرہ صدیوں پہلے قرآن نے اسی معاملہ میں کیا حکم دیا۔

"اے لوگو! جو ایمان رکھتے ہو انصاف کی حمایت میں مصمم ارادہ کر لو خواہ فیصلہ آپ کے یا آپ کے عزیزوں یا والدین کے خلاف ہی ہوتا ہو اور تصفیہ طلب معاملہ خواہ کسی دولتمند آدمی سے تعلق رکھتا ہو یا کسی غریب آدمی سے۔ کیونکہ اللہ ہر دو کے نزدیک ہے۔ اس لیے منصف کو کسی جذبہ سے اس طرح پر متاثر نہ ہونا چاہیئے کہ وہ سچائی سے بھٹک جائے۔ اور اگر آپ راہِ راست سے بھٹکے تو یقیناً اللہ خبر رکھتا ہے کہ تم کیا کر رہے ہو۔"

(۴/۱۳۵ - ۳۸/۲۶)

ایک دوسری جگہ پر حکم ہے کہ:

"کسی دوسرے کی دشمنی تم کو بے انصافی پر آمادہ نہ کر دے۔ ہمیشہ منصف مزاج رہو کیونکہ انصاف ایک قسم کا تقویٰ ہے اور اللہ سے ڈرو۔ کیونکہ وہ آپ کے کیے سے باخبر رہتا ہے (۵/۸)۔"

انصاف کے متعلق قرآن میں اور بھی کئی آیات ہیں۔ ملاحظہ ہوں:-

۱۔ اور جب تم بنی نوع انسان کے معاملے طے کرو تو انصاف سے کرو۔ (۴/۵۸ - ۵/۴۲)
الفاظ 'بین الناس' پر غور کرو۔ صرف مسلمانوں میں آپ نے انصاف نہیں کرنا بلکہ لوگوں کی ہر جماعت کے ساتھ۔

۲۔ کہو کہ میرا رب انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے۔ (۷/۲۹)

۳۔ اے داؤد ہم نے آپ کو زمین پر نائب اور مختار مقرر کیا ہے تاکہ تم انسانوں کے درمیان

---

[1] NATIONAL GEOGRAPHIC ، SEPT : 1973

تنازعات کا فیصلہ انصاف سے کرو اور گھمنڈ میں آ کر اپنی خواہشات پر عمل نہ کرو مبادا کہ تم اللہ کے راستے سے ہٹ جاؤ۔ (۳۸/۲۶)

۴۔ اپنی دولت کو ججوں کو غلط راستے پر مائل کرنے کے لیے استعمال نہ کرو۔ اور نہ اس غرض سے کہ تم دانستہ طور پر دوسروں کی جائداد کے حصہ کو غلط طور پر نگل جاؤ (۲/۱۸۸)۔

۵۔ اور جب تم بات کرو تو انصاف کو مدنظر رکھو خواہ ایسی بات آپ کے کسی عزیز کے متعلق ہی ہو (۶/۱۵۲)۔

۶۔ جو کتاب اللہ نے بذریعہ وحی نازل کی ہے میرا اس پر ایمان ہے اور وہ مجھے انصاف کرنے کی تاکید کرتی ہے (۴۲/۱۵)۔

۷۔ تمام اجناس انصاف سے تولو۔ ترازو کی ڈنڈی مت مارو (۵۵/۷-۹)۔

عدل۔ خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں اور اس کے بعد

خلیفہ اوّل کے احساسِ انصاف کو دیکھیے۔ آپ نے اپنے پہلے ہی خطبہ میں اپنے آپ پر یہ فرض عائد کیا۔ کہ وہ صاحب رسوخ لوگوں سے وہ جائداد واپس لیں گے جو کہ انہوں نے غلط طور پر چھینی ہے۔ اور غریب لوگوں کو وہ جائداد جو ان کا حق ہے واپس دلائیں گے۔ مزید فرمایا کہ آپ قانون کے پابند ہیں اور اگر وہ قانون سے اِدھر اُدھر ہو جائیں تو لوگوں پر ان کی اطاعت لازمی نہ ہوگی۔ جب خلیفہ ثانی نے ابو موسےٰ کو جج مقرر کیا تو آپ نے ان کو ایک خط لکھا۔ جس میں چند بنیادی ہدایات تھیں جن کا قانون سے تعلق تھا۔ ہدایات یہ تھیں :۔

۱۔ اپنی عدالت میں سب لوگوں سے برابر کا سلوک کرو۔ اور ان کو اپنی توجہ کا برابر مستحق سمجھو تاکہ امراء آپ کو اپنا جانبدار نہ سمجھیں اور غریب لوگ آپ کے انصاف سے مایوس نہ ہوں۔ اگر کل آپ نے فیصلہ دیا اور آج اس پر غور کرنے کے بعد آپ اس کو غلط سمجھتے ہیں۔ تو آپ کو اپنا پہلا فیصلہ واپس لینے میں تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ انصاف ازلی ہے اور اپنی غلطی پر مصر رہنے کی بجائے سابقہ فیصلہ کو واپس لینا بہتر ہے۔

۲۔ اگر کوئی شخص دعویٰ کرتا ہے جو وہ ثابت نہیں کر سکتا تو اس کو مہلت دو۔ اگر وہ میعاد مقررہ کے اندر ثبوت بہم پہنچا دے تو اس کے دعویٰ کو تسلیم کرو۔ ورنہ آپ کو اجازت ہے کہ اس کا دعویٰ خارج کر دو۔

۳۔ اس بات کا خیال رکھو کہ اہل مقدمہ تھک نہ جائیں۔ یا ان کو کوئی اور تکلیف پہنچے۔ عدالتوں میں انصاف قائم کرو۔ اس کے عوض خدا آپ کو انعام کثیر دے گا۔ اور آپ کی شہرت میں

بھی اضافہ ہوگا۔

کیا یہ فرمودات تیرہ سو سال پرانے معلوم ہوتے ہیں ۔ کیا آجکل کی مہذّب دنیا کے قوانین کا ان اصولوں کو حِصّہ سمجھ کر ان پر ناز نہیں کیا جاتا۔ دیگر الفاظ میں ان ہدایات کا یہ مطلب ہے کہ قوانین کے اطلاق میں امیر غریب کی تمیز نہ کرو ۔ کیونکہ قانون کی نظر میں سب لوگ یکساں ہیں اور قانون کی محافظت کے سب لوگ یکساں حقدار ہیں ۔ انصاف کے نظام میں غلطی مت کرو ۔ اگر آپ کو یہ باور کرنے کی وجوہ موجود ہوں کہ آپ کسی فیصلہ میں غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں تو غلطی کا خود بخود ازالہ کرو۔ ہر فریق مقدمہ کا حق ہے کہ وہ اپنا دعوےٰ بذریعہ شہادت ثابت کرے ۔ اہل مقدمہ کو عدالت میں سہولتیں فراہم کرو۔ اس لیے دھیان رکھو کہ جب وہ انصاف کے طلبگار ہو کر آئیں تو ان کو کوئی تکلیف یا بے آرامی نہ ہو۔ قانون کے صحیح انتظام کا انعام اللہ ہی دے سکتا ہے ۔ اگرچہ انصاف کرنے میں آپ کی بھی نیکنامی ہوگی ۔

۱- حضرت عمرؓ نے، جب وہ بار خلافت اپنے کندھوں پر اٹھا چکے تھے، ایک گھوڑا بشرطِ پسند خریدا اور ایک شخص کو کہا کہ اس کو دوڑا کر اس کی آزمائش کرے ۔ گھوڑا دوڑ میں زخمی ہو گیا اور حضرت عمرؓ نے سودا فسخ کرنا چاہا ۔ مگر مالک نے سودا فسخ کرنے سے انکار کیا ۔ معاملہ عدالت میں پہنچا عدالت نے فیصلہ دیا کہ چونکہ گھوڑا مالک کی مرضی کے بغیر دوڑایا گیا اس واسطے نقصان کی ذمّہ داری حضرت عمرؓ پر عائد ہوتی ہے اور ان کو گھوڑا خریدنا پڑے گا۔ حضرت اس فیصلہ سے اِتنے متاثر ہوئے کہ آپؓ نے جج کو مشہور شہر کوفہ کا قاضی مقرر کر دیا ۔

۲- حضرت عمرؓ اور ایک یہودی اپنا تنازعہ ایک جج کے پاس لے کر گئے ۔ خلیفہ کے اعلیٰ مرتبہ کی تعظیم میں جج اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہُوئے ۔ اس فعل کی وجہ سے جج کو اس کے عہدے سے علیحدہ کر دیا گیا ۔ کیا آپ اس اصول کی کہ قانون کی نظر میں سب افراد یکساں ہیں ۔ بہتر مثال پیش کر سکتے ہیں ۔ ایک طرف خلیفۃ الوقت اور دوسری طرف یہودی اور جج کو اس وجہ سے اپنے عہدے سے علیحدہ کر دیا گیا ۔ کہ جج کے خلیفۂ وقت کی تعظیم کے لیے اُٹھنے سے یہودی کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہو جائے کہ انصاف کے معاملہ میں خلیفہ اور یہودی میں امتیاز برتا جا رہا ہے۔ کیونکہ اسلام میں خلیفہ، غلام اور غیر مسلم، جہاں تک انصاف کا تعلّق ہے، برابر ہیں ۔

۳- رسول اللہ کی وفات پر آپ کی بیٹی سیدہ فاطمہؓ نے ایک جائداد کا، جو فدک کے نام سے مشہور تھی، بطور وارث دعوےٰ کیا ۔ تنازعہ حضرت ابوبکرؓ خلیفۃ الوقت کے پیش ہوا ۔ سیدہ فاطمہؓ کا دعویٰ اس بنا پر مسترد کیا گیا ۔ کہ جو شے اللہ نے دوسروں سے لے کر اپنے رسول کو بخش دی ہے ۔ وہ شے خدا، اس کے رسول، رسول کے عزیزوں، یتیموں، محتاجوں اور مسافروں

کے لیے ہے۔ یعنی ایسی جائداد مستحق لوگوں کے لیے وقف ہے خواہ وہ جائداد جنگ میں بذریعہ فتح ہی حاصل کی گئی ہو۔ حضرت عمرؓ کے پاس اس فیصلہ کے خلاف نظرثانی کی درخواست ہوئی مگر آپ نے اپنے پیشرو سے اتفاق کرتے ہوئے درخواست نظرثانی کو خارج کر دیا۔

۴۔ پھر ایک مشہور تنازعہ زرہ بکتر کا ہے۔ یہ زرہ بکتر ایک یہودی کے قبضہ میں تھی اور وہ اس کا دعویدار بنتا تھا۔ حضرت علی جو اس وقت خلیفہ تھے اس زرہ بکتر کا دعویٰ اس بنا پر کرتے تھے۔ کہ انہوں نے یہ زرہ بکتر نہ کسی کے پاس فروخت کی ہے اور نہ کسی کو دی ہے بلکہ یہ صفین کے راستے میں کسی طرح گم ہو گئی تھی۔ جج نے خلیفہ کو ثبوت بہم پہنچانے کی ہدایت کی۔ خلیفہ نے کہا کہ آپ کا گواہ آپ کا پسر حسن ہے۔ جج نے فیصلہ دیا کہ بیٹے کی شہادت باپ کے حق میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتی اور حضرت علیؓ کا دعویٰ خارج کر دیا۔ اس فیصلہ سے یہودی ایسا متاثر ہوا کہ وہ مسلمان ہو گیا اور اقبال کیا کہ زرہ بکتر حضرت علیؓ ہی کی تھی۔

۵۔ حضرت عمرؓ کی خلافت میں ایک عورت نے شکایت کی کہ حضرت عمرؓ کے پسر ابوشہامانے شراب سے بدمست ہو کر اس سے زنا بالجبر کیا ہے۔ اس عورت کی شکایت کو سچا سمجھتے ہوئے حضرت نے حکم دیا کہ ملزم کو اتنے کوڑے مارے جائیں جو قانون نے اس جرم کے لیے مقرر کیے ہیں ابوشہامانے کوڑے لگنے کے درمیان ہی جان دیدی۔ مگر کوڑوں کی مقررہ تعداد ابھی پوری نہ ہوئی تھی۔ کوڑوں کی ضربات جاری رکھنے کا حکم ہوا تاوقتیکہ ان کی تعداد پوری نہ ہو جائے اس روایت کے راوی ابن عباس ہیں اور اس روایت کو ابن عباس نے بطور عینی شاہد حضرت مجاہد کے پاس بیان کیا (نوائے وقت مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۷۳ء) احقر کو یہ روایت کسی اور جگہ نہیں ملی۔ اور اس روایت پر تین بڑے اعتراض ہیں۔

اوّل یہ کہ یہ بات قابل یقین نظر نہیں آتی کہ حضرت عمرؓ جیسے زاہد کے گھر میں پرورش اور تربیت پا کر ان کے پسر نے ایسی قبیح حرکت کا ارتکاب کیا ہو۔

دوم کہ حضرت عمرؓ نے بغیر اس شہادت کے جو شرع نے ایسے جرم کے ثبوت کے لیے مقرر کی ہے ابوشہاما کو مجرم قرار دے دیا ہو۔

سوم حضرت عمرؓ ہمیشہ قرآنی آیات اور حدیث کے نص کی وجہ دریافت کرتے تھے اور جب مجرم کوڑوں کی ضربات کے درمیان جان دے چکا ہو۔ تو پھر کوڑوں کی ضربات جاری رکھنا لاحاصل ہو جاتا ہے۔

اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو اس سے اس چوری کے واقعہ کی یاد تازہ ہوتی ہے جو ایک قریش عورت نے کی تھی۔ اس عورت کے لیے چند صحابہ نے رسول اللہ کے پاس رحم فرمانے کی

التجا کی تھی ۔ مگر رسول اللہ نے فرمایا ۔
"اگر یہ جرم میری بیٹی فاطمہ سے بھی سرزد ہوا ہوتا تو اس کو بھی قرآن کی مقررہ سزا دی جاتی"۔
یہ ہر دو واقعات قانون کی عملداری اور قانون کے سامنے سب افراد کی برابری کی درخشندہ مثالیں ہیں ۔

۶ ۔ قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ فتح خیبر کے بعد یہودیوں کو اجازت تھی کہ وہ اپنی زمینیں اپنے قبضہ میں رکھیں، اپنے مذہب پر قائم رہیں اور اپنی مذہبی رسوم جاری رکھیں بشرطیکہ وہ اپنی پیداوار کا نصف حصہ حکومت کے حوالے کریں ۔ ایک دفعہ جب عبداللہ بن رواحا پیداوار میں سے حکومت کا حصہ وصول کرنے کے لیے خیبر گئے تو ان کے منہ سے یہ لفظ نکل گئے ۔
"مجھے پیداوار کا حصہ لینے کے لیے ایک ایسی ہستی نے بھیجا ہے جو مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے ۔ مگر میں آپ لوگوں سے ایسی نفرت کرتا ہوں جیسے بندروں اور سؤروں سے"۔
یہ بات سن کر چند یہودی عورتیں جو موجود تھیں کہنے لگیں کہ اگر یہ بات ٹھیک ہے تو تم ہم یہودیوں سے کیسے انصاف کرو گے ۔ عبداللہ کا جواب تھا ۔
"میری محبت اور نفرت مجھے انصاف کے راستے سے نہیں بھٹکا سکتی"۔ چنانچہ پیداوار تقسیم ہوئی اور اور اس کا جو بہتر حصہ تھا یہودیوں کو دیا گیا ۔ مقابلہ کیجیے اس پیداوار کے تقسیم کرنے والے کے احساس انصاف کا اس حلف کے ساتھ جو عدالت ہائے عالیہ کے جج دورِ حاضر میں اٹھاتے ہیں یعنی یہ حلف کہ میں سب لوگوں کے ساتھ انصاف کروں گا اور انصاف کرنے میں کسی خوف، رعایت، محبت اور نفرت کو اپنے اور انصاف کے درمیان حائل نہ ہونے دوں گا ۔ کیا آپ عبداللہ کے الفاظ اور موجودہ زمانہ کی اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کے حلف میں کوئی فرق پاتے ہیں ؟

خلفائے عباسیہ

نظام انصاف میں خلفائے عباسیہ نے چند تبدیلیاں کی تھیں ۔ مگر قابلِ غور یہ امر ہے کہ چند خلفاء مثلاً المہدی، الہادی، الرشید اور المامون مقدمات کی سماعت خود کرتے تھے ۔ یا عدالت ہائے ماتحت کے فیصلوں کے خلاف اپیل خود سنتے تھے ۔ خلیفہ المقتدر کی والدہ عدالت مرافعہ کی خود صدر تھیں اور اپیلوں کی سماعت کرتی تھیں ۔
وکیل مقرر کرنے کا رواج بھی عہد عباسیہ میں ہوا ۔ خلیفہ المامون کے عہد میں ایک عورت نے شکایت کی کہ المامون کے پسر نے اس کی جائداد چھین لی ہے ۔ سماعت مقدمہ کے درمیان ملزم

لڑکا اپنے باپ کے پاس کھڑا تھا، اس کو حکم ہوا۔ کہ وہ عورت کے ساتھ بیٹھے اور ایک منشی کو ہدایت ہوئی کہ وہ فریقین کے بیان لکھے۔ اس کے بعد خلیفہ نے عارضی طور پر جائداد کی واپسی کا حکم صادر کیا مگر مقدمہ بغرض سماعت اس بنا پر کہ باپ کوئی ایسا مقدمہ نہیں سن سکتا جس کا تعلق اس کے بیٹے سے ہو ایک اور حاکم کے سپرد کر دیا۔ اس مقدمہ سے زمانہ حاضرہ کے دو بنیادی اصول اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

اوّلاً کہ کوئی جج اپنا مقدمہ یا ایسا مقدمہ جس میں اس کو ذاتی دلچسپی ہو، نہیں سن سکتا۔

دوم کہ انصاف ہونا ہی نہیں چاہیئے بلکہ عوام دیکھ سکیں کہ انصاف کیا بھی جا رہا ہے۔

ہسپانیہ

غرناطہ میں یونیورسٹیوں کے حاکم اعلیٰ اور ہر کالج کے دروازہ پر یہ کتبہ آویزاں ہوتا تھا۔

"دنیا کو چار چیزوں نے سنبھال رکھا ہے یعنی (۱) دانشوروں کے علم نے (۲) بڑے عہدیداروں کے انصاف نے (۳) نیک بندوں کی دعاؤں نے اور بہادروں کی شجاعت نے۔"

ہسپانیہ کے مسلمانوں کے زمانہ میں بھی بے شمار انصاف کی مثالیں ملتی ہیں۔

۱۔ ایک شخص نے وزیر اعظم منصور کے ڈھال بردار پر خلاف ورزی معاہدہ کی بنا پر دعوےٰ کیا۔ ڈھال بردار وزیر اعظم کا ملازم ہونے کی وجہ سے حاضر عدالت نہ ہوا حالانکہ قاضی عبدالرحمٰن کی طرف سے اس کی طلبی ہو چکی تھی۔ مدعی نے مدعا علیہ کے اس رویہ کی منصور سے شکایت کی جس نے پولس کو حکم دیا کہ فریقین کو قاضی کے پاس لے جائے۔ فیصلہ مدعی کے حق میں ہوا اور وہ وزیر اعظم کے پاس شکریہ ادا کرنے کے لیے گیا۔ منصور نے کہا آپ کو اپنا حق ملا ہے اس میں شکریے کی کیا بات ہے۔

۲۔ ایک دفعہ ایک افریقی النسل وزیر کے سامنے پیش ہوا اور اس کے منتظم کی شکایت کی۔ معاملہ عدالت میں گیا۔ منتظم حاضر عدالت نہ ہوا جس پر وزیر نے اس کو گرفتار کر کے قاضی کے پاس بھیج دیا اور اسے حکم دیا کہ جواب دعویٰ پیش کیا جائے۔ قاضی نے فیصلہ دیا کہ افریقی النسل شخص کا دعویٰ درست ہے۔ وزیر نے منتظم کو فوراً برخاست کر دیا۔

۳۔ ایک اور مقدمے میں عدالت اپیل کے صدر اور ایک شاعر رمضی کے خلاف شکایت ہوئی کہ ان دونوں نے خلیفہ کو ہلاک کرنے کی سازش کی ہے۔ تاکہ عبدالرحمٰن کی تخت نشینی کے لیے راستہ صاف ہو جائے اور ایک مخنث جوہر کو یہ کام انجام دینے پر مقرر کیا ہے۔ سازش ظاہر ہو گئی اور ان تینوں اور عبدالرحمٰن کو کونسل کے سامنے سماعت مقدمہ کے لیے پیش کیا گیا۔ جرم ثابت ہو گیا۔ صدر اور عبدالرحمٰن کو سزائے موت دی گئی۔ مخنث کو صلیب پر چڑھایا گیا اور شاعر کو

جلاوطن کر دیا گیا۔

سلاطین عثمانیہ

سلاطین عثمانیہ نے کچھ عدالتیں دینوی امور کے تنازعات کی سماعت کے لیے قائم کی تھیں اور ان کے فرائض بھی مخصوص کر دیے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک مفتی کی کارکردگی جن کا نام جمالی تھا قابل ذکر ہے سلطان نے ۱۵۰ اہلکاران خزانہ کو مجرم پاکر سزائے موت کا حکم دیا تھا۔ مفتی صاحب کی رائے میں یہ فیصلہ غلط تھا۔ انہوں نے سلطان کو مخاطب کر کے کہا کہ میرا ایک فرض آپ کو عذابِ آخرت سے بچانے کی کوشش کرنا ہے اور یہ فیصلہ آپ کی آخرت کو خطرے میں ڈالتا ہے۔ اس لیے ملزمان کو رہا کر دینا چاہیئے۔ سلطان نے اس تجویز کو کلی طور پر منظور کر کے سب ملزمان کو رہا کر دیا۔ انہی مفتی صاحب نے ایک اور موقع پر ۴۰۰ سوداگران کی جان بچائی۔ جن کو فارس کے ساتھ خلافِ قانون تجارت کرنے کے لیے سزائے موت دی گئی تھی۔ ایک سلطان نے جس کا نام سلیمان تھا مگر وہ قانونی کہلاتا تھا۔ ایک دفعہ مفتی ابوسعود سے کہا کہ وہ فتویٰ صادر کر دیں کہ مفتوحہ ملکوں کے غیر مسلموں کا قتل جائز ہے۔ مگر اس نڈر مفتی نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ علامہ اقبال اپنی ایک نظم میں آدینہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس شہر میں مسلمانوں نے غیر مسلموں کی جائداد لوٹنا شروع کر دی تھی مگر مفتیٔ شہر نے فتویٰ صادر کر دیا کہ ایسی لوٹ خلافِ شرع ہے۔ اِس کا نتیجہ وُہ ہُوا جو علاّمہ اِس شعر میں بیان کرتے ہیں۔

'چھوتی نہ تھی یہود و نصاریٰ کا مال فوج
فتویٰ یہ سارے شہر میں مشہور ہو گیا'

ایک شاعر جس کا نام نامک کمال تھا۔ ترکی کے آخری مطلق العنان سلطان عبد الحمید سے مخاصمت رکھتا تھا۔ اس پر غداری کا مقدمہ چلا۔ مگر اُس وقت کے جج عبد اللطیف پاشا نے 'جو اپنی دیانتداری اور غیر جانبداری میں مشہور تھا' نامک کمال کو بَری کر دیا۔ سلطان نے جج کے فیصلہ کو سراہا اور اسے اپنا وزیر اعظم مقرر کر دیا[1]۔

دَورِ فاطمیہ

دورِ فاطمیہ میں ایک سوداگر نے خلیفہ الحاکم کے خلاف ہرجانے کا دعوےٰ کیا۔ بنائے دعویٰ یہ تھی کہ افسرانِ حکومت نے مدعی کے باغ کو تباہ کر دیا ہے۔ خلیفہ بذاتِ خود عدالت میں پہنچے

---

[1] GLORIOUS ROLE OF ISLAM BY NUR AHMAD P.233

قاضی صاحب خلیفہ کی تعظیم میں اپنی جگہ سے نہ اُٹھے۔ خلیفہ کا عذر تھا کہ باغ اس لیے اجاڑا گیا ہے کہ اس کے پھل سے شراب بنتی ہے۔ جو فعل شرعاً ممنوع ہے۔ ہاں اگر سوداگر قسم کھا کر کہدے کہ اس باغ کے پھل سے شراب بنانے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا تو اس کو معاوضہ ادا کر دیا جائے گا۔ سوداگر نے حلف اٹھالیا اور اس کو معاوضہ ادا کر دیا گیا۔ اس مقدمے کے فیصلے سے یہ اصول وضع ہوتا ہے کہ حکومت اپنے اہلکاران کے خلاف قانون افعال کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ بشرطیکہ ان کا فعل ان کے دائرۂ فرائضِ منصبی میں شامل ہو۔ دَورِ فاطمیہ کے ایک اور دلچسپ مقدمے کی تفصیل یہ ہے۔ چند سوداگران نے اپنا مال اسکندریہ کی بندرگاہ پر ایک جہاز میں قسطنطنیہ لے جانے کے لیے لادا۔ راستے میں جہاز طوفان میں پھنس گیا اور اس کو طوفان سے نکالنے کے لیے جہاز کے کپتان نے مال کو سمندر میں پھینک دیا۔ قسطنطنیہ پہنچنے پر سوداگروں نے مال کی قیمت کا مطالبہ کیا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ کپتان مال کی قیمت ادا کرنے کا اس حد تک ذمہ دار ہے جس حد تک سوداگر اپنے مال کی قیمت کا ثبوت دے سکیں۔ مگر سوداگران کا دعویٰ اس وجہ سے خارج کر دیا گیا کہ وہ مال کی قیمت کا ثبوت دینے سے قاصر رہے تھے۔ اس فیصلے سے یہ اصول قائم ہوتا ہے کہ ڈگری حاصل کرنے کے لیے بارِ ثبوت مدعی پر ہے۔

ہندوستان

برصغیر ہندوستان پر مسلمانوں نے قریباً سات سو سال حکومت کی۔ اس دوران میں حکومت ایک خاندان تک محدود نہیں رہی۔ انگریزی راج سے پہلے خاندان مغلیہ کی حکومت تھی مگر اس سے پہلے کئی ایک مسلمان خاندان ملک کے مختلف حصّوں پر حکومت کرتے آئے تھے۔ خلجی، تغلق، غلام، سوری اور لودھی مختلف وقتوں پر اس ملک کے حکمران رہے۔ شیر شاہ سوری کا قول ہے۔ کہ ہر ایک انتظامیہ کا استحکام انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔ اس نے عہد کیا کہ وہ کبھی بے انصافی کا مرتکب نہیں ہوگا۔ خواہ انصاف کی خلاف ورزی غربا پر ظلم کی شکل میں ہو۔ یا امراء کے طبقے کو قانون کی خلاف ورزی کرنے کی اجازت کی شکل میں۔ وہ اپنے عہد پر زندگی بھر قائم رہا۔ آخری حکمران خاندان مغلوں کا تھا جس نے اکبر، جہانگیر، اور اورنگ زیب جیسے انصاف پسند بادشاہ پیدا کیے عدل جہانگیری کو ضرب المثل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

مغلوں کے عہد میں بھی کچھ خود مختار حکمران مختلف علاقوں میں اپنی حکومت چلا رہے تھے۔ اس سات سو سال کے عرصہ میں کوئی دیانتدار مورخ ایسا واقعہ بیان نہیں کرتا جس سے کسی مسلمان حکمران کی تنگدلی تعصب اور غیر مسلموں کے ساتھ بے انصافی ثابت ہو۔ سیاسی معاملات کی نوعیت مختلف ہوتی ہے اور سیاسیات میں اوّل تو انصاف ضروری عنصر نہیں ہوتا۔ اگر ہو بھی تو یہ عام انصاف سے

مختلف ہوتا ہے۔ سکھوں، مرہٹوں، اور راجپوتوں سے مسلمان حکومتیں اکثر برسرِپیکار رہیں۔ مگر ان سب لڑائیوں کا باعث سیاسی تنازعات تھے۔ قانون کے سامنے سب کی برابری کی دو مثالیں قابلِ ذکر ہیں۔ شہنشاہ عالمگیر کے زمانہ میں خود شہنشاہ کے بیٹے مرزا کام بخش پر قتل کا الزام لگا۔ تحقیقات کے دوران کوکا نے مداخلت کر کے شہزادہ کو سزا سے بچانے کی کوشش کی۔ شہنشاہ نے دونوں کی گرفتاری کا حکم دیا اور آزادانہ تفتیش جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ قطع یدین کی مذہبی سزا ان مجرموں پر سے، جو پہلی دفعہ سرقہ کے مرتکب ہوں یا سرقہ کے چھوٹے چھوٹے جرائم جو ان سے دوران قحط سرزد ہوئے ہوں، اٹھا لی گئی۔ اور اس سزا کو سزائے قید میں تبدیل کر دیا گیا۔ شہنشاہ عالمگیر ذاتی طور پر شرع کی سختی سے پابند تھا۔ متقی اور پرہیزگار تھا۔ شاعری کو وہ فضولیات میں شامل کرتا تھا۔ واقعات نے اس کو لڑائیوں اور سیاست میں پھنسا رکھا اور اس کی اکثر عمر دکن میں لڑائیوں کی مصروفیت میں گزری۔ تاہم اس کے انصاف میں سرِمو فرق نہ آیا۔ ہندو صاحبان اس عظیم شہنشاہ کو تعصب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور اس پر من گھڑت افسانے تھوپتے ہیں مولانا شبلی موجودہ نسل کو، جو ان چھوٹے افسانوں سے متاثر ہوئی ہے، خطاب کر کے طنزاً کہتے ہیں۔

تمہیں لے دے کے ساری داستاں سے یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

مگر تعجب کی بات ہے کہ عالمگیر کا ایک غیر جانبدار موازنہ بھی ایک ہندو (سر جادو ناتھ سرکار) کی قلم کی پیداوار ہے۔

کچھ شعرا اور افسانہ نویس جہانگیر کے انصاف کی ایک خاص مثال بیان کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن جہانگیر کی چہیتی ملکہ نور جہاں محل کی چھت پر سیر کر رہی تھی محل کے اس حصہ کے نزدیک آنا حکم شاہی سے منع تھا۔ مگر ایک بدقسمت راہ گیر کی جو محل کے پاس سے گزر رہا تھا ملکہ پر نظر پڑ گئی۔ ملکہ نے طمنچہ سے اس شخص کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ جہانگیر کے حکم سے ملکہ ماخوذ ہوئیں اور ان پر مقدمہ چلا۔ قاضی نے فتویٰ دیا ''شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑا دو گردن'' چنانچہ ملکہ کے لیے سزائے موت تجویز ہوئی۔ مگر متوفی کے وارثوں نے قصاص وصول کر کے اس کو سزا سے بچا لیا۔ مولانا شبلی نے اس واقعہ کو نظم کیا ہے۔ مگر تزک جہانگیری اور مرزا محمد کے اقبال نامہ جہانگیری میں یہ واقعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ آخر الذکر کتاب عہد جہانگیری میں لکھی گئی تھی۔ مسلمانوں کی حکمرانی کے دور میں مندرجہ بالا مثالیں مختلف ممالک سے لے گئی ہیں۔ اور ان سے جو مشترکہ اصول اخذ ہوتے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ کہ مسلمانوں کے عہد میں انصاف کرنے میں قانون کی عملداری اور قانون کے سامنے سب کی برابری دو مسلّمہ خصوصیات ہیں اور ان ہر دو اصولوں پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔ اور قاضی یا حاکم بلا کسی رو رعایت اور بغیر کسی قسم کے خوف یا دباؤ کے اپنے فرائض پوری دیانتداری سے ادا کرتے تھے۔ ان کی ذاتی خواہشات اور پسندیدگی یا ناپسندیدگی کو ایک

غیر متعلقہ امر سمجھا جاتا تھا۔ قاضی یا حاکم جن کا قانون پر عملدرآمد کرنا فرض تھا ابتدائے اسلام سے ہی مقرر کیے جاتے تھے۔ رسول اللہ نے خود معاذ کو یمن میں بطور قاضی یا حاکم مقرر کیا اور حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کو عدالتی اختیارات سونپے۔ حضرت عثمان نے ابوداؤد کو اپنے ساتھ مدینہ میں، شریح کو بصرہ میں اور ابوموسیٰ کو کوفہ میں عدالتی حاکم مقرر کیا۔ شروع شروع میں قاضی اور حاکم کے فرائض میں جہاں تک قانون کا تعلق ہے کوئی فرق نہ تھا۔ مگر آہستہ آہستہ ان دونوں عہدوں میں فرق پڑنا شروع ہو گیا اور یہ فرق یہاں تک بڑھا کہ قاضی کے لیے صرف مذہبی امور کی ذمہ داری باقی رہ گئی اور دیگر معاملات حاکم کی ذمہ داری ٹھہرے۔ خلافت راشدہ میں یہ فرق موجود نہ تھا۔

باب ۸
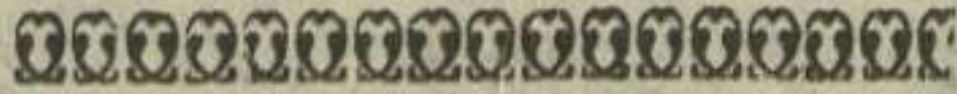
بازنطین اور فارس کی شہنشاہیاں سرنگوں۔ فتح یورپ

رسول اللہؐ کی وفات سے پہلے سارا عرب مسلمان ہو چکا تھا۔ حضورؐ نے اپنی زندگی میں اپنا کوئی جانشین مقرر نہیں کیا تھا۔ وہ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ ان کے مرتبہ و اختیاراتؐ کو کوئی فانی انسان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ مگر کیونکہ اب اسلامی مملکت اور حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ انصرام مملکت کے فرائض انجام دینے کے لیے مملکت کا کوئی سربراہ مقرر کیا جاتا۔ اپنی بیماری کے دنوں میں ایک دفعہ حضورؐ نے نماز کی جماعت کے لیے حضرت ابوبکر کو امام مقرر کیا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر کو آپ کتنا افضل انسان سمجھتے تھے۔

آنحضرت کی وفات پر جو پہلا سوال اٹھا وہ یہ تھا۔ کہ نئی حکومت کا جس کا صدر مقام مدینہ تھا کون سربراہ مقرر ہو۔ مسئلہ نہایت اہم تھا۔ اور اگر اس کا تصفیہ پر امن طریقہ اور اتفاق رائے سے نہ ہوتا تو ممکن ہے۔ کہ قبائل میں نااتفاقی اور گروہ بندی کی وجہ سے فوقیت کے لیے نزاعات پیدا ہو جاتے اور ملت ایک انتشار میں مبتلا ہو جاتی۔ اور قومی اتحاد پارہ پارہ ہو جاتا۔ اس امر پر اتفاق رائے نہیں کہ مہاجرین، جن کے سردار حضرت ابوبکرؓ تھے اور انصار میں کس طرح فیصلہ ہوا۔ مگر کوئی بھی طریقہ انتخاب اختیار کیا گیا ہو۔ خلافت کے عہد کے لیے حضرت ابوبکرؓ کو چنا گیا۔ سید امیر علی اپنی تصنیف (HISTERY OF THE SARACENS) میں لکھتے ہیں۔ کہ حضرت ابوبکر کا تقرر عرب رواج کے مطابق کیا گیا۔ یعنی متوفی کے قبیلہ سے جو شخص عمر میں سب سے بڑا اور ذی مرتبہ ہو جانشینی اس کا حق ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یعنی رسولؐ اللہ کے برگزیدہ اصحاب سے مشورہ کر کے حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ حضرت ابوبکرؓ کا شروع میں ہی اسلام قبول کرنا، ان کا رسولؐ اللہ کی صحبت میں ہر وقت رہنا، رسولؐ اللہ کے ساتھ اکیلے ہجرت کرنا اور اسلام کی بیش بہا خدمات۔ یہ سب باتیں آپ کے حق میں جاتی تھیں۔ مگر سب سے بڑھ کر آپ کی صدق دلی، مستحکم ایمان اور ہر بات پر، جو رسولؐ اللہ نے فرمائی ہو۔ یا تجویز کی ہو، فوراً عمل کرنے کی وجہ سے ملت میں آپ کو ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی۔

جو واقعات حضرت ابوبکرؓ کی مختصر خلافت کے دوران پیش آئے۔ اور ان میں حضرت ابوبکرؓ نے جو حصہ لیا۔ مختصراً بیان کیے جاتے ہیں۔ سب سے پہلا واقعہ جو حضرت ابوبکر کے پیش آیا وہ یہ تھا کہ چند قبائل نے

نے زکوٰۃ ادا کرنے سے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ رسولؐ اللہ کی وفات کے بعد زکوٰۃ فرض نہیں رہی۔ اس تحریک کا سرغنہ ایک شخص مالک ابن نویرہ تھا حضرت ابوبکرؓ نے خالد بن ولید کو اس بات پہ مامور کیا کہ اس شخص سے زکوٰۃ وصول کی جائے، مگر اس نے خالد کے ساتھ بحث اور دلائل شروع کر دیے۔ اور خالد نے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ دوسرا جھگڑا ایک اور شخص کے ساتھ پیدا ہوا جو مسیلمہ کذاب کے نام سے مشہور ہے اور جس نے نبوت کا دعویٰ کر کے قرآن کے مقابلہ میں ایک کتاب بھی لکھی یا لکھوائی تھی۔ اس کی سرزنش کے لیے چالیس ہزار کی ایک فوج روانہ کی گئی۔ اس کے پیروؤں اور مسلمانوں میں یمامہ کے مقام پہ سخت لڑائی ہوئی۔ اور کذاب کو ایک نیزے سے چھید دیا گیا اور اس کے دس ہزار پیرو میدان جنگ میں کام آئے۔ یہ واقعہ ۶۳۵ عیسوی کا ہے۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ ۶۲۸ عیسوی میں رسولؐ اللہ نے ایک مراسلہ ہرقل شہنشاہِ بازلیطنہ، خسرو ایران، نجاشی حبش، عزیز مصر اور شام کے رومی گورنر کو بھیجا تھا جس میں ان کو دعوتِ اسلام دی گئی تھی۔ اس مراسلہ کی سوائے نجاشیؔ اور عزیز مصر کے سب نے تضحیک کی تھی۔ اگرچہ تاریخ سے ہرقل کے رویہ کا صحیح پتہ نہیں چلتا۔ رسولؐ اللہ نے وفات سے کچھ عرصہ پہلے ایک لشکر زیرِ کمان اسامہ بن زید جانب شمال خود روانہ کیا تھا لشکر مدینہ سے تھوڑی دور مقام جرف پر رسولؐ اللہ کی بیماری کی خبر سُن کر رُک گیا تھا خلیفہ اور صحابہ میں اس بات پر اتفاق نہ تھا۔ کہ لشکر آگے بڑھے یا واپس مدینہ آئے۔ مگر حضرت ابوبکرؓ خود جرف تشریف لے گیے اور فوج سے مختصر خطاب کے بعد حکم دیا کہ وہ اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے آگے بڑھیں۔ چنانچہ فوج نے آگے بڑھنا شروع کیا اور اسس کو کچھ کامیابی بھی ہوئی۔ اس کامیابی سے حوصلہ پا کر حضرت ابوبکرؓ نے مکہ سے اپیل کی۔ کہ وہ بھی اسامہ کی فوج کے لیے کمک بھیجیں۔ اہلِ مکہ نے اس اپیل کا پرجوش طریقہ سے جواب دیا۔ اور ایک لشکر نے اولاً سعید ابنِ خالد اور بعد میں عمرو فاتح مصر کے زیرِ کمان مکہ سے یلغار شروع کی۔ اور وہ مدینہ کی فوج سے جا ملا۔ اس مشترکہ فوج کی کمان پہلے ابوعبیدہ کے سپرد ہوئی اور بعد میں خالد شمشیرِ اسلام کے۔ ہر قصبہ اور ہر شہر کے لوگوں نے اپنے دروازے اس لشکر کے لیے کھول دیے۔ مگر اہلِ بصرہ نے جو شام، عراق اور حجاز کے ساتھ تجارت کی وجہ سے خوشحال تھے، مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ بصرہ وہی شہر ہے جہاں رسول کریمؐ کو، جب وہ بارہ سال کی عمر کے تھے اور اپنے چچا ابی طالب کے ساتھ شام کی طرف جا رہے تھے، نسطوری بحیرہ راہب نے نبوت کی خوشخبری سُنائی تھی۔ شہر کا محاصرہ کیا گیا۔ کیونکہ محصور لشکر کو شروع میں کچھ کامیابی ہوئی اس لیے وہ شہر سے باہر نکل آیا۔ اور مورچے سنبھال لیے اس پر اسلامی لشکر نے شہر پر حملہ کر دیا اور اس کی فصیلوں کو توڑتے اور شہر کے محافظوں کی لاشوں کو روندتے ہوئے فوج شہر میں داخل ہو گئی

اس واقعہ کے متعلق عیسائی مؤرخ گورنر رومانیز (ROMANES.) کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس نے مسلمانوں کے ساتھ سازش کر کے اپنی فوج کو دھوکا دیا اور اسلامی لشکر کو شہر میں داخل ہونے میں مدد دی۔

یرموک

اس کے بعد اسلامی فوج اور بازنطینی لشکر میں مقابلہ ہوا۔ اور یرموک کی مشہور جنگ لڑی گئی۔ شہنشاہ ہرقل کی فوج کی تعداد دو لاکھ چالیس ہزار بتائی جاتی ہے۔ اور مسلمانوں کی فوج میں چالیس ہزار سے زائد افراد نہ تھے۔ رومیوں نے ایک محفوظ جگہ پہ قیام کیا۔ مگر پادریوں نے رومیوں کو باہر نکل کر لڑنے پہ اکسایا۔ جونہی رومی باہر نکلے خالد نے جو کسی فوجی مصلحت کے تحت ایک جگہ گھات لگائے بیٹھے تھے۔ حملہ کر کے رومی لشکر کو تہ تیغ کر ڈالا اور جو فوجی بچ گئے۔ ان کو دریا کی طرف دھکیل کر ڈبو دیا۔ اس معرکہ کو جنگِ یرموک اس لیے کہتے ہیں کہ یہ جنگ دریائے یرموک کے کنارے پہ لڑی گئی۔ جو دریائے اُردن کی ایک معاون ندی ہے۔ اس جنگ کا یہ نتیجہ ہوا کہ شام کا سارا جنوبی حصّہ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ ایک عیسائی مؤرخ (PERCIVAL) اندازہ لگاتا ہے۔ کہ اس جنگ میں ایک لاکھ چالیس ہزار رومی کام آئے۔ اور تین ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ مگر جنگ شروع ہونے سے پہلے حضرت ابوبکرؓ ۶۳۴ء میں مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

دمشق

یرموک کی فتح کے بعد مسلمان لشکر نے دمشق کا جو شام کا دارالخلافہ تھا محاصرہ کیا۔ حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کے جانشین چُنے گیے۔ انہوں نے خالد سے کمان لے کر ابوعبیدہ کے سپرد کر دی۔ رومیوں کے ساتھ جو گزری تھی اس سے گھبرا کر ہرقل نے پانچ ہزار کی فوج جنرل کیلس (CALUS) کی کمان میں دمشق کے محصورین کی مدد کے لیے بھیجی۔ محصور لشکر باہر نکلا ہی تھا کہ گورنر اور جنرل دونوں کے سر تن سے جُدا کر دیے گیے۔ اس پہ رومی لشکر شہر کے اندر پناہ لینے کی غرض سے جا گھُسا۔ اب ہرقل نے ایک لاکھ فوج جنرل وارڈن (WARDEN) کے زیرِ کمان محصورین کی مدد کے لیے بھیجی۔ نڈر اور جنگجو مسلم سپاہی ضرار، ایک جنرل کے لڑکے کے ہاتھوں زخمی ہو گیے۔ مگر پھر بھی غصّے سے بھرے ضرار نے اپنا نیزہ اسی نوجوان حملہ آور کے بدن میں گھونپ دیا۔ آنِ واحد میں اس کا مردہ جسم زمین پہ آ پڑا۔ مگر ضرار کیونکہ زخمی ہو گئے تھے وہ دشمن کی قید میں آ گئے۔ مسلمانوں نے ایک زبردست حملہ کیا۔ اور بھاگتے ہوئے رومی لشکر کا اس وقت تک تعاقب کیا جب تک وہ ضرار کو آزاد کرا کے دمشق نہ لے آئے۔ اس کے بعد لشکرِ اسلام نے آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔

ہرقل کے لیے دمشق کا ہاتھوں سے نکل جانا ایک عظیم سانحہ اور ناقابلِ تلافی نقصان ہوتا کیونکہ اس شہر کا ہاتھ سے نکل جانا سارے صوبہ شام کے سلطنت روما سے نکل جانے کے مترادف تھا۔ اسی لیے اس شہر کو بچانے کے لیے ہرقل نے دوسری دفعہ ستّر ہزار فوج زیرِ کمان وارڈن شہر کا محاصرہ توڑنے کے لیے بھیجی۔ مگر خالد نے بذریعہ تحریری حکم اپنے لشکر کے اس حصّہ کو، جو اس وقت عراق، فلسطین اور شام کی سرحد پہ جمع تھا، دمشق بلا بھیجا۔ اس

حکم کی فوری تعمیل ہوئی اور ۱۲ر جولائی ۶۳۳ء کو، جو اسلامی تاریخ میں ایک یادگار دن ہے، طلب کیا ہوا لشکر اس لشکر کے ساتھ آملا جس نے دمشق کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ رومی کچھ حوصلہ پا کر اسلامی لشکر کے عقب سے حملہ آور ہوئے اور ایک خاتون کو جس کا نام خولہ تھا۔ اور جو ضرار کی بہن اور بہادری اور جرأت میں اپنے بھائی کی ہم پلہ تھی، پکڑ لیا۔ اب یہ کسی ناول نگار کا افسانہ نہیں۔ بلکہ تاریخ کہتی ہے۔ کہ خولہ نے اپنی قیدی بہنوں سے پُر جوش لہجہ میں کہا "بے عزتی کی زندگی سے موت بہتر ہے"۔ یہ سن کر قیدی عورتوں نے ایک حلقہ بنا لیا۔ خیموں کے بانس ہاتھوں میں پکڑے اور رومی سپاہیوں کی کھوپڑیاں توڑنی شروع کر دیں۔ وہ اپنی حفاظت کے لیئے بے جگری سے لڑ رہی تھیں کہ اسی اثناء میں مسلمانوں کے شمشیر زنوں نے موقع پر پہنچ کر دشمن کا کام تمام کر دیا۔ خالد نے بھی ناقابل یقین سُرعت سے حملہ کر دیا اور تین ہزار رومی سپاہیوں کی لاشیں میدانِ کارزار میں خالد اور اس کے بہادر سپاہیوں کی شمشیر سے خاک و خون میں لتھڑی پڑی تھیں۔ یہ کہانی کسی مسلمان مورّخ کی قلم کی ایجاد نہیں ہے۔ بلکہ ایک یورپی مؤرخ کا ایک تاریخی واقعہ کے متعلق بیان ہے۔

اجنادین

خالد کی طلبی پر مسلمانوں کی بکھری ہوئی فوجیں مقام اجنادین پر جمع ہوئی تھیں۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے خالد ایک گھوڑے پر سوار لشکر کے درمیان سے گزرا اور مجاہدین کو مخاطب کر کے کہا۔ "دل لگا کر لڑو۔ اور اللہ سے اجر حاصل کرو"۔ ادھر وارڈن بھی اپنی فوج کو جوش دلا رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا۔ کہ حضرت عیسیٰ سے دعا کرو۔ وہ یقینی طور پر آپ کی مدد کرے گا۔ تمہارا مقابلہ ہمارے لشکر کی ایک تہائی فوج سے ہے فریقین کے نعروں کی منطق ملاحظہ ہو کہ ایک طرف حضرت عیسیٰ سے مدد مانگی جا رہی ہے جن کو مسلمان بھی قابل تکریم نبی مانتے ہیں۔ اور دوسری طرف سے اللہ سے مدد مانگی جا رہی ہے جس نے عیسیٰ کو بھی نبی بنا کر بھیجا تھا۔ اور جس کو عیسائی حضرت عیسیٰ کا باپ سمجھتے ہیں۔ رومن لشکر کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ اور وہ ہٹ کر یروشلم کی طرف چلا گیا۔ اجنادین کی فتح کے بعد دمشق کا محاصرہ سخت کر دیا گیا۔ یہاں بھی وہی یورپی مورخ، ضرار کی بہادری کا ایک قصہ بیان کرتا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ضرار کتنا نڈر اور بہادر جنگجو تھا۔ وہ بھیس بدل کر اندرونِ شہر گیا اور دشمن کے اجتماع اور ترتیب لشکر کا اندازہ لگایا۔ مگر وہ پہچانا گیا۔ اور جنرل وارڈن نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔ کہ اس کو پکڑ کر اس کا کام تمام کر دو۔ اس پر تیس سپاہیوں نے اسے گھیر لیا۔ مگر ایک ہی لمحہ میں ان تیس سپاہیوں میں سے ۱۷ کی لاشیں زمین پر پڑی تھیں۔ اور ضرار صحیح سلامت اپنے کمانڈر کے پاس آپہنچا۔ کمانڈر نے ضرار کو بلا حکم لڑنے پر تنبیہ کی ضرار کا جواب تھا۔ میں نے لڑنے میں ابتداء نہیں کی تھی۔ وہ مجھے پکڑنے کے لئے باہر نکل آئے تھے۔ اور مجھے ڈر تھا۔ کہ خدا مجھے میدانِ جنگ سے بھاگتا ہوا نہ دیکھے۔

اب ایک یونانی دولت مند شخص نے خلیفہ اور لشکر کو رشوت کا لالچ دے کر محاصرہ اٹھوانے کی کوشش

کی لشکر کے جنرل نے حقارت آمیز طریقہ سے جواب دیا" آپ کے لیے صرف تین راستے ہیں۔ قرآن، خراج، یا تلوار۔ ہم وہ لوگ ہیں جو لڑ کر خوش ہوتے ہیں۔ اور ہم اس قسم کی خیرات (رشوت) کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جلدی ہی ہم آپ کی دولت، کنبوں اور پکڑے ہوئے قیدیوں کے مالک بن جائیں گے۔" پھر

پھر خالد نے مجاہدین سے خطاب کیا۔ اور کہا تم اپنے سامنے رومیوں کی فوج کو دیکھتے ہو۔ آپ کے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ مگر آپ شام کو ایک دن میں فتح کر سکتے ہیں۔ رومیوں نے ایک اور چال چلی۔ جس کا خالد کو علم ہو گیا۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد وارڈن کا سر خالد کے نیزے کی انی پر تھا۔ رومیوں نے اپنے جنرل کی موت کو اپنی شکست سمجھا۔ اور اپنے پچاس ہزار مُردوں کو میدانِ جنگ میں چھوڑ کر بھاگنا شروع کر دیا۔

اس پر لڑائی ختم ہو جانی چاہیے تھی۔ اور رومی لشکر کو ہتھیار ڈال دینے چاہییں تھے۔ مگر شہنشاہ ہرقل کے پسر طامس (THOMAS) نے لشکر میں نئی روح پھونکی۔ وہ ایک ماہر تیر انداز تھا۔ اور عین لڑائی کے درمیان لڑ رہا تھا۔ اس کے تیروں سے بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ دونو فریق اپنی فتح کے لیے خدا سے دعا مانگ رہے تھے۔ مسلمانوں کے لشکر میں ایک نوشاہ تھا۔ جو مہلک طور پر زخمی ہوا۔ مگر اس کی دُلہن نے جس کا خاوند ابھی دفن بھی نہیں ہوا تھا۔ انتقام لینے کی ٹھانی۔ اس نے تیر کمان اپنے ہاتھ میں لی اور میدانِ کارزار میں آگھسی۔ اس کے پہلے ہی تیر سے رومہ کا علمدار زخمی ہوا۔ اور دوسرے تیر نے اس سپاہی کی آنکھیں بند کر دیں جس نے اس کے شوہر کو قتل کیا تھا۔ بچارے طامس نے شہر کے اندر پناہ لی۔ مگر رات کو ایک اشارے کی تعمیل میں شہر نے دروازے کھول دیئے اور تمام محصورین باہر نکل آئے۔ مختصر سی دُعا کے بعد خالد مقابلہ میں آ کھڑا ہوا۔ گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی۔ کیونکہ لڑائی کا رُخ رومیوں کے خلاف جا رہا تھا۔ وہ پھر شہر کے اندر داخل ہو گئے۔ ایک رومی وفد عبیدہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پناہ مانگی۔

عبید اللہ ایک رحم دل اور نیک خصلت جنرل تھے۔ انہوں نے وفد کی شرائط قبول کر لیں۔ مگر اس عرصہ میں خالد شہر میں داخل ہو چکا تھا۔ اس نے جو سامنے آیا۔ اس کا سر قلم کر دیا۔ اور انسانی خون شام کے دارالخلافہ کی گلیوں میں پانی کی طرح بہنے لگا۔ اس طرح ۲ راگست ۶۳۴ء کو شام کا دارالخلافہ اسلام کی فتوحات میں شامل ہو گیا۔ مگر اس فتح کی خوشخبری حضرت عمرؓ نے سُنی۔ کیونکہ اس اثناء میں حضرت ابوبکرؓ یرموک کی لڑائی سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ اس کے بعد شام کا دوسرا مشہور شہر انطاقیہ بھی مغلوب ہو گیا۔

حضرت عمرؓ خلیفۂ ثانی ۶۳۴ء - ۶۴۹ء

قادسیہ اور یروشلم کی فتوحات

حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمر ان کے جانشین ہوئے۔ آپ کو حضرت ابوبکرؓ نے وفات سے پہلے اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ خلیفۂ ثانی نے اپنے لیے امیر المومنین کا لقب اختیار کیا۔

حضرت عمرؓ کی بھی ساری زندگی جنگوں کی مصروفیت میں گزری۔ اور آپ کے عہد میں روم اور فارس کو فیصلہ کن شکستیں ہوئیں۔ زیادہ تر اسلامی فتوحات حضرت عمرؓ کے عہد میں ہی ہوئیں۔ آپ کے خلافت سنبھالنے کے وقت اسلامی لشکر فارس سے دریائے فرات پر مصروف جنگ تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس لشکر کی مدد کے لیے کمک بھیجی مگر کیونکہ اہل فارس نے اپنی ملکہ سے ناخوش ہو کر یزدجرد کو خسرو کے عہدہ پر مامور کر دیا تھا۔ اس لیے لڑائی اور بھی زور پکڑ گئی۔ کیونکہ یزدجرد نے مسلمانوں کو حیرہ سے نکالنے کا مصمم ارادہ کیا ہوا تھا۔ اس نے ایک لاکھ لشکر کلدان یعنی بابل کی طرف روانہ کیا۔ اور اس کثیر لشکر کے سامنے آنے سے اسلامی لشکر صحرا کے کنارے کی طرف پسپا ہو گیا۔ اور مدینہ سے امداد طلب کی۔ جب مدینہ سے تیس ہزار کی فوج سعد کی زیر کمان پہنچ گئی۔ تو پھر تاریخ کی ایک نہایت اہم لڑائی یعنی جنگِ قادسیہ شروع ہوئی۔ جو تین دن جاری رہ کر فارس کی شکست فاش پر منتج ہوئی۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ شکست تھی جس میں فارس کا دارالخلافہ مدائن فتح ہوا۔ اس کے بعد مقامِ جلولہ پر پھر شکست کھا کر فارس کی کمر ٹوٹ گئی۔ اب فارس کی مشہور شہنشاہی مسلم حکومت کے زیر نگیں ہو کر اسلامی حکومت کا ایک حصہ بن گئی۔ مگر ایشیا کی قسمت کا اس وقت فیصلہ ہوا جب اہل فارس کی بغاوت نہاوند کی لڑائی میں کچل دی گئی۔

فارسی لشکر کا مشہور کمانڈر رستم سونے کے تخت پر بیٹھا قادسیہ کی لڑائی کا منظر دیکھ رہا تھا۔ مگر لڑائی ختم ہونے پر اس کی لاش دوسری لاشوں کے انبار میں پڑی ملی۔ اس کے تیس ہاتھیوں کا پتہ بھی نہ چلا۔ اس کا تخت اور چبوترہ ملبے کا ڈھیر بنے ہوئے تھے۔

دمشق سے کچھ فاصلہ پر طرابلس کے خطہ میں عیسائیوں کی ایک مشہور خانقاہ تھی۔ جس کا نام دیرابی قدوس تھا اور وہاں عیسائی نہ صرف پرستش اور عبادت کے لیے اکٹھے ہوتے تھے۔ بلکہ اپنے لیے برکتوں کی دعا بھی مانگتے تھے۔ طرابلس کے بڑے پادری نے اپنی لڑکی کی شادی کے بعد دولہا دولہن کو دیرابی قدوس کے پادری کے پاس چند مذہبی رسوم ادا کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ ان دنوں میں یہاں ایک میلہ بھی لگتا تھا۔ دفعتاً ۵۰۰ مسلمانوں کا ایک گروہ یہاں آ نکلا اور چند منٹوں کے بعد خانقاہ کے اوپر اسلامی علم لہرا رہا تھا۔ مگر تھوڑی دیر بعد ہی مسلمانوں نے اپنے آپ کو دشمنوں سے گھرا ہوا پایا۔ ٹھیک اسی وقت خالد جو اپنی کمان سے سبکدوش کر دیئے گئے تھے مدد کے لیے پہنچ گئے اور یہ شکست فتح میں تبدیل ہو گئی۔ فاتح لشکر کے ہاتھ بہت سا مال غنیمت آیا۔ جس میں گورنر کی لڑکی معہ اپنی چالیس خادماؤں کے شامل تھی۔ اس کے بعد دیگر شہروں نے جن میں ہیلی پولس اور حمص بھی شامل تھے اپنے دروازے اسلامی لشکر کے لیے کھول دیے۔ مگر شہنشاہ ہرقل نے عربوں کو اس علاقہ سے نکالنے کے لیے ۸۰ ہزار کا لشکر تیار کیا۔ جس کے ساتھ ۶۰ ہزار عرب عیسائی بھی شامل ہو گئے۔ اور اس لشکر کی کمان جنرل ماہن (MAHAN) کے سپرد کی۔ ہونے والے معرکہ میں خالد سامنے کی پہلی صف میں تھے۔ ابو عبیدہ عقب میں اور آخری صف میں خواتین۔ عیسائی دل کھول کر لڑے۔ مگر مسلم کمانڈر کا اپنی فوج سے خطاب بہت مختصر تھا۔

"بہشت آپ کے سامنے ہے اور دوزخ آپ کے پیچھے"۔ سابقہ لڑائیوں کی نسبت یہ لڑائی زیادہ خونریز تھی۔ عیسائی تیر انداز اپنے فن میں ماہر تھے۔ اور ۰۰، مسلم سپاہی ان کے تیروں سے چھد گئے۔ مگر نتیجہ وہی ہوا جس کی مسلمانوں کو توقع تھی۔ رومیوں کو شکست ہوئی۔

یروشلم

اس کے بعد یروشلم کی باری آئی۔ اس شہر کو نہ صرف قدرت نے ہی محفوظ مقام بنایا تھا۔ بلکہ شہریوں نے اپنی محنت سے اس کو مضبوط تر بنا لیا تھا۔ یہ شہر عیسائیوں اور مسلمانوں کے لیے بہت مقدس تھا۔ پہلے پہل جنرل یزید کو اسے فتح کرنے کے لیے بھیجا گیا مگر وہ دس دن تک کوئی نمایاں کامیابی نہ حاصل کر سکا۔ گیارھویں دن ابوعبیدہ اپنی فوج لے کر آشامل ہوئے۔ اور آپ نے شہر کے باشندوں کے لیے اعلان کیا۔ کہ میں اپنے ساتھ ایسے آدمی لایا ہوں جو شراب پینے اور سور کھانے پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس لیے اہالیان شہر کے لیے بہتر ہے کہ وہ اسلامی حکومت کی اطاعت قبول کریں۔ تاکہ خونریزی نہ ہو۔ مگر اس اعلان کی کوئی پرواہ نہ کی گئی۔ چار مہینے اور گزر گئے۔ اور اسی اثناء میں محصورین نے محاصرین پر کئی حملے کیے۔ موسم خراب ہو گیا مگر محاصرین نے اس کو کسی گھبراہٹ کے بغیر برداشت کیا۔ شہر کے اسقف اعظم پر اب یہ بات عیاں ہو گئی کہ شہر کا فتح ہو جانا چند دنوں کی بات ہے۔ اس لیے وہ شہر کی فصیل پر چڑھا۔ اور وہاں سے مسلمانوں سے اپیل کی۔ کہ وہ محاصرہ اٹھا لیں۔ مگر اس اپیل کا کوئی جواب نہ دیا گیا۔ اور آخرکار اسقف اعظم نے شہر کو مسلمانوں کے حوالہ کرنے پر اتفاق کر لیا۔ بشرطیکہ خود خلیفہ وقت آ کر اس کا قبضہ لیں۔ اس تجویز پر مدینہ میں مشورہ ہوا۔ اور حضرت عمرؓ جو اپنی سادگی، برمحل درشتگی اور تقوے میں ضرب المثل تھے، یروشلم کی جانب روانہ ہوئے حضرت عمرؓ کو لق و دق صحرا میں طویل سفر کرنے پر مؤرخین نے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ سفر ۶۰۰ میل کا تھا۔ اور آپ کے پاس صرف ایک اونٹ اور ایک ملازم تھا۔ آپ کا زادِ راہ ایک تھیلہ جس میں کھجوریں تھیں اور ایک پانی کا مشکیزہ تھا۔ جب آپ یروشلم پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں۔ کہ ان کے فوجی افسر زرق برق ریشمی لباس پہنے مرقع زینوں والے گھوڑوں پر سوار ہیں۔ حضرت نے ان افسران کو تنبیہ کی۔ اور پوچھا کہ میرے صحرائی مومن سپاہی کدھر ہیں۔ آپ نے ان خوش پوش افسروں کو اپنے ساتھ شہر کے اندر جانے کی اجازت نہ دی اور آپ ایک ملازم کو لے کر شہر میں اکیلے داخل ہوئے۔ اور اسقف اعظم کے پاس پہنچے جس کو رومی گورنر نے مقرر کیا تھا اور شہر کی چابیاں بھی اس کے حوالے کر دی ہوئی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے شہر کو عیسائیوں کے ہی قبضہ میں رہنے دیا اور تمام گرجاؤں اور شہر کے باشندوں کو حفاظت کا یقین دلایا۔ اس واقعہ کے متعلق جو ۶۳۷-۶۳۸ء میں وقوع پذیر ہوا۔ ایک یورپی مؤرخ اس طرح رقم طراز ہے۔

"رسول اللہ کا یہ جانشین ایک گھوڑے پر سوار تھا۔ جس پر جَو اور کھجور کا ایک تھیلہ، پانی کا مشکیزہ

لکڑی کی ایک کھانا کھانے کی پلیٹ لادے ہوئے تھے۔ یہ ساز و سامان اس شخص کا تھا۔ جو شام اور فارس کی شہنشاہیت کو فتح کر چکا تھا۔ جہاں کہیں وہ آرام کے لیے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ٹھہرے وہاں ان ساتھیوں کے ساتھ ہی کھانے پر بیٹھے۔ اور جو طاقت ان کو بطور خلیفہ حاصل تھی۔ اس کا اظہار صرف لوگوں کی اصلاح پر ہوتا تھا۔ شہر پہنچ کر انہوں نے کئی افسروں کو دیکھا جو قیمتی لباس میں ملبوس تھے۔ جن کو انہوں نے مالِ غنیمت کے طور پر سمیٹا تھا۔ اور اس پُر جوش شخص کی سادگی اس بات کو گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے سپاہی زرق برق لباس پہنے تکبّر سے اپنی فتح کا مظاہرہ کرتے پھریں۔ ایسے افسران سے وہ بہت ناراض ہوئے اور ان کو کیچڑ میں سے گھسیٹوا کر ان کے قیمتی لباسوں کو ان کی آنکھوں کے سامنے چیتھڑے چیتھڑے کر دیا گیا۔ ایک خیمے میں جو اونٹ کے موٹے بالوں سے بنا تھا۔ بیٹھ کر صحرانشینوں کے اس آقا نے یورشلم کے متبرک شہر کی اطاعت کو قبول کیا۔"

حلب ۶۳۸ء

فاتح عربوں کا اگلا نشانہ حلب تھا۔ یہ شہر بھی یروشلم کی طرح مضبوط فصیلوں اور برجوں سے پوری طرح محفوظ بنایا ہوا تھا اور اسی کی حفاظت یہاں کے گورنر یوحنا (YOUKINNA) کی ذمہ داری تھی۔ اس شہر کو بھی مسلمانوں نے محاصرے میں لیا۔ مگر پورے چار مہینہ محصورین محاصرین کا مصمم ارادے کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے۔ اس محاصرے کے متعلق بھی تاریخ ایک دلچسپ اور حیرت انگیز داستان بیان کرتی ہے۔ خالد کے سپاہیوں میں ایک غلام تھا جس کا نام دمیز (DAMES) تھا۔ یہ غلام ایک قوی الجثہ، بیباک اور نڈر سپاہی تھا۔ یہ دیوہیکل سپاہی رات کے وقت فصیل کی دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا، دوسرا سپاہی اس غلام کے کندھوں پر چڑھ کر، جیسے سرکس میں ہوتا ہے کھڑا ہو گیا۔ اور اسی طرح تیسرا سپاہی دوسرے سپاہی کے کندھوں پر چڑھ گیا۔ چوتھے سپاہی نے بھی ایسے ہی کیا۔ اس کے بعد پانچواں، چھٹا اور اور سپاہی اپنے سے نچلے سپاہی کے کندھوں پر چڑھ گئے۔ حتیٰ کہ آخری سپاہی فصیل کے اوپر جا کھڑا ہوا۔ اور اس نے تلوار کی ایک ہی زد سے فصیل کے محافظ کو مار گرایا۔ پھر پگڑیاں جوڑ کر ایک رسّہ سا بنا دیا گیا جو زمین کو چھونے لگا۔ باقی سپاہی اس کے ذریعہ چڑھ کر فصیل کے اوپر پہنچ گئے اور پھر اُسی رسّہ سے فصیل کے اندرونی جانب یعنی شہر کی جانب اُتر گئے۔ انہوں نے پل کے دونوں حصّوں کو جوڑ کر ایک قابل گزر رستہ بنا لیا اور سورج طلوع ہونے سے پہلے اسلامی جھنڈا حلب کے برجوں پر لہرا رہا تھا۔

ہرقل گھبرا کر شام کو اس کی قسمت اور اپنے بیٹے قسطنطین کی طاقت اور ذرائع پر چھوڑ کر اپنے دارالخلافہ کو

واپس ہو گیا۔ قسطنطین کے بیٹے نے سینیریا (CAESARIA) میں قیام کیا۔ مگر یہ سُنکر کہ مسلمانوں نے ایک اور اہم شہر بھی فتح کر لیا ہے اس کی بہادری نے جواب دے دیا اور وہ اپنے باپ کے پیچھے قسطنطنیہ چلا گیا اس طرح ۶۳۹ء میں سینیرر کی شان و شوکت کی یادگار یعنی انطاکیہ اور سینیریا، جن کی بنیاد اس نے خود رکھی تھی، اسلام کو منتقل ہو گئی۔ اور شام کا سارا صوبہ اسلامی حکومت کا حصّہ بن گیا۔

مصر

حضرت عمر فراعنۂ کے ملک مصر کے حالات حیرت و استعجاب اور دلچسپی سے سُنتے تھے اور اس حیرت انگیز تاریخی ملک کو اسلامی مملکت میں شامل کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ مگر دریائے نیل اور اس کی معاون ندیاں اور اس کے شہروں اور قصبوں کی مضبوط ساخت مصر میں داخل ہونے میں سدِّراہ تھیں فتح مصر کے کام پر عمرو کو مامور کیا گیا اور اس نے یہ کام نہایت کامیابی سے سرانجام دیا۔ پہلے عمرو نے شہر فرما کا ایک مہینہ محاصرہ کیا۔ فرما ایک ایسا مقام تھا۔ جس کو مصر میں داخلے کی کنجی سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ فرما کو محصور کر کے عمرو نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصر کا سارا ملک مسلمانوں کے تصرف میں آگیا۔ اس مہم میں ایک عیسائی فرقے کاپٹک (COPTIC) نے مسلمانوں کی مدد کی۔ اسی فرقہ پر شاہ بازنطینہ نے بہت مظالم ڈھائے تھے۔ جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے آپ کو ایک علیحدہ قوم کی طرح منظم کر لیا تھا اور میمفس (MEMPHIS) پر جو طالمی، (PTOLEMY) کا کسی وقت دارالخلافہ تھا قبضہ کر لیا تھا۔ قیصر کا اسکندریہ، جو دنیا کی ایک دساوری منڈی تھا، وہ بھی اسی کے قبضے میں تھا۔ شام رومیوں کا ایک خوشحال صوبہ تھا۔ اور اس کے ہاتھ سے نکل جانے پر متکبر ہرقل کو معلوم ہو گیا۔ کہ رسول اللہ نے جو مراسلہ ۶۰۸ء میں اس کے نام بھیجا تھا۔ وہ نہ ہی ایک مذاق تھا اور نہ ہی کسی مجذوب کی بڑ۔ عمرو ایک مشاق سپاہی ہی نہ تھا، بلکہ ایک عقلمند مدبر بھی۔ اپنی قابلیت اور سوچ بچار سے اس نے مصر کو مسلم دنیا کے لیے ایک غلّہ خیز قطعہ بنا دیا۔ اور جب کچھ عرصہ بعد عرب میں قحط پڑا۔ تو یہ مصر ہی تھا جس نے ایسے نازک وقت میں مسلمانوں کے لیے خوراک بہم پہنچائی۔ اگر یہ مدد نہ پہنچتی تو عرب دنیا ایک سانحہ سے دو چار ہو جاتی۔

اب حضرت عمرؓ ایک عظیم مملکت کے حکمران تھے۔ جس میں شام بمع بیت المقدس، نجد، حجاز، یمن، مصر، عراق، جزیرہ خوزستان، آرمینیہ، آذربائجان، فارس، کرمان، خراسان اور مکران شامل تھے۔ اس سے پہلے دنیا میں کسی مملکت نے اتنی وسعت حاصل نہ کی تھی۔ حضرت عمرؓ کی حکمرانی میں ایک خصوصیت یہ تھی۔ کہ اس میں کسی کے لیے رو رعایت کی گنجائش نہ تھی۔ کمتر سے کمتر شخص کی شکایت سُننے کے لیے ان کے کان ہر وقت تیار رہتے تھے اور کسی بھی مجرم کو اس کا رتبہ سزا سے مستثنٰی نہیں رکھ سکتا تھا۔ آپ حد درجہ کے متقی، پرہیزگار اور بہادر تھے۔ اس لیے عوام آپ کی ذاتی خوبیوں سے متاثر ہو کر آپ کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے

تھے۔ اور ایک مسلم تاریخ دان کے مطابق ان کی سیر کی چھڑی سے وہ خوف لوگوں میں پیدا ہوتا تھا۔ جو کسی کی تلوار سے پیدا نہیں ہوسکتا۔ آپ کے ایمان کی گہرائی اور آپ کا صدق اس بات سے ظاہر ہے۔ کہ آپ نے پہلی دفعہ مکہ سے مدینہ کی ہجرت کا سال بطورِ اسلامی سن مقرر کیا۔ جس سے واقعات کا عرصہ شمار کیا جاتا ہے

ایک دن جب حضرت عمرؓ مسجد میں نمازِ فجر کی امامت کر رہے تھے۔ تو ایک شخص نے آپ پر خنجر کا وار کر کے آپ کو مہلک طور پر زخمی کر دیا۔ یہ شخص ایرانی مجوسی بیان کیا جاتا ہے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ حملہ آور المغیرہ گورنر بصرہ کا عیسائی ملازم تھا۔ وجہ قتل یہ بیان کی جاتی ہے۔ کہ حضرت عمرؓ نے اس کی اپیل جو چند سکّہ ادا کرنے کے حکم کے خلاف تھی مسترد کر دی تھی۔ اگرچہ یہ رقم وہ آسانی سے ادا کر سکتا تھا۔ حملہ کے تین دن بعد حضرت عمر وفات پا گئے۔ اور حضرت عائشہ کی اجازت سے اس جگہ دفن کیے گئے۔ جو حضرت عائشہ نے اپنے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔

حضرت عثمانؓ ۶۴۴ء۔ ۶۵۶ء

جب حضرت عمرؓ بستر مرگ پر پڑے تھے۔ تو آپ نے چھ معزز بزرگوں کی کمیٹی آپ کے جانشین کے تقرر کے لیے مقرر کی۔ حضرت عثمانؓ بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے۔ اور کمیٹی نے ان کو ہی خلافت کے لیے منتخب کیا۔

حضرت عثمانؓ ان ۳۵ - ۳۶ اشخاص میں سے تھے۔ جنہوں نے اسلام کو سب سے پہلے قبول کیا تھا۔ آپ ایک متمول اور فیاض طبع انسان تھے۔ اور اس لیے ان کے نام کے ساتھ لفظ 'غنی' کا اضافہ کیا جاتا ہے حبشہ کو ہجرت کرنے والے مسلمانوں میں آپ بھی شامل تھے۔ اور جب رسول اللہ نے مدینہ کے لیے ہجرت کی تو تھوڑے دنوں بعد حضرت عثمان بھی حضور کی خدمت میں مدینہ پہنچ گئے تھے۔ وہاں آپ نے مسلمانوں کے لیے ایک پانی پینے کا کنواں بنوایا۔ اور قبرستان کے لیے زمین خریدی۔ آپ نے اسلام کی متعدد نمایاں خدمات انجام دیں۔ مدینہ میں مسجد نبویؐ اپنے خرچ پر پتھر سے تعمیر کرائی اور بیت المال سے ایک درہم بھی بطور مشاہرہ نہیں لیا۔ سیلاب روکنے کے لیے آپ نے کئی بند بنوائے جن میں وہ بند بھی شامل تھا جو مدینہ کو سیلاب سے محفوظ رکھتا تھا۔ آبپاشی کے لیے آپ نے کئی نہریں کھدوائیں۔ آپ کا تقویٰ بے مثال تھا۔

بازنطینہ کی رومی شہنشاہی کے اہم حصے آپ کے عہد سے پہلے ہی اسلامی حکومت کے ماتحت آ چکے تھے۔ اور اسی طرح فارس کی عظیم الشان سلطنت کو بھی مسلم مجاہدین نے کچل ڈالا تھا۔ اور وہ حکومتِ اسلامیہ کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ شام کا شاداب رومی صوبہ اور دمشق جو اس صوبہ کا دارالخلافہ تھے۔ اسلامی حکومت کے مطیع ہو چکے تھے۔ عمرو نے مصر کو فتح کر لیا ہوا تھا۔

اگرچہ حضرت عثمان کے عہد کی فتوحات اتنی اہم نہیں، جتنی ان کے پیشرووں کی۔ تاہم ان فتوحات نے آئندہ کے لئے فتوحات کے دروازے کھول دیے تھے۔ دو تین تمہیدی مہموں کے بعد چالیس ہزار کی فوج نے خشک صحرا

عبور کرنے کے بعد ۶۴۷ء میں طرابلس کی دیواروں کے سامنے ڈیرہ ڈالا۔ مگر کیونکہ یہ شہر مضبوط قلعوں سے محفوظ کر لیا گیا تھا۔ فتح نہ ہو سکا۔ جب تک کہ اس کا حاکم گرگیری (GREGORY) ایک لاکھ بیس ہزار فوج لے کر مقابلہ کے لیے میدان میں نکل آیا۔ گرگیری کو پیش کش کی گئی۔ کہ یا تو وہ اسلام میں داخل ہو۔ یا خراج ادا کرے۔ فوج کی کثرت کے گھمنڈ میں آ کر اس نے یہ پیشکش حقارت سے ٹھکرا دی۔ خونریز لڑائی شروع ہوئی۔ اور جب تک کہ دوپہر کی دھوپ ناقابلِ برداشت نہ ہو گئی جاری رہی۔ گرگیری کی ایک بیٹی تھی۔ جو اپنے حسن و جمال میں بے نظیر تھی۔ یہ لڑکی تلوار ہاتھ میں لیے میدانِ کارزار میں خود لڑ رہی تھی۔ گرگیری نے اعلان کیا کہ اس لڑکی کی وہ اس شخص سے شادی کر دے گا جو عبداللہ بن سعد کا سر کاٹ کر اس کو پیش کرے گا۔ ساتھ ہی ایک لاکھ اشرفیاں اس کو بطور جہیز دے گا۔ جواب میں عبداللہ نے اعلان کیا۔ کہ جو شخص گرگیری کا سر کاٹ کر لائے گا۔ اس کو یہ لڑکی بطور قیدی پیش کی جائے گی۔ اور دس لاکھ اشرفیاں بطورِ انعام دی جائیں گی۔ عبداللہ نے اب ایک عقلمندانہ فوجی ترکیب سوچی۔ یہ ایک کامیاب جنگی چال تھی۔ اس نے ایک نڈر مجاہدین کے دستہ کا انتخاب کیا۔ اور اس کو لڑائی سے ہٹا لیا۔ ایک مقررہ دن اس دستے کو حکم ہوا کہ وہ دشمن پر اس وقت پل پڑے۔ جب وہ لڑائی سے فارغ ہو کر دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کر رہا ہو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس غیر متوقع حملہ میں گرگیری زخمی ہو کر گر پڑا۔ اس کی دختر کو پکڑ لیا گیا۔ اور لشکرِ اسلام بربر کے میدان میں نمازِ شکرانہ ادا کرنے کے بعد مدینہ کو واپس لوٹ آیا۔ یہ جنگ ۱۵ مہینہ جاری رہی تھی۔

یہاں ایک اور واقعہ کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ فاتح مصر عمرو کو کمان سے برخاست کر دیا گیا تھا جس کے باعث لشکر میں کچھ بے اطمینانی پیدا ہو گئی تھی۔ اور یونانیوں (اس وقت بازنطینہ کے حکمران یونانی تھے) نے اسکندریہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ عمرو کو بحال کیا گیا۔ جس نے اسکندریہ کو حملہ کر کے واپس لے لیا۔ اس حملے سے جو ابتری پیدا ہوئی۔ اس کے درمیان اسکندریہ کی کچھ خوبصورت عمارتیں تباہ ہو گئیں۔ ۶۴۷ء میں یعنی جس سال طرابلس فتح ہوا۔ جزیرہ قبرص کو بھی مسلمان جہازرانوں نے فتح کر کے اسلامی مملکت میں شامل کر لیا تھا۔ اور خراسان جو فارسی سلطنت کا حصہ تھا۔ وہ بھی اسلامی فتوحات کی فہرست میں شامل ہو چکا تھا۔ خراساں کے معرکہ میں فارس کے شاہ یزدجرد نے راہِ فرار اختیار کی مگر اس کا تعاقب کیا گیا اور اس کو پکڑ کر قتل کر دیا گیا۔ اس طرح ۶۵۱ء میں فارس کی ساری سلطنت خلافت اسلام کے ماتحت آ چکی تھی۔

جب کہ خلافت کے عسکری دنیا کو فتح کرنے میں اپنے ملک سے باہر مصروف تھے۔ دارالخلافہ اسلامیہ میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ اور حضرت عثمان کے دور کے چھٹے ساتویں سال سے کچھ قابلِ افسوس واقعات رونما ہوئے جو خلافتِ راشدہ کے اختتام پر منتج ہوئے۔ جس کے بعد بادشاہوں، شہنشاہوں، ایک سے زیادہ خلفاء، سلطانوں، غاصبوں، امیروں، اماموں، کا دور شروع ہوا۔ خلافت برائے نام قائم رہی۔ مگر عقیدہ کی سادگی، اعمال کی خوبی، قوت اور صدق دل، آہستہ آہستہ کافور ہو گئیں۔ اور ان اوصاف کی جگہ محلات میں عیش و عشرت، خواجہ سراؤں، داشتہ عورتوں اور غلاموں نے لے لی۔ اس کے باوجود بعد کی تاریخ اسلام میں کچھ

روشن ادوار بھی نظر آتے ہیں۔ فتوحات میں اضافہ ہوا۔ قانون، فلسفہ اور سائنس کے مطالعہ میں ترقی ہوئی جس کے نتیجہ میں ایک ایسی تہذیب نے جنم لیا۔ جس کو اختیار کرنے سے کوئی سمجھ دار انسان یا قوم انکار نہیں کر سکتی تھی۔

اس کتاب کے شروع میں ہی قبیلہ قریش کی دو شاخوں بنو ہاشم اور بنی امیّہ کی رقابت کا ذکر ہو چکا ہے۔ رسول اللہؐ کے خطبۂ عرفات کے بعد کی رُبع صدی کے اندر اور باوجود قرآنی احکام کے، کہ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ان کے لیے کسی دوسرے مسلمان کا خون بہانا ممنوع ہے، بنو ہاشم اور بنو امیّہ کے اختلافات اور رقابت نے کھلی دشمنی کی صورت اختیار کر لی۔ اور امت میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اسلامی مملکت کی وسعت اور اس میں دوسرے ممالک کی شمولیت اس بات کی مقتضی تھی۔ کہ اس کا سربراہ یعنی خلیفہ ایسا ہو۔ جو صاحب تدبیر اور سیاست کے اصولوں سے بخوبی واقف ہو۔ حضرت عثمان نے اس صفت کو کوئی اہمیت نہ دی اور وہ اپنے زہد و تقویٰ، نیک نیتی، اور دیانتداری پر انحصار رکھتے رہے۔ مگر یہ اوصاف ان سیاسی مسئلوں کے حل کرنے کے لیے جو غیر متوقع طور پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ بدل ثابت نہیں ہو سکتے۔ حضرت عثمانؓ کے خلاف آپ کے دشمنوں نے پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ جس میں آپ کی کمزوریوں پر نکتہ چینی کی گئی۔ اور آپ پر بد انتظامی، بیجا رعایت، اقربا پروری اور خزانہ میں خیانت کے الزام لگائے گئے۔ حضرت عثمانؓ نے ان الزامات کو سراسر جھوٹ کہہ کر اپنے نکتہ چینوں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ مخالفت بڑھتی گئی۔ کوفہ، بصرہ اور مصر کے بارسوخ آدمیوں نے مشورہ کر کے حضرت عثمانؓ کو معزول کرنے کی سازش کی۔ مگر حضرت عثمانؓ نے ان کو دلائل سے قائل کرنے اور اپنا ہم خیال بنانے کی بہت کوشش کی۔ اور یہ احباب مطمئن ہو کر اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ مگر واپسی کے دوران ان کو ایک حکم نامہ ہاتھ لگ گیا۔ جو حضرت عثمانؓ کے سیکرٹری مروان کا دستخطی بیان کیا گیا اور جس پر خلافت کی مہر لگی ہوئی تھی۔ اس حکمنامہ میں ان مقامات کے گورنروں کو جہاں سے یہ وفد آیا تھا ہدایت درج تھی۔ کہ اس وفد کے رہنماؤں کو واپس پہنچنے پر قتل کر دیا جائے۔ اس لیے وفد کے ارکان اس مصمّم ارادے کے ساتھ واپس ہوئے۔ کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کو ختم کر دیا جائے۔ ان بدخواہوں نے حضرت عثمان کا تعاقب کر کے ان کو گھر میں محصور کر دیا اور انہیں ۶۵۶ء میں اس وقت بے دردی سے شہید کر دیا گیا جب وہ خدا کے حضور سربسجود تھے۔

حضرت علیؓ ۶۵۶ء۔ ۶۶۱ء

حضرت علیؓ کی شادی رسولؐ اللہ کی دختر سیدہ فاطمہؓ سے ہوئی تھی اس طرح وہ رسولؐ اللہ کے داماد تھے اور اہلِ بیت میں شامل تھے۔ آپ پہلے نوجوان تھے۔ جو اسلام میں داخل ہوئے۔ اور جو لوگ سب سے پہلے ایمان لائے ان میں آپ کا دوسرا یا تیسرا نمبر ہے۔ آپ رسولؐ اللہ کے گھر میں ہی رہتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مدینہ کے چند مقتدر صحابہ کرام حضرت علیؓ کے پاس آئے۔ اور ان کو خلافت قبول کرنے کی پیش کش کی۔ آپ نے پہلے پہل تو انکار کیا۔ مگر پھر اس شرط پہ رضامند ہو گئے۔ کہ اگر لوگ مسجد میں کھلے طور پر ان کی وفاداری کا

حلف اٹھائیں۔ تو وہ خلافت کا عہدہ قبول کرلیں گے چنانچہ اس تجویز پر عمل ہوا۔ اور آپ کے خلیفہ چہارم ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ آپ اپنے چھ سالہ دورِ خلافت میں اندرونی بغاوتوں اور شورشوں کے دبانے میں مصروف رہے اسی لیے آپ کے عہدِ خلافت میں کوئی مزید فتوحات نہیں ہوئیں۔ اور نہ ہی اسلامی حکومت کے علاقہ میں مزید وسعت۔ حضرت عثمانؓ بنو اُمیہ کی شاخ سے تھے۔ اور آپ پر بیجا اعانت اور اقربا نوازی کے الزامات لگائے گئے تھے۔ حضرت علیؓ نے چند افسروں کو جن کو حضرت عثمانؓ نے تعینات کیا تھا اپنے عہدوں سے برطرف کر دیا۔ اور اس طرح شروع سے ہی اپنے خلاف شورش پسندوں کی ایک جماعت پیدا کرلی۔ امیر معاویہؓ نے جو شام کے گورنر تھے۔ اور جن کو حضرت عمرؓ نے اس عہدہ پر مامور کیا تھا اپنی معزولی کے احکام کی تعمیل نہ کی۔ اس کے برعکس اس نے حضرت علیؓ پر حضرت عثمانؓ کے قتل کی سازش میں شریک ہونے کا الزام لگایا۔ ہوا میں اب تک حضرت عثمان کے خون کی بو آرہی تھی۔ کیونکہ ان کا خون آلودہ کُرتہ مع ان کی بیوی کی انگلیوں کے، جو حملہ کے درمیان حضرت عثمانؓ کو بچانے کی کوشش میں کٹ گئی تھیں، گلیوں میں اور لشکر کے سامنے منبروں پر چڑھ کر دکھایا جا رہا تھا۔ اس طرح شام میں حضرت علیؓ سے انتقام لینے کی تحریک پیدا ہوئی۔ اور ۶۰،۰۰۰ آدمی حضرت عثمان کے خون آلود کرتے کے نیچے جس کو بطور علم استعمال کیا جا رہا تھا جمع ہو گئے۔ طلحہ اور زبیر جو صاحبِ رسوخ اشخاص تھے۔ اسی تحریک کے سرغنہ بنے۔ مکّہ میں ایک ڈھنڈورچی آوازے لگا رہا تھا۔ کہ ام المومنین حضرت عائشہ طلحہ اور زبیر کے ساتھ بذاتِ خود بصرہ جا رہی ہیں اور ان کے ساتھ ہر وہ شخص شامل ہو سکتا ہے جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کا بدلہ لینے کی خواہش رکھتا ہو۔ اس پکار کے جواب میں تین ہزار جنگجو رضا کارانہ طور پر حضرت عائشہؓ کے محل کے اردگرد جمع ہو گئے۔ اور عہد کیا کہ وہ اپنی جان کے ساتھ محل کی حفاظت کریں گے۔ حضرت عائشہؓ نے جو اونٹ پر سوار تھیں طلحہ اور زبیر اور تین ہزار رضا کاروں کے ساتھ بصرہ کا رُخ کیا۔ گورنر بصرہ نے مزاحمت کی مگر ایک آن میں اس کے چالیس آدمی ڈھیر کر دیئے گئے باقیوں نے حضرت عائشہؓ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ جب حضرت علیؓ نے مدینہ سے بصرہ کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تو کسی قدر تامل کے ساتھ قریباً ۹۰۰ آدمی آپ کے علم کے نیچے جمع ہو گئے۔ چند دن کے سفر کے بعد حضرت علیؓ نے راستہ میں قیام کیا۔ اور دو قاصدوں کو مدد طلب کرنے کے لیے روانہ کیا۔ مگر بصرہ کے گورنر موسٰے نے مدد دینے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر حضرت علیؓ کے پسر حضرت حسنؓ نے اہل کوفہ سے پُر زور اپیل کی اور جواب میں تقریباً ۹۰۰۰ آدمی حضرت علیؓ کے گرد جمع ہو گئے۔ فریقین کا آمنا سامنا ہوا۔ مگر حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ کے لشکر کو دیکھ کر گھبرا گئیں۔ حضرت علیؓ کے لشکر کی تعداد حضرت عائشہؓ کی فوج سے بہت زیادہ تھی۔ حضرت علیؓ خود فوج کی کمان کر رہے تھے۔

بہر حال فریقین میں جنگ شروع ہوئی۔ جو جنگِ جمل کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت عائشہؓ میدانِ جنگ کے اندر اُونٹ پر سوار تھیں۔ زبیر میدان چھوڑ کر مکہ کی طرف چل دیا۔ مگر راستے میں جب وہ نماز میں مصروف تھا

حضرت علیؓ کے آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس سے قبل طلحے بھی مارا جا چکا تھا۔ اس طرح حضرت عائشہؓ اکیلی رہ گئیں۔ مگر میدانِ جنگ سے انہوں نے کنارہ کشی اختیار نہ کی۔ اگرچہ ان کے محمل کے اردگرد وفادار محافظ موجود تھے، ان کا اونٹ ایک تیر سے زخمی ہو کر چلنے سے عاری ہو گیا اور اس کے بعد وہ لڑائی میں حصہ لینے کے ناقابل ہو گئیں کیونکہ آپ اب اونٹ پر سوار بھی نہ ہو سکتی تھیں۔ اس لیے جنگِ جمل ۶۵۶ء میں ختم ہو گئی۔ حضرتِ علیؓ حضرت عائشہؓ سے تواضع و تکریم کے ساتھ پیش آئے۔ اور اپنے دونوں بیٹوں حسنؓ اور حسینؓ کی حفاظت میں ان کو مکہ بھیج دیا گیا۔ حضرت علیؓ نے اس جنگ کے بعد دارالخلافہ کوفہ منتقل کر لیا۔ معاویہؓ کو اطاعت قبول کرنے کے لیے کہا گیا۔ مگر اس نے سوائے عمرو فاتح مصر کے کسی کی بات سننے سے انکار کر دیا۔ اس لیے عمرو کو دمشق بھیجا گیا۔ مگر شام کے حالات دیکھ کر اس نے معاویہؓ کی بیعت کر لی۔ اس پر حضرت علیؓ نے نوّے ہزار فوج کے ساتھ معاویہؓ کے خلاف کوچ کیا۔ صفین کے مقام پر آپ نے قیام کیا۔ جہاں سے صلح کی بات چیت شروع کی گئی۔ جو بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ دونوں لشکروں میں جھڑپیں شروع ہوئیں اور دونوں طرف سے بہت سے آدمی مارے گئے۔ ایک اندازے کے مطابق حضرت علیؓ کے ۲۶۰۰۰ اور معاویہؓ کے ۴۵۰۰۰ ہزار آدمی اس جنگ میں کام آئے

حضرت علیؓ نے معاویہؓ کو اکیلے لڑنے کی تجویز پیش کی۔ مگر معاویہؓ حضرت علیؓ کی طاقت، شجاعت اور حربی صلاحیت سے واقف تھا۔ اس لیے اس تجویز کو قبول نہ کیا۔ پھر عمرو نے اپنے عسکریوں کو قرآن نیزوں پر اٹھانے کے لیے کہا۔ اور تجویز پیش کی کہ اس طرح جنگ ختم کر دی جائے۔ اس تجویز کا فوری اثر ہوا۔ لشکریوں نے اپنے ہتھیار پھینک دیے اور حضرت علیؓ کے سامنے پیش ہو کر قرآن کی قسم کھانے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ مگر حضرت علیؓ نے جواب دیا۔ کہ یہ سب کچھ دھوکہ بازی ہے۔ اور یہ طے پایا۔ کہ دو ثالث ایک حضرت علیؓ کی طرف سے اور دوسرا معاویہؓ کی طرف سے مل کر فیصلہ کریں۔ ثالثوں نے حضرت علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو معزول کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر جب فیصلہ کا اعلان کیا گیا۔ تو ایک ثالث نے فیصلہ صحیح طور پر سنایا۔ مگر دوسرے نے غلط طور پر یہ فیصلہ سنایا کہ حضرت علی خلافت سے معاویہ کے حق میں دستبردار ہو جائیں۔

کیونکہ حضرت علیؓ نے دوسرے ثالث کے فیصلہ کو جو غلط طور پر سنایا گیا تھا۔ ماننے سے انکار کر دیا۔ آپ کے خلاف کچھ ناراضگی پیدا ہوئی۔ اور ایک نئی جماعت پیدا ہوئی۔ جو اپنے آپ کو علیحدگی پسند جماعت کا نام دیتی تھی۔ اس جماعت کی تعداد ۲۵۰۰۰ ہزار کے قریب تھی اور ان کی سکونت بغداد کے قریب تھی۔ کیونکہ اس جماعت کا وجود حضرت علیؓ اپنے لیے خطرہ کا باعث سمجھتے تھے۔ اس لیے آپ ایک طاقتور لشکر لے کر اس جماعت کو کچلنے کے لیے روانہ ہوئے۔ مگر لڑائی شروع ہونے سے پہلے ان کے ذہن میں ایک تجویز آئی۔ اور وہ یہ تھی کہ آپ نے ایک علم نصب کیا اور اعلان کیا۔ کہ جو شخص اس علم کے نیچے آ جائے گا یا کوفہ چلا جائے گا تو اسے امان ہو گی۔ اور وہ محفوظ رہے گا۔

اسی اعلان نے جادو کا سا اثر کیا - اور ۲۵۰۰۰ میں سے صرف ۴۰۰۰ آدمی پیچھے رہ گئے جنہوں نے حضرت علیؓ کی فوج پر حملہ کیا - مگر سوائے ۹ آدمیوں کے، جو اپنی حرکت سے نادم ہوئے، سب مارے گئے اس فتح کے بعد، جو ۶۵۸ء میں حضرت علیؓ کو اس جماعت پر حاصل ہوئی، سب عربوں نے حضرت علیؓ کی اطاعت قبول کر لی - مگر معاویہ اپنی ضد پر اڑا رہا - اس لیے اس علیحدگی پسند جماعت کے، جس کو معتزلی بھی کہا جاتا تھا، تین آدمیوں نے مکہ میں بیٹھ کر فیصلہ کیا - کہ ملت میں دائمی نااتفاقی اور چپقلش دور کرنے اور اتحاد پیدا کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے - اور وہ یہ ہے - کہ عمرو، معاویہ اور حضرت علیؓ سے چھٹکارہ حاصل کیا جائے - چنانچہ انہوں نے ایک دن مقرر کیا - اپنی تلواروں کو زہر میں بجھایا - اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے روانہ ہوئے - ایک حضرت علی کو شہید کرنے کے لیے کوفہ گیا - دوسرا مصر عمرو کو قتل کرنے کے لیے اور تیسرا معاویہ کو موت کے گھاٹ اتارنے دمشق گیا - مگر اس تجویز کی تکمیل نہ ہو سکی - معاویہ کو صرف خفیف سی ضربات آئیں - عمرو بیمار تھا اور متوقع جگہ پر موجود نہ تھا - تیسرے سازشی ابن ملجم نے اپنے ساتھ دو اور آدمی لیے - اور آپس میں جھگڑنے کے بہانے تینوں مسجد میں داخل ہوئے اور حضرت علیؓ پر حملہ کر دیا - حضرت علیؓ مہلک زخم کھا کر زمین پر گر پڑے اور چند دن زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہ کر ۲۷ جنوری ۶۶۱ء کو درجہ شہادت پا کر دنیا کو چھوڑ گئے - اس طرح خلافتِ راشدہ کا دور ختم ہو گیا - اس وجہ سے اور پیچھے بعد دیگرے اندوہناک واقعات کے ظہور میں آنے سے دنیائے اسلام دو مذہبی اور سیاسی جماعتوں میں تقسیم ہو گئی -

خلافتِ راشدہ کی کامیابیاں

رسولُ اللہ کی وفات کے بعد پہلے چار خلفاء کے عہد کو خلافتِ راشدہ اس وجہ سے کہتے ہیں کہ انکو صحیح طور پر ہدایت حاصل ہوئی تھی - ان کو خدا کی طرف سے کوئی وحی یا الہام نہیں ہوتا تھا - مگر یہ چاروں خلفاء رسولُ اللہ کے قریب ہونے سے ان کو رسولُ اللہ کے قول و فعل کا صحیح علم تھا - اور وہ رسولُ اللہ کی سُنت پر عمل کرتے تھے - خلافتِ راشدہ کا سارا عرصہ صرف تیس سال کا ہے - مگر اس قلیل عرصہ میں بازنطینہ (روم) کی شہنشاہی کو عاجز بنا دیا گیا تھا - اس کا بہت سا علاقہ فتح ہو کر خلافت کی حکمرانی میں آ گیا تھا - اسی طرح فارس کی وسیع سلطنت کو، جو رومہ سے دوسرے درجہ پر تھی، مطیع کر کے اسلامی مملکت میں شامل کر لیا گیا تھا - مصر جو افریقہ کا شمالی حصہ ہے - وہ بھی اسلامی حکومت کے زیرِ نگیں آ چکا تھا - اس عرصہ میں ایک اسلامی بحری بیڑا بھی تیار کر لیا گیا تھا - جس نے بازنطینہ کے بیڑے کو شکست دے کر قبرص کے جزیرہ کو اسلامی حکومت کا حصہ بنا لیا تھا - اس طرح تمام عرب، فارس، مصر، اور افریقہ کے شمالی حصہ پر مشتمل اسلامی حکومت دنیا میں سب سے بڑی طاقت بن چکی تھی -

جہاں تک اس عہد کے مشاہیر کا تعلق ہے - ان کی پہلی بات جو ذہن پر اثر کرتی ہے - وہ یہ ہے - کہ

وہ سب دلوں میں صدق اور ایمان کی روشنی رکھتے تھے۔ ان کے محکم ارادے، ایثار، قربانی، بے غرضی، دیانتداری، عجز، شفقت، تکبر سے اجتناب، دولت سے بے پروائی، خیرات، انصاف کا احساس اور عوام کی بہبودی کا جذبہ، مساوات کا احساس، ضبط، مذہبی رواداری، بیت المال کا صحیح مصرف اور سب سے بڑھ کر اللہ کا خوف۔ یہ سب ان کے کردار کی خصوصیات تھیں۔ انہوں نے نہ کوئی محل تعمیر کروائے، نہ ان کے خادم تھے، نہ خواجہ سرا، نہ ملازمین، اور نہ ہی محافظین کا لمبا سلسلہ تھا۔ مگر تاریخ کا یہ ناقابل فہم عجوبہ ہے۔ کہ اسلام کے ان تاریخ سازوں میں سے تین کو غیر متوقع موت کا سامنا کرنا پڑا۔ یعنی وہ شہید ہوئے۔ خلیفہ اوّل ابوبکرؓ تھے۔ جنہوں نے سب سے پہلے قرآنی کی بکھری ہوئی آیات کو جمع کرنے کی سعی کی، اگرچہ قرآن کی تکمیل کا کام حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں انجام پایا۔

حضرت ابوبکرؓ ہمیشہ رسول اللہ کے قریب رہتے تھے۔ اور مدینہ ہجرت کرنے کے وقت آپ رسول اللہ کے اکیلے ساتھی۔ رسول اللہ کے غزوات میں وہ ہمیشہ حصّہ لیتے رہے۔ اور رسول اللہ نے اپنی بیماری میں انہی کو نماز کی امامت کے لیے منتخب کیا۔ آپ نے ملّت کی کشتی کو نہایت خطرناک اور مشکل مرحلوں سے نکالا۔ اور اپنی وفات پر اُمّت کو ایسی مضبوط حالت میں چھوڑا کہ آپ کے جانشین حضرت عمر کے لیے امّت کی رہنمائی اور ترقی کا راستہ صاف ہو چکا تھا۔ جو خطبات آپ نے مختلف اوقات میں دیئے۔ ان سے آپ کی صداقتِ ایمان و کردار کی بلندی اور قرآن اور سُنت کے ساتھ بے پناہ محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جو خطبہ آپ نے اسامہ کی فوج کو جب وہ شام کی مہم پر روانہ ہو رہی تھی دیا۔ وہ ایسی نوعیت کا خطبہ ہے۔ کہ مہذب سے مہذب ضابطۂ جنگ میں آج بھی وہ شامل کیا جا سکتا ہے۔ ایک مؤرخ کا بیان ہے۔ کہ دو سال تک مملکت کی تلوار آپ کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن آپ کے مزاج میں دیانتداری، سادگی اور راست بازی ایسی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی کہ صحرانشینوں کے اس امیر کی وفات پر آپ کی ساری عمر کی بچت صرف چار اشرفیاں تھیں باقی سب کچھ آپ مستحق لوگوں میں تقسیم کر چکے تھے۔ اس واسطے حضرت عمرؓ نے ایک حقیقت بیان کی جب حضرت ابوبکرؓ کی وفات پر آپ نے فرمایا۔ کہ ابوبکرؓ میرے لیے ایک بڑی مشکل مثال چھوڑ گئے ہیں۔ یہ تھے ابوبکرؓ جنہوں نے اپنے زہد و تقوےٰ اور صدق ایمان سے تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل کیا۔ (WOLLASTONS' HISTORY OF THE ARABS , P 79)

حضرت عمرؓ بھی اپنی سادگی، زہد اور برمحل سختی کی وجہ سے اسلام کی تمام خوبیوں کا مجسمہ تھے۔ اسلام کی مشہور فتوحات آپ کے ہی وقت میں ہوئیں اور ایک مستقل حکومت کے نظام کا ڈھانچہ مرتب کرنا آپ ہی کا کام تھا۔ آپ نے درست طور پر اسلام کو ایک عالمگیر تحریک بنایا۔ اسی واسطے یورپی مؤرخ آپ کو اسلام کا پال (PAUL) (عیسائیت کا بانی) کہتے ہیں۔ تمام ضروری اور اہم امور میں آپ رسول اللہ کے صلاح کار تھے۔ قدرت نے آپ کو ایک سیاسی ذہن عطا کیا تھا۔ اور آپ ہی کے طفیل اسلامی سیاسی اداروں کی ابتدا ہوئی۔ غیر مسلم رعایا کے

لیے قواعد، پنشن کے مستحق لوگوں کی فہرست کی تیاری، فوج کا انصرام اور اس کی تنخواہیں، قاضی کا عہدہ قائم کرنا، سال ہجری کی ابتداء، یہ سب امور ان کی فراست کا نتیجہ تھے۔ اپنے لیے امیر المومنین کا لقب اختیار کرنا مملکت کے دنیوی امور میں آپ کی فرمانروائی کا مظہر ہے۔ آپ کے عہد میں گروہ بندی کا شبہ ہوا۔ مگر آپ ہر پُرخطر معاملہ کو خوش اسلوبی سے سلجھانے کے طریقے سے واقف تھے۔ اس لیے آپ کے دور میں کبھی بھی آپ کی مخالفت نہیں ہوئی۔ آپ کا قانون اراضی کہ کسی مجاہد کو مفتوحہ علاقہ میں زمین خریدنے کی اجازت نہ ہوگی اور ایسے مفتوحہ علاقوں میں لگان کا سلسلہ جاری کرنا آپ کی سیاسی دانشمندی کا ثبوت ہیں۔ باوجود جنگی مصروفیت کے ان کو دین کی پابندی اور ایک باشعور طرزِ حیات قائم رکھنے کا از حد فکر رہتا تھا۔ جو ان تبدیلیوں سے عیاں ہے۔ جو آپ نے اپنے دورِ خلافت میں نافذ کیں۔ اور جن کا ذکر اس کتاب میں کسی دوسری جگہ کیا گیا ہے۔

حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے کردار اور ان کے عہد کے کارہائے نمایاں اوپر بیان کئے جا چکے ہیں مع ان اسباب کے جن کی وجہ سے اس نئی مملکت میں ایسی خانہ جنگی کی صورت پیدا ہوئی۔ جس کا نتیجہ سوائے انتشار کے اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

سانحۂ کربلا

سانحۂ کربلا کی حقیقت اور اس کے اسباب قبائلی تنازعات، فرقہ وارانہ طرفداری، جذبات، شاعرانہ تخیل و مبالغہ کے پردوں کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت سے یزید ابن معاویہ کے دور تک چند ہی ایسے مؤرخ یا راوی ہیں جنہوں نے صرف حقیقت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس تاریخی واقعہ کے متعلق اپنے خیالات قلمبند کئے ہوں۔ یا واقعات کو بے کم و کاست بیان کیا ہو۔ بنو ہاشم اور بنی اُمیہ کے اختلافات جو ایک نازک صورت اختیار کر کے اسلام کو دو فرقوں یعنی شیعہ اور سُنی میں تقسیم کر چکے تھے۔ بہت سی روایات اس واقعہ کو جذباتی رنگ دیئے ہوئے ہیں تاہم چند واقعات ایسے ہیں۔ جن کی سچائی میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

اوّل۔ اگرچہ خلیفہ کا تقرر اصولاً انتخاب کے ذریعے رائج تھا۔ مگر یہ انتخاب اس طرز کا نہیں تھا۔ جو آج کل کے جمہوری نظام میں نافذ ہے۔ قرآن میں رسول اللہ کے جانشین کے تقرر کے لیے کوئی ہدایت موجود نہیں تھی۔ درحقیقت ان کا کوئی جانشین عام معنوں میں ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ نبوت ختم ہو چکی تھی۔ اور آئندہ کسی کو نبوت کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لیے رسول اللہ نے کسی شخص کو اپنا جانشین مقرر نہیں کیا تھا۔ مگر مدینہ میں ایک حکومت قائم ہو چکی تھی۔ جو ایک وسیع علاقہ پر حکمران تھی۔ اس لیے حکومت کے نظام کے لئے کسی سربراہ یا حکمران مجلس کا مقرر کرنا لازمی تھا تاکہ قبائل میں انتشار اور اختلافات پیدا ہو کر وہی صورت نمودار نہ ہو جائے۔ جو رسولؐ اللہ کے وقت سے پہلے تھی۔

حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کا اعلان اس وجہ سے نہیں کیا گیا تھا۔ کہ اپنی علالت کے دوران رسولؐ اللہ نے

ان کو جماعت کی امامت کے لیے ہدایت فرمائی تھی۔ بلکہ اس وجہ سے کہ حضرت عمر نے چند صحابہ سے مشورے کے بعد ان کی خلافت کا اعلان کر دیا تھا۔ اور حاضرین میں سے کسی نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ بلکہ انہوں نے اس اعلان سے اتفاق کرتے ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی تھی۔ حضرت عمرؓ کو حضرت ابوبکرؓ نے بستر مرگ پر خلیفہ نامزد کیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کا انتخاب ایک چھ رکنی اصحاب کی کمیٹی نے کیا تھا۔ حضرت علیؓ کی خلافت کا اعلان مسجد میں ہوا تھا اور جو لوگ موجود تھے ان سب نے اس سے اتفاق کیا تھا۔ یہ تینوں تقرر یا انتخاب مدینہ میں ہوئے تھے۔ کیونکہ مدینہ ہی اسلامی حکومت کا دارالخلافہ تھا۔ حضرت علی نے دارالخلافہ کو کوفہ منتقل کر دیا۔ اور آپ کی وفات پر حضرت حسنؓ کی خلافت کا اعلان بھی کوفہ ہی میں ہوا تھا۔ کیونکہ کوفہ اس وقت اسلامی حکومت کا دارالخلافہ تھا۔ اس کے مقابلہ میں معاویہؓ نے جو صرف شام کا گورنر تھا۔ اپنی خود مختاری کا دمشق میں اعلان کر کے اپنی خلافت کا بھی اعلان کر دیا تھا۔ اس لیے ہر دو کے درمیان تصادم کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ مگر حضرت حسن میں وہ اوصاف موجود نہ تھے۔ جو ایک کمانڈر، سپاہی اور حاکم کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ بیشک وہ ادائیگی فرائض اسلام، فیاضی اور زہد و تقوے میں معاویہ پر سبقت رکھتے تھے۔ اس واسطے جب مدائن کے مقام پر شامی اور کوفی افواج میں مقابلہ ہوا تو حضرت حسن کی فوج میں کچھ ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کہ وہ خلافت کا بار گراں اٹھانے کے قابل نہیں۔ چنانچہ تقریباً چھ ماہ کی خلافت کے بعد معاویہؓ اور حضرت حسنؓ کے درمیان ایک صلح نامہ مرتب ہوا جس کی شرائط یہ تھیں۔

۱۔ معاویہؓ نے اس مال و دولت پر جو کوفہ کے خزانہ میں تھا۔ اپنا حق ترک کر دیا۔

۲۔ معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے متعلق کوئی گستاخانہ اشارہ نہ کرنے کا عہد کیا۔

۳۔ حضرت حسنؓ کے گزارے کے لیے مناسب وظیفہ مقرر ہوا۔

یہ شرائط طے ہونے کے بعد ہر دو فریق کوفہ گئے۔ جہاں سے حضرت حسنؓ خلافت سے دستبرداری کا اعلان کر کے مکہ تشریف لے گئے۔ جہاں انہوں نے وظیفہ کی کثیر رقم کا، جس کا اندازہ ۱۵۰،۰۰۰ پونڈ لگایا جاتا ہے، بیشتر حصہ خیرات میں صرف کر دیا۔ اس طرح سے معاویہؓ دنیائے اسلام کا خلیفہ بن گیا۔ کچھ عرصہ مدینہ ٹھہرنے کے بعد حضرت حسینؓ بھی مع اپنے اہل بیت اپنے بڑے بھائی حسن سے جا ملے۔

مکہ میں حضرت حسینؓ کو پے در پے اہل کوفہ کی طرف سے خطوط اور پیغام موصول ہونے شروع ہوئے۔ کہ اہل کوفہ ان کو خلافت کا حقدار اور خلیفۂ وقت سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ کوفہ تشریف لے آئیں۔ اور اپنا حق سنبھالیں آپ کو یقین دلایا گیا۔ کہ کوفی آپ کی صرف اطاعت ہی نہیں کریں گے۔ بلکہ آپ کے لیے اگر ضرورت ہو تو وہ لڑیں گے بھی۔ حضرت حسین کو کوفہ والوں پر اعتماد نہ تھا۔ اور ان کی وفاداری بھی مشتبہ تھی۔ اور ان کی متلوّن مزاجی سے آپ پوری طرح واقف تھے۔ اس لیے آپ نے اپنے چچا زاد مسلم کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے کوفہ بھیجا۔ مسلم نے کوفہ پہنچ کر حضرت حسینؓ کو بذریعہ خط اطلاع دی کہ حالات سازگار ہیں۔ اور وہ کوفہ تشریف لے آئیں۔ حضرت حسین کو چند بہی خواہوں نے کوفہ کا سفر اختیار کرنے کے خلاف مشورہ دیا۔ مگر حضرت حسینؓ نے

آزمائش ضروری سمجھی اور بہتر افراد کے ساتھ جن کے پاس ۳۰ گھوڑے اور ۴۲ پیادے تھے (کچھ مؤرخ ۲۰۰ آدمیوں کی تعداد بتاتے ہیں) آپ مع اپنے اہل وعیال کے کوفہ کی طرف روانہ ہو گیے۔ راستہ میں آپ کی ملاقات ایک سردار حُر کے ساتھ ہوئی۔ اس سردار کو عبید اللہ گورنر بصرہ نے تیس سواروں سمیت حضرت حسینؓ کو کوفہ جانے سے روکنے کے لیے بھیجا تھا (کچھ مؤرخوں کے مطابق حُر کے ساتھ ایک ہزار سپاہی تھے) مگر حُر نے حضرت حسینؓ کو روکنے کی بجائے کچھ گفتگو کے بعد اپنا گھوڑا لوٹا لیا۔ اور حضرت حسینؓ کو جہاں وہ جانا چاہیں جانے کی اجازت دے دی۔ قافلہ نے کربلا کے میدان میں پہنچ کر دریائے فرات کے کنارے خیمے نصب کر لیے۔ اسی اثناء میں کوفہ کی جانب سے ایک بھاری لشکر عمر بن سعد کے زیر کمان آ پہنچا۔ اور ابتدائی گفت وشنید کے بعد فرداً فرداً لڑائی شروع ہوئی۔ جس میں کوفہ والوں کو شکست ہوئی۔ اتنے میں شمر کوفہ سے ہدایات لے کر آن پہنچا اور باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی۔ اس لڑائی کی تفصیلات دینا ناممکن ہے۔ سوائے اس کے کہ حضرت حسینؓ کے ساتھیوں نے بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ مگر آپ کے بہت آدمی شہید ہوئے۔ جن میں ایک شیر خوار بچہ اصغر بھی تھا۔ صرف حضرت حسین اور ان کے صاحبزادے زین العابدین جو بیمار تھے باقی بچے۔ مگر حضرت فاطمہؓ اور شیر خدا کے لختِ جگر کو بھی بڑی رحمی کے ساتھ ۱۹ اکتوبر ۶۸۰ عیسوی (محرم کی دس تاریخ) کے دن شہید کر دیا گیا۔ بعض مؤرخین کے مطابق ان کا سر دھڑ سے جدا کر دیا گیا۔ یہ سر پہلے گورنر بصرہ کے پاس بھیجا گیا۔ اور پھر کوفہ کی گلیوں میں اس کی نمائش کی گئی۔ اس کے بعد یہ سر مع اہل بیت اور زین العابدین دمشق میں یزید کے پاس لے جایا گیا۔ بعض مؤرخوں کا بیان ہے۔ کہ حضرت حسینؓ کے قافلہ کے پس ماندگان کے ساتھ یزید نے بہت گستاخانہ سلوک کیا۔ اور بعض کا بیان ہے۔ کہ ان کے ساتھ یزید عزت اور مؤدبانہ طریقے سے پیش آیا۔ پس ماندگان کو چند دنوں کے بعد مدینہ بھجوا دیا گیا۔ جہاں سے وہ مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ راوی بیان کرتے ہیں۔ کہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے حضرت حسین نے واپس جانے کی تجویز پیش کی تھی مگر یہ تجویز رد کر دی گئی تھی۔

کربلا کا سانحہ مختلف مؤرخوں نے مختلف طور پر بیان کیا ہے۔ مگر اس میں ذرا بھر بھی شک کی گنجائش نہیں کہ تاریخ اسلام ہی میں نہیں بلکہ تاریخ عالم میں یہ ایک رقت آمیز سانحہ ہے۔ اور نظمیں جن میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اور جو ہر سال ماہ محرم میں پڑھی جاتی ہیں۔ لاکھوں آدمیوں کی آنکھوں میں آنسو لے آتی ہیں۔ دراصل چند شعراء کی شہرت ہی اس بات پر منحصر ہے۔ کہ انہوں نے اس واقعہ کو ایسے دلسوز پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ کہ اس سے رقت پیدا ہو جاتی ہے۔

حضرت حسین کی شہادت سے دنیائے اسلام میں غصہ اور اضطراب کی لہر دوڑ گئی اور مکہ و مدینہ کے بہت سے ممتاز اور صاحبِ رسوخ افراد نے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا۔ اس لیے یزید نے شام کی کثیر فوج ان دونوں شہروں کو اطاعت پر مجبور کرنے کے لیے بھیجی۔ فوج پہلے مدینہ آئی۔ جہاں انہوں نے

بہت سے آدمیوں کو قتل کیا۔ اور شہر کو نقصان پہنچایا۔ پھر اس نے مکہ پہنچ کر شہر کا محاصرہ کیا۔ مگر اس اثناء میں یزید فوت ہو گیا۔ اور محاصرہ اٹھا لیا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ کہ معاویہ کا اپنی زندگی میں یزید کو خلیفہ نامزد کرنا ایک بدعت تھی اور سابقہ طریقے کی صریح خلاف ورزی۔ معاویہؓ کے اس فعل کا یہ نتیجہ ہوا۔ کہ خلیفہ کو بذریعہ انتخاب چُننے کی رسم، خواہ وہ کتنی ہی خام اور نامکمل ہو، ختم ہو گئی۔ اور خلافت ایک موروث بن کر رہ گئی۔ انتخاب ہمیشہ دارالخلافہ میں ہوا کرتا تھا۔ حضرت علی نے کوفہ کو دارالخلافہ بنایا۔ اور کیونکہ آپ کا کوفہ ہی میں انتقال ہوا۔ اس لیے حضرت حسینؓ اور کوفے والوں کا یہ حق تھا۔ کہ خلیفہ کا تقرر کوفہ میں ہو اور بیعت بھی وہیں لی جائے۔ جیسے کہ حضرت حسنؓ کی خلافت بھی کوفہ ہی میں عمل میں آئی تھی۔ حضرت حسینؓ یزید کی فوج کے ساتھ لڑنے کے لیے کوفہ نہیں آئے تھے۔ اگر آپ کا یہ ارادہ ہوتا۔ تو وہ اپنے ساتھ صرف ۷۲ افراد جن میں خواتین ایک شیر خوار بچہ اور بیمار پسر شامل تھے، نہ لاتے۔ جب دشمن کی فوج کو آپ نے اپنے سامنے دیکھا تو آپ نے مصالحت تجویز کی۔ اور مکہ واپس جانے کی خواہش کا بھی اظہار کیا۔ مگر کوفی لشکر نے آپ کو یہ اجازت نہ دی اور تمام مردوں کو بیرحمی سے ذبح کر ڈالا۔ کیا مسلمان رسولؐ اللہ کی وفات کے بعد ۳۵ سال سے بھی کم عرصہ میں ایسے سنگدل، خود غرض اور دنیا دار ہو چکے تھے کہ نہ ان کو قرآن کے احکام کی پرواہ رہی اور نہ اپنے رسولؐ کے کنبہ کو قتل کرنے میں دریغ۔ جب قتل کی وجہ بھی صرف یہ ہو کہ دنیوی طاقت ان کے اور ان کے خاندان کے ہاتھوں میں رہے۔

اگرچہ عراق میں وہی صورتِ حال تھی۔ جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ اس سے یہ فرض نہیں کر لینا چاہیئے۔ کہ تمام اسلامی دنیا میں یہی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ اور کہ ساری اسلامی دنیا میں انتشار پھیل گیا تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد کے دور میں اسلام کی فتوحات میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ اور اس دور کے بعد بھی ایسی شاندار، باوقار اور اسلام کی دلدادہ ہستیاں نظر آتی ہیں جو اسلام پر جاں قربان کرنے کے لیے تیار تھیں۔ اور جنہوں نے فتوحات کا وہ سلسلہ شروع کیا جو خلافتِ راشدہ کی فتوحات سے بھی زیادہ وسیع اور تاریخی لحاظ سے اہم تھا۔ کیونکہ اس کتاب کے لکھنے کا مقصد یہ نہیں۔ کہ اسلام کی مفصل تاریخ لکھی جائے۔ بلکہ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے۔ کہ اسلام نے ارتقائے انسانیت میں کیا کردار ادا کیا۔ اس لیے خلافتِ راشدہ کے بعد کی فتوحات مفصل بیان نہیں کی جائیں گی۔ درحقیقت اسلامی تہذیب کا ثمر بہت بعد میں پکا جب مسلمانوں کو جنگ سے فرصت ملی۔

بنو اُمیہ

بنو اُمیہ کے خاندان نے ۹۰ سال یعنی ۶۶۱ عیسوی سے ۷۴۹ عیسوی تک حکومت کی۔ اگرچہ اس خاندان کا ہاتھ حسینؓ کے خون سے آلودہ ہے۔ اور اس خاندان کے سب سے پہلے حکمران یعنی معاویہؓ نے سابقہ دستور کی جس کے مطابق خلیفہ چنا جاتا تھا خلاف ورزی کی۔ اور خلافت کو موروثی عہدہ بنا لیا۔ جس کے بعد خلافت ایک

برائے نام ادارہ رہ گیا۔ جس کی جگہ مختلف خاندانوں کے حکمرانوں نے لے لی۔ یہ بات نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ بنو اُمیّہ کے خاندان کے زمانہ کی فتوحات باقی سب خاندانوں کی فتوحات سے زیادہ ہیں خلیفہ ہشام کی وفات پر اسلامی مملکت مغرب میں بحرِ ظلمات سے لے کر مشرق میں دریائے سندھ تک اور شمال میں کاشغر اور جارجیہ سے لے کر جنوب میں یمن تک پھیل چکی تھی۔ قسطنطنیہ پر جو بازنطینہ شہنشاہی کا دارالخلافہ تھا مسلمان دو بار حملہ کرنے کی کوشش کر چکے تھے اور جنوب مغربی یورپ کا کافی حصّہ اپنے زیرِ حکومت لا چکے تھے۔ مگر ان کی یلغار چارلس مارٹل نے جنگِ طور میں ان کو شکست دے کر روک دی تھی۔ اس طرح بنو اُمیّہ کے اختتام تک مسلمانوں کی حکمران مغرب میں کوہ پیریز تک اور مشرق میں چین تک پھیل چکی تھی۔ یورپ میں فرانس کا ایک حصّہ جزیرہ نما آئی بیریا، بحرِ روم میں جزائر مائی نورکا، میجورکا، قبرص، آئی رلیا، کارسیکا، سارڈینیا، کریٹ، روڈس اور سسلی اسلامی حکومت کے زیرِ نگیں آ چکے تھے۔ اس کے علاوہ جزیرہ نما یونان اور افریقہ میں جبل الطارق سے سویز تک اور ایشیا میں سندھ کے صحرا سے منگولیا کے میدانوں تک سارا علاقہ اسلامی مملکت کا جزو بن چکا تھا۔ اگرچہ اس خاندان میں نالائق اور بے استعداد حکمران بھی گزرے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس خاندان نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز جیسے فرض شناس اور خدا پرست حاکم بھی پیدا کئے تھے۔ خلیفہ عمر ثانی کے بارے میں روایت ہے کہ آپ کو اپنی بیوی نے نماز کے بعد روتے دیکھا اور رونے کا سبب پوچھا۔ انہوں نے جو جواب دیا وہ ایک ایسا انسان ہی دے سکتا ہے جو کلی طور پر اسلام کے ڈھانچہ میں ڈھل چکا ہو۔ آپ نے فرمایا، اے فاطمہ۔ مجھے مسلمانوں اور دوسرے لوگوں پر حکمرانی کا مرتبہ ملا ہے۔ اور مجھے غربا کی مصیبت کا خیال آرہا تھا جو بھوکے ہیں۔ اور ان بیمار لوگوں کا جو بے بس اور محتاج ہیں۔ اور ان مظلوموں کا جو ظلم کی مصیبتیں سہہ رہے ہیں۔ اور ان مفلوک الحال برہنہ جسم لوگوں کا جن کے پاس پہننے کے لیے کپڑا نہیں اور ان اجنبی لوگوں کا جو قید میں ہیں۔ اور بوڑھے بزرگوں کا۔ اور ان کا جو بڑا کنبہ رکھتے ہیں مگر وسائل معاشی سے محروم ہیں اور ہیچو قسم کے دنیا کے اور لوگوں کا اور دور کے صوبوں میں رہنے والوں کا۔ اس لیے مجھے اس خیال نے مضطرب کیا۔ کہ قیامت کے دن اللہ مجھ سے ان سب کا حساب لے گا۔ اور مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ کہ مجھ سے کوئی جواب نہیں بن آئے گا۔ اس لیے میری آنکھوں سے آنسو اُمڈ آئے۔ دیکھئے یہ شخص جس کو خلیفہ کا رتبہ ملا ہو۔ اور اسلام اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا ہو۔ کس طرح ایک مسلمان حکمران کے وہ فرائض بیان کرتا ہے۔ جو کسی دنیوی حکمران نے آج تک بیان نہیں کیے۔ یعنی فاقہ کشی سے عوام کو نجات دلانا، بیماروں کے ساتھ ہمدردی اور ان کی مدد کرنا، قیدیوں سے شفقت کا سلوک، بوڑھے آدمیوں کی نگہداشت، مظلوموں کی مدد، برہنہ جسموں کا تن ڈھانپنا، اور ان لوگوں کی جو کثیر العیال مگر تنگدست ہیں مدد کرنا۔ اور یہ سب کچھ صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں۔ بلکہ رعایا کے ہر طبقے کے لیے۔ خلیفہ نے اپنی بیوی سے کہا۔ کہ سارے زیور اور تحائف جو اس کو اس کے باپ یا بھائی سے ملے تھے بیت المال میں جمع کر دے۔ اس فرض شناس اور وفادار خاتون نے اس حکم کی تعمیل کی۔ اور جہیز کا سارا سامان داخل بیت المال کر دیا۔ جب عمر ثانی فوت ہو

گئے اور یزیداں کا جانشین ہوا۔ تو اس نے سارے زیورات اور سامان اس نیک خاتون کو واپس کرنا چاہے مگر اس نے یہ کہتے ہوئے کہ میں نے ان اشیاء کی خلیفہ کی زندگی میں کبھی پرواہ نہیں کی، ان کی وفات کے بعد اب کیوں پرواہ کروں انکار کر دیا۔ (ماخوذ از سید امیر علی)

خاندانِ عباسیہ، ۷۴۹ء - ۱۲۵۸ء A.D.

جب بنو امیہ کے کمزور اور نالائق ہاتھوں میں خلافت تھی۔ تو حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کے طرفداروں نے شہیدان کربلا کے نام پر ایک جماعت قائم کی۔ جس نے طاقت پکڑتے پکڑتے بنو امیہ کے آخری خلیفہ کو قتل کر کے اس خاندان سے خلافت چھین لی اور ابو عباس خاندانِ عباسیہ کے پہلے خلیفہ مقرر ہوئے۔ ابو عباس نے کربلا کے سانحہ کو دہرایا مگر بنو امیہ کے خلاف۔ بنو امیہ کے خاندان کے سرکردہ افراد چن چن کر قتل کیے گئے۔ قاتل حضرت علیؓ اور امام حسینؓ کے عزیز تھے۔ بنو امیہ کو ختم کر دینے کے بعد اس نے اپنے خاندان کے افراد کو بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے راستے سے ہٹایا۔ بنو امیہ کے پاس اب صرف ہسپانیہ رہ گیا۔ جس نے پہلے سے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا ہوا تھا۔ اگرچہ خاندان عباسیہ کے ابتدائی خلفاء متوسط درجہ کے تھے۔ مگر بعد میں ایک لمبا سلسلہ نالائق للہ اور باللہ کے ناموں کا شروع ہوا۔ حتیٰ کہ چنگیز خاں اور اس کے بعد ہلاکو نے ان کو آ دبوچا۔

اس سارے خاندان میں صرف دو نام اپنی وسعتِ قلب اور دانائی میں مشہور ہیں۔ اوّل مامون، دوسرے ہارون الرشید جو بغداد کے خلفاء میں سب سے بڑے خلیفہ گزرے ہیں۔ ہارون الرشید نے کئی دفعہ سلطنت بازنطینہ کے خلاف حلف آرائی کی۔

ایک دفعہ شہنشاہ بازنطینہ نے ہارون رشید کو کچھ مال دیا۔ اور پھر اس کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ہارون رشید کا تحریری جواب یہ تھا۔ "منجانب ہارون رشید امیر المومنین بنام نائے سے فورس (NICEPHORUS) رومی کتے کے نام۔ میں نے آپ کی چٹھی پڑھی ہے۔ اس کا جواب آپ پڑھیں گے نہیں۔ خود دیکھ لیں گے" اس گستاخی کے جواب میں شہنشاہِ رومہ کو زر کثیر ادا کرنا پڑا۔ مامون ایک آزاد منش۔ کشادہ دل اور صلح کن خلیفہ تھا۔ اس نے حکومت کو ایک مذہبی حکومت سے عملاً ایک غیر دینی حکومت میں تبدیل کر دیا۔ اور سرکاری عہدوں کا دروازہ عیسائیوں، یہودیوں صابعین اور زرتشتیوں کے لیے کھول دیا۔ بحقیقت یہ ہے۔ کہ اس نے نظام سلطنت میں مذہبی اختیار کو ختم کر ڈالا۔ اس کے عہد میں یہودیوں کی سینکڑوں عبادت گاہیں تھیں۔ اور ... ۱۱ عیسائیوں کے گرجا گھر تھے اس کا خیال تھا کہ آئمہ اور فقہا نے اسلام میں ایک جمود اور نا ملائمت پیدا کر دی ہے جو مسلم معاشرہ کی ترقی و نشوونما میں رکاوٹ پیدا کرے گی اس واسطے اس نے مذہبی عمل دخل سے حکومت کو آزاد کر دیا۔ تاکہ انسانی دماغ ان بندشوں سے آزاد ہو جائے۔ جن میں فقہا نے اس کو مقید کر دیا تھا۔ کیونکہ خلفائے عباسیہ میں سے چند خلفاء نے اسلام کو پوری اہمیت نہ دی اور اس کے اصولوں کی سادگی اور سختی کو نظر انداز کر کے وہ اپنے اور رعایا کے درمیان مشترکہ رشتہ کو بھول بیٹھے۔

اسلام کی طاقت میں کمی اسی خاندان میں ہونے لگی
مامون ہی کے وقت میں واصل بن عطار نے فرقہ معتزلہ کی بنیاد رکھی۔ جس کا امتیازی نشان یہ تھا۔ کہ وہ دلیل و عقل کو اوّل اہمیت دیتا تھا۔ جس وجہ سے یہ فرقہ دانش وران اسلام کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ انسانی افعال کے لیے کوئی دائمی قانون نہیں ہے۔ الہامی قوانین نے جو انسان کے افعال پہ پابندیاں عائد کی تھیں وہ اسلام کی نشو و نما اور برتری کی ایک منزل تھیں۔ مگر وہ اس تبدیلی کے تابع تھیں۔ جس کے تابع خالق نے تمام عالم کو کیا ہے۔ مامون نے فرقہ معتزلہ کے اصولوں کو اپنایا۔ اور ان کے نظریہ کی اشاعت کی حمایت کی۔ مگر اس فرقہ کی مخالفت امام حنبل کی طرف سے ہوئی۔ جس کی وجہ سے ان کو سزا بھگتنی پڑی کیونکہ امام مذکورہ قرآن کو ازلی خیال کرتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوگا۔ کہ ہسپانوی دانشور ابن اشد بھی فرقہ معتزلہ کے سے خیالات رکھتا تھا۔ مگر ابن رشد کے خیالات کا بھی تقلید پسند عشریوں نے گلا گھونٹ دیا۔ ابن رشد کے خیالات کی مغرب میں قدر ہوئی۔ اسلامی دنیا کے تقلید پسندوں نے اسے اس وجہ سے دائرۂ اسلام سے خارج سمجھا کہ وہ ایک ادق فلسفیانہ بحث میں پڑ کر انسانی روح کو فانی کہہ گیا۔ اور عقل کل کو ابدی۔

گیارھویں صدی کے آغاز میں خلافتِ عباسیہ میں انتشار پیدا ہوا۔ اور اس وقت یہ سلطنت اتنی وسیع اور ناقابلِ انتظام ہو چکی تھی۔ کہ مرکز اس پہ پوری طرح قابو نہیں پا سکتا تھا۔ اس وجہ سے مختلف صوبوں نے یا تو خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ یا خلیفہ سے ان کے حکمرانوں نے سلطان کا لقب حاصل کر لیا۔ مصر، خراسان، بخارا، اصفہان اور شیراز عملاً خود مختار ہو گئے۔ حتیٰ کہ خلیفہ المستقیم کے عہد میں ۱۳ رفروری ۱۲۵۸ء کو ہلاکو خاں بغداد میں داخل ہو گیا۔

منگول خانہ بدوش جو ماہر شہسوار اور جنگجو تھے۔ شمال مغربی ایشیا میں جھیل بیکال کے کنارے رہتے تھے۔ تیرھویں صدی کے آغاز میں انہوں نے دفعتاً مہذب دنیا پہ حملہ آور ہو کر لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ وہ گروہوں میں حملہ آور ہوتے۔ حملے چنگیز خاں نے شروع کئے۔ بعد میں ہلاکو خاں نے مسلم حکومت کے شمالی صوبے، خوارزم، بخارا، سمرقند، بلخ، نیشاپور وغیرہ تباہ کر ڈالے اور بڑھتے بڑھتے وہ دارالخلافہ بغداد میں آنمودار ہوا۔ پورے چالیس دن وہ لوٹ مار کرتا رہا۔ اس نے بغداد کے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ...۸۰۰ آدمی جن میں ادیب، سائنیسدان، فلسفی، فقہا اور دانشور شامل تھے، تہ تیغ کر دیے گئے۔ یہاں تک کہ دریائے دجلہ کا پانی انسانی خون سے سرخ ہو گیا۔ خلیفہ خود شہید کر دیے گئے۔ کتب خانے، کتابیں، محلات کی اشیاء زیبائش۔ سب جلا دی گئیں۔ اور بغداد ایک بھوتوں کی بستی بن کر رہ گیا۔ منگول خاندان میں ایک خاں قبلائی خاں چین کا خان بن بیٹھا۔ اور اسی قبلائی خاں کے وقت میں وینس کا مشہور سیاح مارکو پولو چین کے شاندار دربار میں حاضر ہوا تھا۔

صلیبی جنگیں

صلیبی جنگیں مسلمانوں اور یورپ کے عیسائیوں کے درمیان یروشلم پر قبضہ کرنے کے لیے، جو مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے ایک متبرک مقام ہے لڑی گئیں اور ۱۰۹۶ء سے ۱۲۹۱ء تک یعنی قریباً دوسو سال جاری رہیں۔ ان جنگوں کی تعداد آٹھ ہے۔ ایک یورپی مؤرخ ایچ۔ جی۔ ویلز (H.G. WELLS) کے مطابق یہ لڑائیاں صرف مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ہی نہیں لڑی گئیں۔ بلکہ ان میں سے ایک لڑائی تو جرمن کے فریڈرک ثانی کے خلاف جو عیسائی تھا لڑی گئی۔ جس کو پاپائے روم نے حلقۂ عیسائیت سے اس لیے خارج کر دیا تھا۔ کہ اس نے ارسطو کی تصنیف کے عربی ایڈیشن کو اطالوی زبان میں یونیورسٹی کے طلباء کے فائدے کے لیے ترجمہ کروایا تھا۔ ایک اور صلیبی جنگ کے بہانے سے یورپی بچوں کو کچھ لالچ دے کر عرشۂ جہاز پر لایا گیا۔ اور ان کو مصر لے جا کر غلاموں کے طور پر بیچ دیا گیا۔ پہلے ذکر آچکا ہے۔ کہ جب حضرت عمرؓ یروشلم کی فتح کے بعد شہر کی چابیاں لینے یروشلم تشریف لائے تھے تو آپ نے اس شہر کے عیسائیوں اور دیگر باشندگان کے لیے امان، تحفظِ جائداد اور ان کے مذاہب میں مداخلت نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور بیت المقدس کی چابیاں ہمیشہ کے لیے عیسائی محافظ اور اس کی اولاد کے لیے مخصوص کر دی تھیں۔ مگر باوجود ان شرائط کے جن پر مکمل طور پر عمل کیا گیا۔ یورپ کے عیسائیوں نے پاپائے روم کی شہ پر یروشلم پر قبضہ کرنے کی تیاریاں شروع کر کے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔

جو دو ڈویژن پہلے آئے ان میں سے سلطان مصر نے ایک کا صفایا کر دیا۔ مگر دوسرا ڈویژن کچھ مقامات پر، جن میں یروشلم بھی شامل تھا، ۱۵ر جولائی ۱۰۹۹ء کو قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک یورپی مؤرخ لکھتا ہے کہ اس لڑائی میں اتنا خون بہا کہ اس سے شہر کی گلیاں سرخ ہو گئیں اور گھوڑ سواروں کے چلنے سے خون کے چھینٹے ایسے اٹھتے تھے۔ جیسے کہ سوار گلی کے سرخ پانی میں چل رہے ہوں۔

۱۱۸۷ء میں مسلمانوں نے یروشلم پھر فتح کر لیا۔ اور آخری بار ۱۲۱۴ء میں مصر کے سلطان صلاح الدین نے اس کو فتح کر کے مؤثر طور پر اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اس کے بعد پہلے عالمی جنگ کے دوران ۱۹۱۸ء میں اس مقدس شہر کو برطانوی، فرانسیسی اور ہندوستانی فوجوں نے فتح کر کے اس پر قبضہ کر لیا اور اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ مشرقی حصہ اسرائیل کو ملا اور مغربی حصہ یہودیوں کو۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا ہے۔ کہ عربوں اور اسرائیل کے یہودیوں میں جنگ چھڑی اور یہودیوں نے پورے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ جس کا آدھا حصہ ایک بین الاقوامی عہدنامہ کے مطابق اردن میں شامل رکھا گیا تھا۔ اقوامِ متحدہ کے۔ ایک ریزولیوشن کے مطابق اسرائیلوں کو مفتوحہ عرب علاقہ واپس کر دینے چاہئیں۔ مگر یہودی اس ریزولیوشن کو ایک بے معنی تحریر کی حیثیت دیتے ہیں۔ جس سے ایک آخری جنگ اسرائیل اور عربوں کے درمیان ناگزیر ہو گئی ہے۔ جو کسی وقت بھی چھڑ سکتی ہے۔ مصر اور اسرائیل

کے درمیان حالیہ معاہدہ اس نزاع کا کوئی مؤثر حل نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے سارے مفتوحہ عرب علاقے عربوں کو واپس نہیں ملتے۔ اور نہ اس سے فلسطین کا مسئلہ حل ہوتا ہے۔

مصر

قارئین کو یاد ہوگا۔ کہ حضرت عمر کے عہد میں عمرو نے مصر کو فتح کر کے حکومت اسلامیہ میں شامل کر لیا تھا مگر خلفائے عباسیہ کے عہد میں مصر نے خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ مصر میں شیعہ فاطمی خلافت ۹۶۹ء سے ۱۱۷۱ء تک قائم رہی۔ حکومت کا دارالخلافہ قاہرہ تھا۔ اور اس سلطنت کی وسعت یمن سے مکہ، دمشق اور بحرِ احمر کے ساحل تک تھی۔ ۱۱۷۱ء میں فاطمیوں کو صلاح الدین نے، جو حکمران وقت کا کرد ی النسل وزیر تھا اور خلیفہ کے ترکی محافظوں میں سے تھا، مصر سے نکال کر اس کی حکمرانی اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ یہ وہی صلاح الدین ہیں، جنہوں نے یروشلم پر صلیبی جنگوں کے دوران قبضہ کر کے عیسائیوں کو وہاں سے نکال دیا تھا۔

ترکیہ

ترک اصل میں ترکستان کے باشندے تھے۔ جب ۱۲۱۸ء میں چنگیز خاں نے ترکستان کو پامال کیا۔ تو ترکِ وطن کر کے ترک ایشیائے کوچک میں آباد ہو گئے۔ جہاں سے انہوں نے آہستہ آہستہ سلجوقیوں کو نکال دیا۔ اس جنگجو، جاہ طلب، اور جانباز قوم نے یورپ میں پاؤں ٹکانے کے لیے جگہ حاصل کرنے کی غرض سے دردانیال پر، جو کئی ایک وجوہ سے ایک اہم مقام ہے، قبضہ کر لیا اور وہاں سے وہ مقدونیہ، بلغاریہ اور یوگوسلیویا میں گھس آئے۔ سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ پر جو مشرقی شاہان رومہ کا دارالخلافہ تھا۔ حملہ کر کے اور اس کو قبضہ میں لے کر بازنطینہ کی شہنشاہی کا ۱۴۵۳ء میں خاتمہ کر دیا۔ فتح قسطنطنیہ (بازنطینہ) تاریخِ عالم میں ایک حیرت انگیز کارنامہ شمار ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے پہلے بھی اس شہر کو فتح کرنے کی کوشش کی تھی۔ جو بار آور ثابت نہ ہوئی تھی۔ ترکوں نے ایک مضبوط بحری بیڑہ تیار کیا اور محمد ثانی نے اس بیڑہ کے ذریعہ قسطنطنیہ کو فتح کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ شہر قسطنطنیہ کئی وجوہ سے ایک نہایت اہم جگہ تھی۔ اور سلطنت بازنطینہ کا زندہ رہنا یا ختم ہونا اس شہر کے قبضہ پر منحصر تھا۔ محمد ثانی اپنے ستر آزمودہ جہاز لے کر قسطنطنیہ کی بندرگاہ پر پہنچا۔ یہ بندرگاہ جو گولڈن ہارن کہلاتی ہے۔ اور قدرت نے جس کو دنیا میں مضبوط ترین بندرگاہ بنایا ہے قسطنطنیہ کا دروازہ تھی۔ اس دروازے پر پہنچ کر سلطان محمد ثانی نے دیکھا۔ کہ اس کو ایسی مضبوط زنجیروں اور سلاخوں سے محفوظ بنایا ہوا ہے۔ کہ اس دروازے سے قسطنطنیہ میں داخل ہونا ناممکن ہے۔ اور شکست کے خطرہ سے خالی نہیں۔ سلطان کے دماغ میں ایک سوچ روشنی بن کر ابھری۔ اور وہ یہ تھی۔ کہ گولڈن ہارن کے دروازے سے شہر میں داخل ہونے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ جہازوں کو ایک خشک پہاڑی پر سے کھینچ کر باب سینٹ رومانوس کی طرف سے جس کے مقابل سلطان کا خیمہ

تھا شہر پر حملہ کیا جائے ۔ یہ جہاز خشکی کے راستہ اور اونچی پہاڑی پر سے کس طرح کھینچے گئے ۔اس کی تفصیل تاریخ دنیا میں ایک معجزہ سے کم نہیں ۔ایک ماہر مصوّر نے اس واقعہ پر جو مصوّری کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے ۔کہ جہازوں کو پہیئے لگے ہوئے ہیں ۔اور ان کو بیل گاڑیاں اور برہنہ جسم مگر کمر پر کسی ہوئی اور پسینہ سے شرابور ترک نوجوان کھینچ رہے ہیں ۔

ان کے چہروں سے عزم و استقلال ٹپک رہا ہے اور جہازوں کو رسی باندھ کر پہاڑی کی اونچائی کی طرف ایک لکڑی کے تختہ پر سے کھینچا جا رہا ہے ۔سلطان محمد کی یہ حربی ترکیب کامیاب ہوئی ۔اور اسلامی لشکر نے دوسری طرف سے داخل ہو کر شہر پر حملہ کر دیا ۔ایک خفیف مزاحمت کے بعد شاہان رومہ کا یہ شہر جو اب استنبول کے نام سے مشہور ہے ۔ترکوں کے قبضہ میں آگیا ۔اور سلطنت رومہ بھی اس کے ساتھ ہی ختم ہو گئی ۔یہ بیان ایک یونانی مورخ کریٹو وسلو (KRITOVOUSLO) کا مع تصویر کے جیو گریفک میگزین مورخہ دسمبر ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا ہے ۔

۱۴۸۳ء میں سلطان محمد ثانی کی وفات کے بعد اس کے جانشین بایزید ثانی نے یونان فتح کر لیا ۔اور سلیم نے آرمینیا اور مصر پر غلبہ پا کر ایک عباسی سے جو مصر کے مسلمانوں کی حفاظت میں خلافت کا دعویدار ہو کر دن گزار رہا تھا ۔خلیفہ کا لقب خرید لیا ۔سلیمان ذی شان نے ہنگری کو فتح کر ڈالا اور بابر کے پانی پت کی لڑائی جیتنے اور خاندان مغلیہ کی بنیاد رکھنے کے تین سال بعد وائنا کا محاصرہ کر لیا اور وہ اس شہر کو اور وینس کو فتح کرنے والا ہی تھا کہ واقعات نے پلٹا کھایا اور مسلمانوں کی وائنا سے پسپائی شروع ہوئی ۔اس وقت ترکوں کی یورپ میں سلطنت شمال میں کوہ طارس سے ہنگری اور رومانیہ کی حدود تک اور مغرب میں بحر ایڈریا تک پہنچ چکی تھی ۔اس سے بہت پہلے موروں (MOORS) نے ہسپانیہ فتح کر لیا ہوا تھا ۔ترکوں نے ہنگری کو ۱۵۲۶ء میں فتح کیا ۔اس ملک کے مشہور شہر بوڈا کے جو دریا کے ایک طرف واقع ہے، شاندار قلعہ میں سیر کرتے ہوئے سلیمان ذی شان نے آہ بھر کر ایک مصاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ، کاش یہ محل استنبول میں ہمارا حرم سرائے ہوتا ۔مگر اس خواہش کا ڈیڑھ صدی بعد خاتمہ ہو گیا ۔جب ترکوں کو ہنگری سے نکال دیا گیا ۔

ترکی کا زوال بیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے شروع ہوا ۔۱۹۱۲ء تک یکے بعد دیگرے ترکی کے علاقوں کا اس کے ہاتھ سے نکل جانا ایک پرانا قصہ ہو چکا تھا ۔مگر جب بوسنیا اور ہرزیگووینا کا علاقہ ترکی کے ہاتھ سے نکل کر آسٹریا ہنگری کی سلطنت میں شامل ہوا تو یہ نقصان ترکوں اور سارے عالم اسلام کے لیے ایک دائمی ناسور بن گیا ۔اس کے بعد بلقان لیگ وجود میں آئی ۔جس کے ارکان بلغاریہ، سربیہ، یونان اور مونٹی نگرو تھے ۔ اس لیگ کا مقصد یہ تھا ۔کہ یورپ کے مرد بیمار (ترکی) کا گلا گھونٹ دیا جائے ۔

جنگ بلقان سے مسلمانوں میں ترکی کے ساتھ ہمدردی کی ایک لہر دوڑ گئی ۔خاص کر ہندوستان کے مسلمانوں اور مسلم طلبا میں ۔اور بلقان کی ریاستوں اور برطانیہ کے خلاف غیض و غضب کی رو سارے

ملک میں پھیل گئی۔ جب یکے بعد دیگرے ترکی کے علاقے اس کے ہاتھ سے نکلنے شروع ہوئے اور کرک کلاسی کمانوود اور سالونیکا بلقان لیگ کے ممبران کے قبضہ میں آ گئے تو اس ہمدردی کی لہر میں اور بھی اضافہ ہو گیا اور برطانیہ کے خلاف نفرت میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب اس کے وزیر اعظم ایسکوتھ نے اپنی سابقہ پالیسی کے برخلاف اعلان کیا۔ کہ بڑی طاقتیں جن میں برطانیہ بھی شامل تھا مفتوحہ علاقوں کو فاتحین کا علاقہ تسلیم کر لیں گی۔ اور مفتوحہ ممالک کی حدود میں مناسب رد و بدل کیا جائے گا۔ مگر اس تاریکی میں جو مایوسیوں سے لبریز ہو چکی تھی۔ اُمید کی ایک کرن نظر آئی۔ جب انور پاشا نے جو نوجوان ترک کی تحریک کے بانی تھے۔ پورے فوجی اختیار سنبھال لیے۔ اور اپنی فوج میں نئی روح پھونکی اور اسے قسطنطنیہ کے قریب شتلجہ کی بارکوں سے نکال کر وہ انڈریانوپل پر حملہ آور ہوا۔ اور اس اہم مقام پر قبضہ کر لیا۔ ایڈریانوپل کی فتح کے بعد انور عالمِ اسلام کا ہیرو بن گیا۔ اس کی ہزارہا تصویریں قصبوں اور دیہات کی دکانوں میں آویزاں نظر آنے لگیں۔ یورپ کا مردِ بیمار یکدم ایک نوجوان اور طاقتور ترک میں تبدیل ہو گیا۔ انور کی بہادری کی یہ شہرت کچھ عرصہ قائم رہی مگر وہ روسیوں کے ساتھ لڑتا ہوا ۱۹۲۲ء میں افغانستان کی سرحد پر شہید ہو گیا۔ اس کے بعد میں ایک انور سے بھی بڑے ترک نے انور کی شہرت کو گہنا دیا۔ یہ ترک مصطفٰے کمال تھا۔ جو بعد میں اتاترک کے لقب سے مشہور ہوا۔ اور جس نے گیلی پولی اور سمرنا کے کارہائے نمایاں سے دنیا کو دنگ کر دیا۔

جون ۲۸ر ۱۹۱۶ء کو جب بوسینا کے ایک نوجوان نے فرنیز فرڈی ننڈ اور اس کی بیوی کو سیراجیوا کے پل پر قتل کر کے پہلی عالمی جنگ کی آگ بھڑکائی اور ترکیہ اس جنگ میں جرمنی کا حلیف بن کر جنگ میں کود پڑا۔ تو اس سے برطانیہ اور ہندوستان کے مسلمانوں کے تعلقات نے ایک نازک صورت اختیار کر لی۔ برطانیہ کو اندیشہ تھا۔ کہ ترکوں کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کی ہمدردی ملک میں ایک اضطراب پیدا کر دے گی۔ جو بلووں کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد برطانیہ کو معلوم ہو گیا۔ کہ اس کا یہ اندیشہ بے بنیاد تھا۔ اور کہ وہ ایک خطرناک کونہ سے گزر چکے تھے۔ سوائے اس کے کہ محمد علی کے مقدمہ نے ایک عدالتی طوفان کی صورت اختیار کر لی۔

ترکی کو شکست ہوئی۔ مگر اتحادی فاتحین خاص طور پر آسٹریلین اور نیوزی لینڈ کے سپاہی کبھی گیلی پولی اور مصطفٰے کمال کو نہیں بھول سکتے۔ اتحادیوں نے دوران جنگ ترکی کو شکست دے کر اس کے ملک کو دوسروں کے حوالے کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس مقصد کے لیئے ضروری تھا۔ کہ درہ دانیال اتحادیوں کے قبضہ میں آئے۔ اور وہ بحرِ اسود میں پہنچ کر روسیوں کے ساتھ مل جائیں۔ اس لیے انہوں نے بے شمار فوج بذریعہ جہاز سمندر کے اس ساحل پر اتار دی۔ جس کے دوسری جانب گیلی پولی کی پہاڑی ہے۔ مصطفٰے کمال نے اس جنگی چال کا پہلے سے اندازہ لگا لیا تھا۔ اور اپنی بیٹریاں گیلی پولی کی پہاڑی ڈھلوان پر خفیہ طور پر نصب کر رکھی تھیں۔ جب اتحادی فوج ساحل پر اتری تو بیٹریوں نے ان پر ایسی فائرنگ شروع کی کہ سمندر کا ساحل خون سے سرخ ہو گیا

اپنی بیٹریوں اور فوج کو مصطفیٰ کا حکم یہ نہیں تھا کہ تم حملہ کرو یا لڑو۔ بلکہ یہ کہ مر جاؤ۔ اور اس حکم کی تعمیل میں ۵۵۰۰۰ ترکوں نے جان دے دی۔ مگر فتح انہی کو حاصل ہوئی۔ اتحادی ذلت سے پسپا ہوئے۔ جنگ ختم ہوئی۔ تو ترکی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے۔ مگر یونانیوں کی اس سے بھی تسلی نہ ہوئی۔ ان کی آنکھیں بدستور قسطنطنیہ پر لگی ہوئی تھیں۔

عالمی جنگ اوّل میں گیلی پولی کا واقعہ ایک ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ اس جنگ میں بالآخر ترکی کو شکست ہوئی اور فاتح اتحادیوں نے اس کے مفتوحہ علاقوں کو دیگر یورپی ممالک میں تقسیم کر دیا۔ قسطنطنیہ ترکوں کے پاس رہا۔ مگر یونان اس کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ یونانیوں نے ۱۹۲۰ء میں سمرنا پر اپنی فوجیں اتاریں اور ترکوں سے اپنی شرائط منوانے کے لیے ترکی پر حملہ کر دیا۔ مگر اتاترک یونانیوں کی اس چال اور ارادوں سے پہلے واقف تھا۔ ترکوں کے لیے یہ واقعہ موت اور زندگی کا مسئلہ بن گیا۔ کیونکہ ترکی کا زندہ رہنا اس لڑائی کے نتیجے پر منحصر تھا۔ جو اناطولیہ کے پہاڑیوں کی وادیوں میں یونانیوں سے لڑی جانی تھی۔ اس لڑائی کا نتیجہ وہی نکلا جس کی اتاترک کو امید تھی۔ یونانی اپنے اسّی ہزار جوانوں کی لاشیں انطولیہ کی وادیوں میں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ترکوں کے خود اس لڑائی میں اتنے افسر مارے گئے جتنے گزشتہ جنگوں میں کسی ایک میں بھی نہ مرے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں مجھے انقرہ میں ایک ترک کے ساتھ ملنے کا اتفاق ہوا۔ جو اس لڑائی میں شریک تھا۔ اس نے مجھے بتایا۔ کہ ترکی میں کوئی بھی خاندان ایسا نہیں۔ جس کے ایک یا ایک سے زیادہ افراد اس لڑائی میں نہ مارے گئے ہوں۔ اس جنگ میں عورتوں کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے اس نے ایک شاہراہ پر ایک مجسمہ کی طرف دیکھنے کا اشارہ کیا۔ جس میں تین باوردی سپاہی ہیں۔ اور ان میں سے ایک عورت ہے جو دو سپاہیوں کو اسلحہ پکڑا رہی ہے۔

عربوں نے جواب تک خلافتِ عثمانیہ کے ماتحت تھے۔ بغاوت کی اور برطانیہ کے ساتھ مل کر ترکوں سے لڑے۔ اس طرح تمام عرب ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ۱۹۲۴ء تک ترکیہ میں دوہرا نظام حکومت تھا۔ جو خلافت اور سلطانیت پر مشتمل تھا۔ سلطانیت سے دنیوی امور کا انتظام مراد تھا۔ اور خلافت کا دائرہ مذہبی امور کی دیکھ بھال اور اوقاف تک محدود۔ مگر دنیوی طاقت کے پیچھے خلافت کا گہرا اثر تھا۔ مثلاً فوج کی بھرتی، سرکاری ملازمتوں اور مقامی گورنمنٹ پر مذہبی طاقت کا اثر چھایا ہوا تھا۔ اور یہ ایک ایسا عنصر تھا جس سے بڑھ کر کسی دوسرے عنصر نے اقلیتوں میں بے اطمینانی پیدا کر کے ان کو بغاوت پر آمادہ کیا ہو۔ کمال اتاترک ان دونوں اداروں میں صاف طور پر نامطابقت دیکھ رہا تھا۔ اس نے ان اداروں کو ختم کر کے ترکی کو ایک مضبوط جدید طرز کی جمہوریہ طاقت بنا دیا۔ مگر اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکلتا کہ ترکوں نے اسلام کو خیرباد کہہ دیا۔ ان لوگوں کی طرف سے جنہوں نے ترکیہ کے موجودہ حالات دیکھے ہیں۔ اس سوال کا کہ کیا ترکیہ سے اسلام رخصت ہوا۔ ایک ہی جواب ہو سکتا ہے۔ اور وہ نفی میں ہے۔ میں نے خود ترکیہ کے کسانوں کو کھیتوں میں

لمبے بوٹ پہنے نماز باجماعت پڑھتے دیکھا ہے۔ اور ایک دوسری جگہ میں نے ترک مسافروں کو ایک ریلوے پلیٹ فارم پر سربسجود پایا۔ کوئی اور مسلمان قوم اس اسلامی حکم کی تعمیل کہ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں نہیں کرتی۔ جتنا کہ ترکیہ کے مسلمان۔ ہم پاکستانیوں کے ساتھ ان کے تعلقات ٹھوس بنیادوں پر استوار ہیں۔ ان کے ذہن میں اب تک محمد علی جوہر، ظفر علی، اور انصاری مشن کی یاد تازہ ہے۔ ترکوں اور مسلمانوں میں جو برادری کا احساس ہے۔ اور مسلم ممالک کی متحدہ سالانہ کانفرنسوں کا جو حال میں آغاز ہوا ہے وہ مسلم قومیت کا ایک جنین ہے جس میں بہت سے امکانات مضمر ہیں۔ اس کا ایک امکان تمام مسلم ممالک کا جزوی سیاسی اور پورا اقتصادی اتحاد ہے۔

ہندوستان

مکران کے ساحل سے عرب جہازران دیر سے واقف تھے۔ اور مکران کا ہندوستان کی اسلامی فتوحات میں قریباً پہلا نمبر ہے۔ مگر اندرونِ ہندوستان کے مسلمانوں کا دخل اس وقت شروع ہوا جب حجاج کی حکومت کے دور میں محمد بن قاسم نے ہندوستان کے ساحل پر دیبل کے راجہ داہر پر حملہ کیا۔ اور اس کو شکست دے کر وہ سندھ اور ملتان تک گھس گیا۔ الپتگین جو ساسانی حکمرانوں کے محافظ دستوں میں ملازم تھا۔ اور اس کی حیثیت ایک ترکی النسل غلام کی تھی۔ خراساں کا گورنر تھا۔ وہاں سے بھاگ کر وہ غزنی پہنچا جہاں اس نے اپنی ترکی النسل بادشاہت قائم کرلی جو ۱۱۸۹ء تک قائم رہی۔ اس بادشاہت کا سب سے بڑا حکمران شاہ محمود تھا جس نے ۹۹۹ سے ۱۰۳۰ عیسوی تک حکومت کی اور ۱۷ دفعہ ہندوستان پر اپنے دارالخلافہ غزنی سے یورش کی۔ محمود قنوج اور گجرات تک پہنچ گیا۔ اور اس نے کئی علاقے جو لاہور، سکھر اور ملتان کے ارد گرد تھے۔ اپنی بادشاہت میں شامل کرلیے۔ شمال مغرب میں اس کی سلطنت خراسان، ترکستان اور ایران تک پھیل چکی تھی

غزنویوں کے بعد غوریوں کا دور آیا۔ اور خاندانِ غلاماں، خاندان خلجی، خاندان تغلق، خاندان لودھی، اور سوری خاندان بھی ہندوستان کے مختلف حصوں پر حکمران رہے۔ مسلم حکومت کی ہندوستان میں بنیاد ۱۲۰۶ء عیسوی میں قطب الدین ایبک نے رکھی۔ مغل اس کے بعد آئے۔ پہلے تیمور اور پھر بابر جو مغلیہ خاندان کا پہلا بادشاہ بنا۔ اس خاندان نے ۳۰۰ سال حکومت کی اور استحکامِ حکومت کی وجہ سے ہندوستان ایک عظیم مملکت بن گیا۔ مغلیہ خاندان نے کئی نامور بادشاہ پیدا کیے۔ جن میں اکبر اعظم، جہانگیر، شاہ جہان، اور اورنگ زیب، جس کو مغلِ اعظم کہا جاتا ہے، شامل ہیں۔ اورنگ زیب کو بہت عرصہ تک دکن کی لڑائیوں میں مصروف رہنا پڑا۔ اس مغلِ اعظم کے متعلق مؤرخ مختلف رائیں رکھتے ہیں۔ وہ ایک اسلامی دل اور ضمیر رکھتا تھا۔ اور حد درجہ کا زاہد تھا۔ مگر ہندو اس سے متنفر تھے۔ اور اس کو کئی من گھڑت کہانیوں سے بدنام کرتے تھے۔ اورنگ زیب کی حکومت کے بعد ملک میں انتشار شروع ہوا۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا۔ کہ چند صوبے خود مختار

بن بیٹھے۔

یورپین قوموں نے مغل بادشاہوں سے اجازت لے کر ہندوستان کے ساحلوں پر صنعتی کارخانے لگائے تھے۔ اور ان کارخانوں میں اپنی گورنمنٹ کے حقوق بھی حاصل کر لیے تھے ۱۸۷۱ء میں ملکہ وکٹوریہ نے ایمپرس آف انڈیا کا اپنے نام کے ساتھ اضافہ کیا۔ کیونکہ اس سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت صرف ان کے کارخانوں تک محدود نہیں رہی تھی۔ کمپنی نے بنگال کی دیوانی بھی حاصل کر لی تھی۔ اور اندرون ملک مداخلت شروع کر دی تھی اور ملک کا کچھ حصہ اپنے زیرِ حکومت کر لیا تھا۔ انگریزوں کے ساتھ علاوہ ۱۸۵۷ء کے جنگِ آزادی کے سراج الدولہ اور سلطان ٹیپو کی لڑائیاں مسلمانوں کے نزدیک ایک خاص شہرت حاصل کر چکی ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد، جس کو انگریز ۱۸۵۷ء کا غدر کہتے ہیں، مغلوں کے آخری تاجدار کو جو ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر بھی تھا۔ انگریزوں نے قید کر کے رنگون بھیج دیا اور ہندوستان براہِ راست تاج برطانیہ کے ماتحت آگیا۔ اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔ ملکہ وکٹوریہ ایمپرس آف انڈیا بن بیٹھیں۔

ہندوستان مجموعی طور پر قریباً ایک ہزار سال تک مسلمانوں کے زیرِ حکومت رہا مغلوں کے عہد میں ہندوستان پر دو بیرونی حملے ہوئے۔ پہلا حملہ نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء میں کیا۔ جس میں پانی پت کے مقام پر مغلوں کو شکست ہوئی اور پایہ تخت دہلی کو خوب لوٹا گیا۔ اور قتلِ عام بھی ہوا۔ دوسرا حملہ احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۱ء میں کیا جس نے نادر شاہ کی طرح پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو، جنہوں نے مغل فرمانروا کو بے بس کر کے اپنے قابو میں لے لیا ہوا تھا، شکست فاش دی۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد برطانیہ نے ہندوستان کو چھوڑنے اور ہندوستانیوں کو حکومت منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر کیونکہ انڈین نیشنل کانگرس، جو ہندوؤں کی نمائندہ جماعت تھی، (اگرچہ اس کا بانی ایک انگریز تھا) اور مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ میں طریقِ تقسیم طاقت پر اتفاق نہ ہو سکا۔ اس لیے اس ملک کی تقسیم کا فیصلہ ہوا۔ جس کے لیے پارلیمنٹ نے قانون خودمختاری بنایا۔ قانون تقسیم یہ تھا۔ کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ وہ ان کو دے دیئے جائیں۔ اس طرح مغربی اور مشرقی ہندوستان کے حصے مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ اور باقی ملک ہندوؤں کو دیا گیا۔ اور دونوں حصوں میں ایک وفاقی قسم کی حکومت علیحدہ علیحدہ قائم ہوئی۔ راجگان اور نوابوں کی اختیار دیا گیا۔ کہ وہ جس وفاق میں چاہیں۔ شامل ہو جائیں۔ تقسیم ایک کمیشن کے ذریعہ ہوئی۔ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ایک نیا ملک یعنی پاکستان دنیا کے نقشہ پر نمودار ہوا۔ مگر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان نے وفاقِ پاکستان کے خلاف بغاوت کی، ہندوستان اور روس کے سہارے پر پاکستان سے علیحدہ ہو گیا۔ اور اپنی خودمختاری، غیر دینی اور جمہوری حکومت بنگلہ دیش کے نام سے قائم کر لی۔ مگر یہ نظام دیر تک نہ چل سکا اور آخر کار شیخ مجیب الرحمٰن کو جمہوری نظام کو خیرباد کہہ کر ایک مطلق العنان ڈکٹیٹر بننا پڑا۔ پاکستانی فوج نے طاقت کے ذریعے مشرقی پاکستان کو مغلوب کرنا چاہا تھا۔ مگر جب سارا مشرقی پاکستان، پاکستان کے خلاف ہو

اور اپنی علیحدہ فوج تیار کر چکا ہو اور ہندوستان اس کا مددگار ہوں تو اس کو طاقت سے مطیع کرنا ایک بیوقوفانہ پالیسی تھی۔ اور پاکستانی فوج کی فتح کی امید رکھنا ایک احمقانہ خیال تھا۔ چنانچہ پاکستانی فوج کو بنگلہ دیش اور ہندوستانی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے اور قریباً ایک لاکھ پاکستانی افسر اور سپاہی ہندوستان کی قید میں چلے گئے۔ بہت سے آدمی اس لڑائی میں مارے بھی گئے۔ مگر قیدی اب ایک سمجھوتہ کے تحت واپس آ چکے ہیں۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے کئی اسباب ہیں۔ اور اس علیحدگی اور خود مختار حکومت کے قیام میں کئی راز پنہاں ہیں۔ مگر جو بات کھل کر سامنے آتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ پاکستان کے اکثریت کے طبقہ نے مذہبی حکومت کو مسترد کر دیا۔ اور ان کے ایک وزیر نے فخراً پبلک اعلان کیا۔ کہ مذہب کو بنگلہ دیش سے جلا وطن کر دیا ہے۔ یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں۔ کہ مسلمانوں کی اکثریت مشرقی پاکستان میں تھی۔ پھر مجیب کی حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی اور مجیب اور اس کے حواریوں کو قتل کر دیا گیا۔ اور ایک نئی حکومت قائم ہوئی۔ یہ حکومت بھی دیر تک نہ چل سکی۔ کیونکہ ایک فوجی انقلاب نے اس کو ختم کر دیا۔ آئندہ اس بدقسمت خطے کی کیا صورت ہو گی خدا جانتا ہے۔

ہسپانیہ (اُندلس)

لاکھوں نہیں کروڑوں سال پہلے کی بات ہے۔ کہ وہ قطعہ آب جس کو بحیرہ روم کہتے ہیں ایک بڑے نشیب میں ایک چھوٹی سی جھیل تھا۔ اور وہ آبنائے جس کو اب جبل الطارق کہتے ہیں ایک خاکنائے تھی۔ جو ہسپانیہ اور پرتگال کے خشکی کے طبقہ کو مراکش سے جوڑتی تھی۔ جب قطب شمالی کا برف کا بڑا تودہ جس کو برف کی ٹوپی کہتے تھے پگھلا تو بحرِ ظلمات کی سطح اونچی ہو کر پانی اس خاکنائے کو عبور کر کے نشیبی جھیل میں داخل ہو گیا۔ اور موجودہ بحر روم وجود میں آیا۔ مگر جس زمانہ کی ہم بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کل کی بات ہے۔ جبکہ آبنائے جبل الطارق وجود میں آ چکی تھی۔

یہ ۷۱۱ء کی بات ہے۔ کہ طارق نے ہسپانیہ پر حملہ کیا۔ آبنائے جبل الطارق کو جو انہیں کے نام سے منسوب ہے۔ عبور کیا۔ اور اپنی کشتیوں کو جلا کر ملک کے اندر داخل ہو گیا۔ اس سے تھوڑے عرصہ بعد عبداللہ ہسپانیہ پہنچ گئے اور انہوں نے اس ملک کا کافی حصہ اپنے تصرف میں کر لیا۔

قارئین کو یاد ہو گا کہ جب ابوعباس یعنی خلفائے عباسیہ کا پہلا خلیفہ خاندان بنو اُمیہ کے افراد کو چن چن کر قتل کر رہا تھا تو عبدالرحمٰن شام سے بھاگ کر مصر اور شمالی افریقہ کے راستے اندلس جو ہسپانیہ کا جنوبی حصہ تھا جا پہنچا تھا۔ اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے ہسپانیہ میں خاندان بنو اُمیہ کی حکومت کی بنیاد ڈال چکا تھا۔ اس وقت سے ہسپانیہ میں ایک خوشحال، فارغ البال، اور شان و شوکت کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ عبدالرحمٰن کے عہد میں، جس کی حکومت ۹۱۲ سے ۹۶۲ تک رہی، ہسپانیہ میں ایک بے نظیر تہذیب جس کی دنیا مثال پیش

نہیں کر سکتی تھی۔ اپنے اوج پہ پہنچ چکی تھی۔ خاندان بنو اُمیہ کی حکومت ہسپانیہ میں ۷۵۵ء سے ۱۰۱۶ء تک رہی۔ اور پھر اس کے بعد چھوٹے چھوٹے مسلمان حکمرانوں میں بے اتفاقی اور حسد نے گھر کر لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹے چھوٹے امیر ایک دوسرے کے حاسد اور دشمن ہو گئے اور انہوں نے آپس میں خانہ جنگی شروع کر دی ان صوبوں نے جو اب تک عیسائیوں کے قبضہ میں تھے۔ اسی رقابت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ آنے والے خطرے اور انتشار کا احساس امیر سیویل کو ہوا۔ اور اس نے یوسف بن تشفین کو مراکش سے مدد لے کر آنے کو کہا۔ یوسف نے یہ دعوت قبول کی۔ اور ہسپانیہ پہنچ گیا۔ جہاں اس نے الفانسو چہارم کو ۱۰۸۶ء میں شکست دے کر خود شہنشاہِ ہسپانیہ کا لقب اختیار کر لیا۔ کچھ عرصے کے بعد یوسف واپس مراکو چلا گیا۔ مگر اس کو پھر بلوایا گیا۔ اس نے آکر چھوٹی چھوٹی بادشاہتوں کو اپنی بادشاہت میں شامل کر لیا۔

بارھویں صدی عیسوی میں ہسپانیہ میں اسلامی حکومت کے تنزل کے آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے مگر مراکش کے نوجوانوں نے اس تنزل کو روک لیا۔ اب اگرچہ ہسپانیہ کا آدھا حصّہ مسلمانوں کے پاس تھا۔ چھوٹے چھوٹے مسلمان حکمرانوں اور امیروں نے اپنے آپ کو عیسائیوں کی بڑھتی ہوئی قوت کا مقابلہ کرنے کے ناقابل پایا۔ مگر ایک دفعہ عبدالمومن نے تمام ہسپانیہ کو فتح کر کے متحد کر لیا۔ اور عیسائیوں کی یلغار کو روک لیا۔ مومن کا پوتا مومن سے بھی زیادہ دور اندیش اور طاقتور ثابت ہوا۔ اس نے نہ صرف اپنی مملکت کا نظام مضبوط کیا۔ بلکہ سلطان صلاح الدین کو بھی صلیبی جنگوں میں مدد دی۔ مگر اس کا بیٹا عبدالناصر کمزور ثابت ہوا اور ۱۲۱۴ عیسوی میں عیسائیوں سے شکست کھا گیا۔ اب مسلم امیروں نے عیسائی غلبہ کو تسلیم کرنا شروع کر دیا۔ مگر بنو احمر ڈٹے رہے۔ اور غرناطہ پر قابض رہے۔ جس کو انہوں نے دنیا میں خوبصورت ترین شہر بنا دیا تھا۔ آخر کار مسلمان فرمانروا ابو عبداللہ نے عیسائیوں کے مقابلہ سے قاصر ہو کر شہر ان کے حوالہ کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اندلس میں مسلمانوں کی ۸۰۰ سالہ حکومت ختم ہو گئی۔ اور آخری مسلمان اس سرزمین سے نکال دیا گیا۔
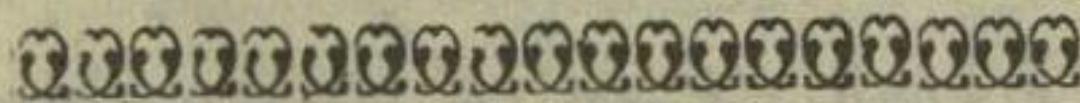
باب ۹

مسلمان کا تشخّص

اس باب کے نفسِ مضمون سے میرا یہ مدعا نہیں کہ مسلمان کی قانونی یا شرعی تعریف کی وضاحت کر دوں۔ ابتدائے اسلام سے ایسی تعریف ایک متنازعہ مسئلہ رہا ہے۔ اس سلسلہ میں دو احادیث کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ رسول اللہؐ سے منسوب ایک حدیث کے مطابق اسلام میں ۷۳ فرقے ہوں گے جن میں سے صرف ایک کو بہشت حاصل ہوگا۔ یہ پوچھنے پر کہ وہ کون سا فرقہ ہوگا جو بہشت میں جائے گا؟ آپ نے فرمایا کہ وہ فرقہ جو میری اور صحابہ کی پیروی کرتا ہے۔ اہلِ سُنت والجماعت نے اپنے آپ کو یہ مخصوص فرقہ بیان کر کے اس کو فرقۂ ناجیہ کا نام دیا (مشکات کتاب اول باب ۶ حصہ دوم) شیخ عبدالقادر صاحبؒ کے مطابق اسلام میں ۱۵۰ فرقوں سے کم فرقے نہیں۔ ان تہتر فرقوں کی تفصیل غیاث اللغات میں درج ہے اور ان میں ایک فرقہ شیطانیہ بھی کہلاتا ہے۔ دوسری حدیث کے مطابق سب فرقے سوائے ایک کے بہشت میں جائیں گے۔ یہ مسئلہ اس باب کے مقصد کے دائرے میں نہیں آتا۔ کیونکہ اس باب میں میرا مدّعا قطع نظر عقیدہ اور ایمان کے، جو کسی اور باب میں تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں، اس کردار اور عمل پر بحث کرنا ہے جس کی اسلام نے تاکید کی ہے۔ کیونکہ یہ عمل اور کردار ہی ہے جو ظاہرہ طور پر اسلام کو دوسری قوموں اور دوسرے مذاہب سے ممیز کرتا ہے۔ عقیدہ، ایمان اور عبادت انسان اور خدا کے درمیان معاملات ہیں۔ اگر عقیدہ، ایمان اور عبادت انسان کے سماجی، معاشرتی اور معاشی افعال اور اعمال پر اثر انداز نہیں ہو سکتے اور پختہ ایمان اور عقیدہ رکھتے ہوئے مسلمانوں کا عمل دوسری قوموں جیسا ہی ہو یا اس سے بھی بدتر، تو پھر وہ خیر اُمتہٍ، جن الفاظ سے مسلمانوں کو خدا نے یاد کیا ہے، کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ ایک دوسری جگہ قرآن مسلمانوں کو اُمتہً وسطاً کا نام دیتا ہے۔ جس کے معنی بعض مفسرین اعلیٰ درجے کی اُمت کے لیتے ہیں۔

ایک تیسری جگہ قرآن میں فرمان ہے کہ مومن صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں رکھتے بلکہ اپنی دولت اور ذات سے اللہ کے بتائے ہوئے راستہ پر

چلتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو صادق کہلانے کے مستحق ہیں۔ ⁴⁹⁄₁₅

خیر امتاً کا لفظ مسلمانوں کے لیے استعمال کرنے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ خود ہی راہ راست پر نہیں چلتے بلکہ دوسروں کو سیدھے راستے پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں (۳/۱۱۰) علامہ اقبال کی رائے میں نبی کے مذہبی تجربے کو پہچاننے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کا مذہب کس طرح کا انسان پیدا کرتا ہے؟ اس باب میں میں اس رائے پر صرف ضمنی بحث کروں گا۔ مگر اس خیال سے ملتی جلتی ایک بات کا تفصیل سے ذکر کروں گا اور وہ یہ ہے کہ اسلام کا منشاء کس کردار اور عمل کے انسان پیدا کرنا تھا؛ مسلمانوں کو بعض باتوں پر یقین لانا پڑتا ہے۔ مگر تاوقتیکہ یقین یا ایمان کسی ظاہرہ فعل سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ یہ ایک ذہنی یا دماغی حالت ہو کر رہ جاتا ہے یا صرف ایک خیال یا نظریہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ عقیدہ کے علاوہ مسلمانوں کو چند مذہبی فرائض انجام دینے پڑتے ہیں جن کو عمل یا افعال کا درجہ دیا جاتا ہے اور اس واسطے یہ دوسرے انسانی افعال کی طرح ایک ظاہری پہلو رکھتے ہیں۔ تیسری بات جسے مسلمانوں کو دوسری قوموں سے ممیز کرنا چاہیئے۔ وہ ان کا اخلاقی یا سماجی عمل ہے جس کا دوسرے لوگوں پر اثر پڑتا ہے اور اسی وجہ سے ان کو خیراً امتاً کہا گیا ہے اس لیے ضروری ہے کہ پبلک یا نجی زندگی میں مسلمانوں کا عمل ان اوصاف کا مظہر ہو، جس کی قرآن اور حدیث میں تاکید کی گئی ہے۔ قرآن میں کسی جگہ بھی مسلمان کو کوئی خاص حق نہیں دیا گیا ہے تاوقتیکہ اس کا عمل عقیدے سے متاثر نہ ہوتا ہو۔ جس آیت میں مسلمانوں کو امتاً وسطاً کہا گیا ہے اس کی تفسیر میں علماء میں اتفاق نہیں۔ لفظی ترجمہ اس آیت کا یہ ہے:

"اس وجہ سے ہم نے تم کو درمیانی اُمت مقرر کیا ہے تاکہ تم دوسرے لوگوں کے متعلق شہادت دے سکو جیسا کہ نبی آپ کے متعلق شاہد ہیں"

بعض مفسرین نے وسطاً کا ترجمہ متوازاً، بعض نے مثالی یا اعلےٰ اور بعض نے وسطی کیا ہے۔ احقر کے خیال میں اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ایک درمیانی اُمت ہیں۔ کیونکہ جیسے مسلمان دوسرے لوگوں کے عمل پر نظر رکھتے ہیں اسی طرح رسول اللہ مسلمانوں کے عمل کے نگران ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کا مقام رسول اللہ اور دوسرے لوگوں کے درمیان ہے۔ بہرحال یہ آیت مسلمانوں کو وہ درجہ نہیں دیتی جو خیرً امتاً کی آیت۔ قرآن اور انجیل میں مختلف قوموں کا ذکر آتا ہے جو دُنیا کے مختلف حصوں میں رہتی ہیں۔ اس لیے یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ اسلام ان تفرقات کو، جو لوگوں کے مختلف علاقوں میں رہنے کی وجہ سے پائے جاتے ہیں یا اختلافِ نسل یا زبان سے پیدا ہوتے ہیں، بالکل نظرانداز کرتا ہے۔ ایسے اختلافات اُمت کے مختلف طبقوں کی نشاندہی کرتے ہیں جو ایک رشتہ اور برادری میں بندھے ہوئے ہیں۔ جس بات پر

اسلام مصر ہے وہ یہ ہے کہ ان تفرقات کے باوجود مسلمان ایک واحد قوم ہیں۔ جو بات ان کو دوسری قوموں یا افراد سے ممیز کرتی ہے وہ ان کا عقیدہ اور مذہبی رسوم کی ادائیگی ہی نہیں بلکہ ان کا یکساں اخلاق اور سماجی عمل ہے۔ جو دوسری قوموں یا افراد کے عمل پر سبقت رکھتا ہو۔ ایمان اور دینی رسوم و فرائض ایک امتیازی نشان ضرور ہیں۔ مگر اصل بات جو مسلمانوں کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ انکے اخلاقی، معاشرتی اور کاروباری اعمال ہیں۔ جو مسلمانوں کو ایک مہذب معاشرے میں دوسروں کے ساتھ کسی نہ کسی قسم کے تعلقات رکھنے پر مجبور کرتے ہیں اور ان معاملات میں ان کا طرزِ عمل نہ صرف آپس میں بلکہ دوسروں کے ساتھ ایسا ہونا چاہیئے جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ اپنے عمل کی وجہ سے مسلمان ایک مختلف جماعت ہیں۔ کیونکہ ان میں وہ اخلاقی اور معاشرتی محاسن پائے جاتے ہیں جو قرآن اور حدیث ان پر فرض قرار دیتے ہیں۔ قرآن اور سُنہ مسلمانوں کے لیے اخلاقی اور معاشرتی اوصاف کا واضح معیار مقرر کرتے ہیں جن پر عمل کر کے ہی ایک شخص اپنے آپ کو مسلمان کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔
اگر ان احکام پر عمل نہ کیا جائے اور مسلمان صرف یہ سمجھ بیٹھیں کہ ظاہرہ طور پر مذہبی رسوم کا ادا کرنا ان کی نجات کا باعث بن سکتا ہے یا ان کو بہترین اُمت کا فرقہ بنا سکتا ہے جو کہ اللہ اور رسول کا منشاء تھا تو یہ کہنے والا حق بجانب ہو گا کہ مسلمان بھی یہودیوں کی طرح اللہ کے ساتھ سودا ادا کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے یہ سمجھ لینا یقیناً غلطی ہے کہ صرف دینی رسوم کی ادائیگی یا تعبدیت ان کے گناہوں کو دھو دے گی یا ان کی بداعمالی کی ذمہ داری سے ان کو سبکدوش کر دے گی۔ کیونکہ اللہ محتسب ہے جو سب کے اعمال کا حساب لے گا۔ خود قرآن میں جتایا گیا ہے کہ "صرف مغرب یا مشرق کی طرف رخ کرنا تقویٰ کا معیار نہیں"۔

احادیث نے بھی نیک اعمال پر زور دیا ہے اور بُرے کاموں کی مذمت کی ہے۔ خاص طور پر ان کاموں کی جن کا تعلق صرف اپنی ذات سے نہیں مثلاً سُود دینا یا لینا، محتاجوں اور غرباء کو خیرات دینا، ظلم کی مخالفت، خود ظلم اور زیادتی کرنے سے احتراز کرنا، مظلوموں کی امداد، اجناس میں ملاوٹ، امانت میں خیانت، یتیموں کا مال خورد برد کرنا، بے جا اور ناحق تصرف، والدین اور رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے ساتھ شفقت، حلیم الطبعی، غرور اور تکبر سے احتراز، دھوکا یا فریب دینے کی ممانعت، باہمی صلح اور نیک نیتی، کسی پر بے جا الزام دھرنے کی مذمت، سچائی، مذہبی رواداری، نیک اعمال اور اخوت۔ ان سب باتوں کی جو قابلِ تعریف ہیں یا قابلِ مذمت وضاحت کی گئی ہے اور یہ سب افعال ان کے علاوہ ہیں جو قابلِ تعزیر ہیں۔
اوامر و نواہی کی فہرست جو اسلام دیتا ہے وہ کسی دوسرے مذہب میں اس تفصیل سے نہیں پائی جاتی۔ ہم میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں تقریباً چودہ سو سال کا فرق ہے اور اس

عرصہ میں معاشرے میں بہت سی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ مگر اس کے باوجود مندرجہ بالا احکام آج کل بھی اسی حیثیت کے حامل ہیں جیسا کہ رسول اللہ کے زمانے میں تھے۔ ایمان اور عمل اسلام کا ست ہیں۔ کیونکہ اسلام صرف انسان کے اس رشتہ پر مبنی نہیں جو اس کو اللہ کے ساتھ ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد ایک صادق مسلمان کے لیے ایک سی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایمان اور دینی رسوم اور تعبدیات ضروری ہیں مگر صرف یہ باتیں عمل صالح کے بغیر مسلمانوں کو اس اخلاقی رفعت اور اعلیٰ مقام پر نہیں لے جاسکتیں جو کہ ایک مسلمان کا امتیازی نشان ہونا چاہیئے۔ مزید براں کیونکہ اسلام مسلمان کے لیے ایک معاشرتی ضابطہ بھی مقرر کرتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام ایک طرز زندگی ہے جس میں نیکی کا عنصر غالب ہے۔ قرآن اپنی ۱۱۴ سورتوں میں کہیں یہ کنایتہً بھی نہیں کہتا کہ صرف اللہ اور رسول پر ایمان لانا ایک مسلمان کے لیے کافی ہے۔ (بحوالہ شاکر رضوانی۔ پاکستان ٹائمز مورخہ ۱۶ را پریل ۱۹۷۳ء) اس لیے کوئی شخص صرف مسلمان کہلا کر اپنے آپ پر فخر نہیں کر سکتا۔ جبکہ اس کی عملی زندگی اور کردار ایسے ہی سیاہ اور قابلِ نفرت ہوں جیسے غیر مسلموں کے۔ جہاں مسلمان ایک ایسے معاشرہ میں رہتے ہوں جس میں مختلف المذاہب لوگ بھی آباد ہوں تو مسلمانوں پر ایک بھاری فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے دینوی معاملات میں اپنے طرزِ عمل سے ثابت کریں کہ وہ دیانت داری، راست گوئی اور دیگر اخلاقی و معاشرتی اقدار کے لحاظ سے ایک انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہر شخص جس کو کسی مسلمان سے واسطہ پڑے محسوس کرے کہ اس کا معاملہ ایک ایسے شخص سے ہے جس پر کسی بے ایمانی اور دغا کا شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تجربہ اور مشاہدہ اس کے بالکل برعکس ہے اور مسلمان ایسے ہی نیک و بد افعال کے مرتکب ہوتے ہیں جیسے دوسرے مذاہب کے لوگ اور یہ کہنا کہ مسلمان اپنے نیک اعمال میں بے مثل ہیں یقیناً مبالغہ ہو گا۔ اس لیے یہ سوال پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کیا اسلام ایک خاص خوبیوں کا انسان پیدا کرنے میں کامیاب ہوا ہے؟ یہ کہنا تو بے شک غلط ہو گا کہ اسلام اپنے مشن میں ایسا ہستیاں پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے جن کو بہترین اُمت کے افراد نہیں کہا جا سکتا۔ اس الزام کو جھٹلانے کے لیے کہ اسلام نے کوئی خاص ضابطۂ حیات یا خاص اخلاقی قوت رکھنے والے انسان کبھی پیدا نہیں کئے ابتدائے اسلام کی تاریخ پڑھنا کافی ہو گا۔

عیسائی بھی اپنے آپ کو حضرت عیسےٰ کے الفاظ کے مطابق، جو آپ نے اپنے پہاڑی وعظ میں استعمال فرمائے، ایک خاص اُمت یا برادری سمجھتے ہیں۔ یہ بات اُن کے لیے بہت قابلِ فخر ہے کہ عیسائی قوم میں آج کل بھی ایسے بہت سے افراد ہیں جنھوں نے حضرت عیسےٰؑ کی

نصیحتوں کو سینے میں اُتار کر اپنی زندگیاں اور اموال انسانی فلاح کے لیے وقف کر دیتے ہیں اور مفلسی اور غربت کی زندگی کو عیش و عشرت کی زندگی پر ترجیح دی ہے۔ دُنیا کے دور دراز حصّوں میں، جہاں سوائے دشوار زندگی اور محنت شاقہ کے کچھ حاصل نہیں، قطبین کی تنہائیوں میں، افریقہ کے گھنے اور تاریک جنگلوں میں اور دورِ حاضرہ کے مہذب شہروں میں انھوں نے تعلیمی اور طبّی مراکز کھول رکھے ہیں۔ دُنیا کا مشہور ادارہ "صلیبِ احمر" جو انسانی خدمت کے لیے وقف ہے خالص عیسائی ادارے سے شروع ہُوا۔ ڈاکٹر شویٹزر جیسے لوگ دُنیا میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔ جنھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصّہ انسانی دکھوں کو کم کرنے کے لیے لمبرین کے جزائر میں گزارا۔ اسی طرح ایک معمر عیسائی خاتون (TERESA) جس کو زندگی میں ہی سینٹ کا مرتبہ مل چکا ہے حالانکہ یہ درجہ مرنے کے بعد ملتا ہے، کلکتہ میں ۲۶ چھبیس سال سے زیادہ غریب سے غریب اور ہر قسم کے مصیبت زدہ انسانوں کی کلکتہ کی تاریک اور گندی گلیوں میں ہر قسم کے معذور انسانوں کی خدمت میں مصروف ہے اور آج کل ۳۲ بتیس اداروں میں، جہاں لوگ بسترِ مرگ پر پڑے موت کا انتظار کر رہے ہیں، ۶۷ جزائر کے ہسپتالوں اور ۲۸ معذور بچوں کے اداروں میں خدمتِ خلق کے جذبہ سے سرشار ہو کر کام کر رہی ہیں اور اسی کام کو انھوں نے اپنا مقصدِ حیات سمجھ رکھا ہے۔

ان مثالوں کے مقابلہ میں ہم مسلمانوں کو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ دُنیا کے امیر ترین مسلمانوں نے بھی ایسے خیراتی اور فلاحی اداروں میں دلچسپی تک نہیں لی۔ تیل کے چشموں کے مالک مسلمان بادشاہوں، صنعتی اور بنکاری کے امراء نے بھی انسانی بہتری کے ایسے اداروں میں کوئی قابلِ ذکر کردار ادا نہیں کیا۔ مسلمانوں کے چند تعلیمی ادارے اور یتیم خانے ضرور ہیں مگر وہ سب تجارتی اصولوں پر چلتے ہیں۔ کچھ لوگ ان کو چندہ یا یکمشت روپیہ دیتے ہیں۔ مگر انکم ٹیکس کی تخفیف کی غرض سے یا زکواۃ سمجھ کر۔ مسلمان جہازرانوں اور بڑے بڑے سوداگروں میں کتنے لوگ ہیں جنھوں نے اپنی دولت کو خواہ وہ جائز طریقہ سے حاصل کی گئی ہو یا ناجائز طریقہ سے، بیماری اور انسانی تکالیف کے کم کرنے میں یا ان مسلمانوں کو، جو غریب، محتاج اور بے زر ہیں ابتدائی یا اعلےٰ تعلیم حاصل کرانے کے لیے اپنی جیب ہلکی کی ہو۔ عیسائیوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان خیراتی اداروں کا مقصد عیسائیت کی تبلیغ یا کوئی سیاسی غرض ہے اور ان کا ہمدردیٔ عوام کا دعوےٰ صرف ایک دھوکا ہے۔ فرض کیجیے کہ یہ سب کچھ درست ہے مگر اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان جن پر تبلیغ ایک فرض ہے کیوں ایسا نہیں کرتے؟ کیا اسلام کو بذریعہ تبلیغ فروغ دینا جرم، گناہ، غیر ضروری یا قابلِ نفرت ہے۔ مگر ان حالات کو جو میں نے ابھی بیان کئے ہیں بطور قاعدہ کلیہ نہیں لینا چاہیئے جس کی کوئی مستثنیات نہیں۔ اس کے برعکس بہت

سی مثالیں آج کل بھی ملتی ہیں جو مردِ مومن کی تعریف میں آتی ہیں ۔ ان کا بھی ذکر کیا جائے گا اور ان اسباب کی تفصیل بیان کی جائے گی جن کی وجہ سے مسلمان قعرِ مذلّت میں گرے پڑے ہیں اور اپنی مسلمانی کی خصوصیّت کو سوائے مردم شماری کے رجسٹر میں اندراج اور ظاہرہ دینی رسوم کی ادائیگی کے خیر باد کہہ چکے ہیں ۔

پاکستان میں جس کا نام جمہوریہ اسلام ہے حالات بدلنے شروع ہو گئے ہیں ۔ غریبوں کی حالت بہتر بنانے ، اُن میں ابتدائی تعلیم عام کرنے اور اعلےٰ تعلیم کی حوصلہ افزائی کی کوشش ہو رہی ہے اور مفلس اور نادار عوام کے لیے علاج کی سہولتوں کا بھی آغاز ہو چکا ہے مگر یہ سب کوششیں آٹے میں نمک کے برابر ہیں ۔ تاہم حکومت اپنے فرائض کو سمجھتی ہے مگر اس سعئ بہبود میں عوام النّاس یا امراء کا کوئی حصّہ نہیں ہے ۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں معاشرہ کی برائیاں بدستور چلی آتی ہیں بلکہ کئی وجوہات کے باعث ان میں اضافہ ہُوا ہے ۔ دیکھئے " نوائے وقت " مورخہ ۱۳ ر اگست میں ایک صاحب سیّد رضی جعفر پاکستان کی کیا تصویر کھینچتے اور کیا سوال پوچھتے ہیں ۔

" کیا کراچی اور بمبئی یا اسلام آباد اور دہلی کی عمومی زندگی میں کسی قسم کا فرق نظر آتا ہے ۔ کیا نام کے علاوہ دونوں ملکوں کے حکام کے انداز ، فکر و عمل میں کسی اور قسم کا فرق محسوس کیا جا رہا ہے ؟ کیا کراچی سے پشاور تک کے وسیع و عریض علاقہ میں چوری ، رشوت ستانی ، ڈاکہ زنی ، بدعنوانی ، قتل و غارت ، بدکاری ، شراب نوشی ، بے حیائی ، عریانی ، حیاء سوزی اور بد دیانتی جیسی بیماریاں اسی طرح پاکستانی معاشرے کا خُون نہیں چُوس رہیں جس طرح بمبئی سے کلکتہ تک ؟ کیا دونوں ملکوں میں قانونی یا معاشرتی لحاظ سے کسی قسم کا فرق نظر آتا ہے ؟ کیا یہاں کا عام شہری ان معاشرتی چیرہ دستیوں سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے جو بھارت میں ہوتی ہیں ؟ کیا یہاں کے حکام میں وہ خرابیاں ناپید ہیں جو انگریزوں کے زمانے میں متحدہ برِ صغیر میں تھیں ؟ کیا یہاں کے دفاتر میں وہ ناانصافیاں نہیں ہوتیں جو بھارت میں ہوتی ہیں ؟ کیا یہاں کے وزیر اور افسران عوام کے مفادات کو اس طرح پامال نہیں کرتے جس طرح کہ آزادی سے پہلے کرتے تھے " ؟

سیاہ بازاری ، سرمائے اور اجناس کا خلاف قانون ملک سے نکاس ، عورتوں اور بچوں کا اغواء ، زناء بالجبر ، دھوکہ دہی اور فریب وغیرہ کو جعفر صاحب اپنی فہرست میں شامل نہیں کرتے ۔ یہ کارہائے نمایاں اس قوم کے ہیں جس کو اللہ تبارک و تعالےٰ خیراً اُمتاً کا لقب دیتا ہے ۔

مردانِ مومن ، حضرت ابو بکرؓ

خُلفاء راشدین کے اوصاف کا مجملاً پہلے ذکر آچکا ہے مگر اُن کی سیرت اور کردار کا دوبارہ اور تفصیل کے ساتھ جائزہ لینا اس مرحلے پر اسس لیے ضروری ہے تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ اسلام نے کیسے کیسے مصمم ایمان اور نیک خصلت والے انسان پیدا کئے۔ حضرت ابو بکرؓ کے متعلق ایک مشہور یورپی مؤرخ ایچ جی ویلز جس کو اسلام سے کوئی محبت اور ہمدردی نہیں اپنی کتاب (OUTLINE OF THE HISTORY OF THE WORLD) میں رقمطراز ہے: "اگر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اسلام کا قلب سمجھا جائے تو ابو بکر رضی اللہ عنہ اسلام کا ضمیر تھے۔ دُنیا کے کسی بھی نظام میں اب تک اُن سے زیادہ مخلص انسان پیدا نہیں ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے منہ سے بات نکلتی تھی اور ابو بکرؓ اس پر سب سے پہلے یقین لاتے تھے۔ آپ پر سب سے پہلے ایمان لانے والے بالغ فرد حضرت ابو بکرؓ تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تو ابو بکرؓ اور آزاد شدہ غلام بلالؓ ان کے ساتھ تھے اور غارِ ثور میں تین دن تک قیام کے دوران ان کے ساتھ رہے۔ انہوں نے قرآن پاک کی منتشر آیات کو جمع کرنے کا کٹھن کام بھی اپنے ذمّے لیا۔"

اسلام قبول کرنے سے پہلے حضرت ابو بکرؓ کا چال چلن اور خصلت بے داغ تھے اور اسلام پر ایمان لانے کے بعد تو وہ ایک مثالی مومن بن گئے۔ شروع سے ہی ان میں انسانی ہمدردی کا جذبہ غالب تھا۔ غریبوں کے ساتھ آپ نے شروع سے ہی ہمدردی کا برتاؤ کیا اور ان کی مدد کی۔ وہ اپنی بکریاں خود چراتے تھے اور دوسروں کی بکریوں کا دودھ دوہتے تھے۔ آپ نے اپنی خلافت کے زمانے میں نہ کوئی محل تعمیر کیا اور نہ ہی قیمتی لباس پہنا۔ ان کا کھانا اور کپڑے سادگی کا نمونہ تھے اور جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے اپنی دُختر حضرت عائشہؓ کو، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی چہیتی بیوی تھیں، ہدایت کی کہ بوقتِ مرگ جو کپڑے انہوں نے پہنے ہوئے ہوں ان ہی کے ساتھ آپ کو دفن کر دینا۔ بیت المال سے وہ برائے نام تنخواہ لیتے تھے اور وفات سے پہلے آپؓ نے اپنے پسماندگان کو ہدایت کی کہ وہ ایک قطعۂ زمین کو جو ان کی ملکیت تھی فروخت کر کے اس تنخواہ کی ادائیگی کر دیں جو اس وقت تک وہ خزانۂ عامرہ سے وصول کر چکے تھے۔ وفات کے وقت آپ کا سارا اثاثہ پانچ طلائی سکّے تھے۔ آپ کے جانشین حضرت عمر فاروقؓ نے آپ کی وفات کے بعد سچ کہا کہ حضرت ابو بکرؓ ایک چٹان کی طرح تھے، جس کو کوئی طوفان نہیں ہلا سکتا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی

خواہش کے مطابق اسامہ بن زیدؓ کی قیادت میں لشکر شام کی طرف روانہ ہُوا تو آپ کچھ فاصلہ تک اسامہؓ کے ساتھ، جو گھوڑے پر سوار تھے، پیدل چلے اور اسامہؓ کے بار بار اصرار کے باوجود گھوڑے پر سوار نہ ہُوئے۔ واپس ہوتے ہُوئے آپ نے مجاہدین سے خطاب کیا اور ان کو ہدایت فرمائی "کہ کوئی شخص خیانت بے جانہ کرے، دوسروں کا مال غصب نہ کرے، بچّوں، عورتوں اور ضعیف آدمیوں کو نہ مارے، جو وعدہ کرے اُس سے انحراف نہ کرے، کھجور اور دیگر ثمردار درختوں کو نہ کاٹے، کسی اونٹ، بکری اور گائے کو نہ مارے، جب تک گوشت کی ضرورت نہ پڑے۔ مزید فرمایا کہ راستہ میں آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جنہوں نے اپنے آپ کو عبادت کے لیے خانقاہوں میں بند کیا ہُوا ہے ایسے لوگوں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے اور نہ ان کے کاموں میں کسی قسم کی مداخلت کی جائے۔"

حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے بہت سے غلاموں کو، جن میں حضرت بلالؓ اور ایک لونڈی شامل تھے، آزاد کیا اور غلاموں کو بھی آپ نے آزاد کرا کر فدیہ اپنی گرہ سے دیا۔ خلیفہ چُنے جانے کے بعد آپ کا خُطبہ حاکم اور رعایا کے درمیان تعلقات کا ست ہے۔ آپ نے فرمایا "مجھے آپ نے خلیفہ منتخب کیا ہے۔ جب تک مَیں نیک کام کروں میری مدد کرو۔ مجھ سے غلطی ہو جائے تو میری اصلاح کرو۔ میرے نزدیک کمزور وہ لوگ ہیں جو دوسروں کا حق ادا نہیں کرتے۔ خواہ ظاہرہ طور پر وہ کتنے ہی طاقت ور ہوں اور طاقت ور وہ لوگ ہیں جن کا حق خلافِ قانون طاقت وروں نے چھینا ہو۔ میری اطاعت کرو جب تک مَیں اللہ تعالےٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کی اطاعت کروں۔ اگر مَیں ان دونوں میں سے کسی سے انحراف کروں تو آپ پر میری اطاعت لازمی نہیں۔"

حضرت عمرؓ

حضرت عمرؓ کے کردار کا اندازہ زیادہ تر ان بیانات سے لگایا جا سکتا ہے جو آپ کے زمانے کی لڑائیوں اور فتوحات سے متعلق ہیں۔ آپ کا مدینہ سے یروشلم تک کے سفر میں اکیلے ایک اُونٹ پر سوار ہونا، اپنے ساتھ صرف ایک ملازم رکھنا، یروشلم پہنچنے پر آپ کا زرق برق لباس پہنے مجاہدین کو انتباہ، آپ کا عیسائیوں اور دوسرے مفتوحہ لوگوں کے ساتھ رواداری کا سلوک، کوفہ کے گورنر کو آپ کا خط۔ (یہ سب باتیں پہلے بیان کی جا چکی ہیں) اسلام کی تبلیغ کے جوش اور مفتوحہ لوگوں کے ساتھ رواداری کے سلوک میں حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ آپ اپنی مثال تھے۔ آپ کا عجز، انکساری، سادگی اور خلوص ضرب المثل تھیں۔ آپ سادگی پسند

تھے۔ اگرچہ درشت مزاج کے مالک تھے۔ مگر یہ درشتگی یا سختی صرف اسلام کی سادگی اور اُس کی پاکیزگی قائم رکھنے اور اس کو قابل اعتراض آمیزشوں سے پاک رکھنے کی غرض سے تھی۔ آزمائش میں، خواہ وہ کتنی ہی سخت اور کٹھن کیوں نہ ہو، آپ اپنا توازن قائم رکھتے تھے اور کبھی حراساں نہ ہوتے تھے اور نہ ہی آپ کی طبیعت میں کسی قسم کا کھچاؤ پیدا ہوتا تھا۔ عوام سے اپنے پہلے خطبہ میں آپ نے اپنی سخت مزاجی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اور حضرت ابوبکرؓ کا ذکر کرتے ہوئے لوگوں کو یقین دلایا کہ آپ کے کندھوں پر پوری ذمہ داری کا بوجھ پڑ جانے کی وجہ سے آپ کی طبیعت کی سختی حلم اور رحم میں تبدیل ہو چکی ہے۔ مگر ان لوگوں کے ساتھ، جو مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں یا ان کے حقوق غصب کرتے ہیں" وہ حسب معمول سخت گیر ہی رہیں گے۔" مزید فرمایا: اے لوگو! مجھ پر آپ کے حقوق ہیں جو آپ مجھ سے طلب کر سکتے ہیں۔ آپ کا مالِ غنیمت میں بھی حصّہ ہے اور آپ مجھے اس مال سے اپنے لئے غلط طور پر حصّہ لینے سے روک سکتے ہیں۔ آپ کی سرحدوں کی حفاظت ہمارا ذمّہ ہے اور آپ یہ فرض مجھ سے پورا کرانے کا حق رکھتے ہیں اور جب آپ جنگ پر جائیں تو اپنے کنبوں کے لیے اپنے مشاہروں میں اضافہ طلب کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ سے ڈرو اور میرے قصور معاف کرو۔ میرے ساتھ تعاون کرو۔ نیک کاموں کی ترقی اور بدی کم کرنے میں میری مدد کرو۔"

ایک سال ملک کے ایک حصّہ میں طویل خشک سالی رہی جس کی وجہ سے اس خطّہ کو قحط اور مختلف امراض نے آگھیرا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے خوراک کی کفایت پر اور سادگی پر زور دیا اور قحط زدہ علاقہ کے لوگوں کی مدد کی طرف رغبت دلائی۔ سرقہ کی شرعی سزا قطع یدین (ہاتھ کاٹنا) کو معطل کر دیا۔ ایک نئے مقرر شدہ قاضی کو ہدایت دیتے ہوئے آپ نے اس بات پر زور دیا کہ انصاف کے معاملے میں کسی قسم کی تمیز یا ترجیح روا نہ رکھی جائے۔ اور غصّہ، چڑچڑاہٹ اور جلد بازی سے پرہیز کیا جائے۔ آپ کے زمانے میں مملکت کی حدود بہت وسیع ہو چکی تھیں اور دوسرے ملکوں سے جو سیاسی قاصد یا سفیر آپ سے ملاقات کے لیے آتے تھے تو دیکھتے تھے کہ کسی محل میں کسی مسند نشین سے ملنے کے لیے جانے کے بجائے انہیں ایک موٹے کپڑے کے خیمے میں جانا پڑتا تھا جہاں وہ دُنیا کی سب سے طاقت ور مملکت کے خلیفۃ الوقت کو زمین پر بیٹھے، چھڑی یا پتھر کا سہارا لیے، پسینے سے شرابور اور پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس دیکھتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ کی خوراک ہی سادہ نہ تھی بلکہ آپ کا لباس بھی سادگی کا نمونہ تھا۔ یہ وہ حکمران تھے جس نے دُنیا کی دو بڑی طاقتوں کے غرور کو خاک میں ملا دیا تھا۔ ملک کی وسعت سے حکومت کے کام میں بھی اضافہ ہونا لازمی تھا۔ اور یہ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی فراست تھی کہ آپ نے مجلسِ شوریٰ کی رائے کو عزت اور احترام سے دیکھنے اور اُس پر سوچ بچار کرنے کی عادت اختیار کرنے سے جمہوریت کو تقویت پہنچائی۔ آپ

نے ہر محکمہ کے انتظام کے لیے ایک ناظم مقرر کیا اگرچہ آخری فیصلہ کی ذمہ داری خلیفہ ہی پر عائد ہوتی تھی۔ کیونکہ مرکزی حکومت کا سربراہ خلیفۃ الوقت ہی تھا۔ مختلف محکمے جو آپ نے قائم کئے ان میں ایک محکمہ بیت المال کا تھا جہاں سارے ٹیکس، خراج، لگان اور دیگر محاصل جمع کئے جاتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے زمانے میں یہ محکمہ اتنا مضبوط نہ تھا کیونکہ اس میں جمع شدہ سرمایہ غریب، محتاج اور دیگر مستحق لوگوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ اس لیے حضرت ابوبکرؓ کی وفات پر خزانہ خالی تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے بیت المال میں جمع شدہ مال کا مصرف اور اس کی ملکیت سمجھانے کے لیے اپنی دختر سے کہا کہ یہ روپیہ ان کی ذاتی ملکیت نہیں جس کا کچھ حصّہ نکال کر اور اس کو دے کر وہ اسے خوش کر سکیں۔ اس کا حق صرف ان کی ذاتی ملکیت میں ہے۔
دوسرے محکمے جو حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے قائم کئے اور جن کے لیے علیحدہ علیحدہ ناظم مقرر کئے وہ یہ تھے:۔ (۱) محکمہ دفاع: جس کا فرض تھا کہ با ادائیگی مشاہرہ وہ فوج میں بھرتی کرے۔
(۲) محکمہ ڈاک: جو پیغام رسانی اور پیغاموں کے وصول کرنے میں اونٹ اور ہرکارے استعمال کرتا تھا (۳) دارالضرب: یعنی سکّہ ڈھالنے کی ٹکسال۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی طرح کوئی محل بنانے کا خیال تک نہ کیا۔ آپ نے اپنے جانشین کے لیے جو ہدایات چھوڑیں وہ یہ تھیں:۔

(۱) مہاجرین کا خاص خیال رکھا جائے۔

(۲) ذمیوں کی طرف پوری توجہ دی جائے، ان کو قابلِ احترام سمجھا جائے۔ ان کے دشمنوں سے ان کو پناہ دی جائے اور اُن کی حفاظت کی جائے۔ اپنی وفات سے پہلے آپ نے اپنے سارے غلام آزاد کر دیئے۔ جو مال خزانے سے آپ نے اپنے لیے مستعار لیا تھا وہ سب واپس کر دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ کے زمانے کے مسلمانوں کی حالت مصر کے ایک قلعے کے جاسوس نے اس طرح بیان کی ہے: "ان لوگوں میں سے مَیں نے جس کو بھی دیکھا وہ موت کو زندگی پر ترجیح دیتا ہے۔ انکساری کو تکبّر سے بہتر سمجھتا ہے۔ ان میں سے کسی شخص کو بھی دنیوی زندگی سے دلچسپی نہیں اور نہ وہ دُنیا کو مقصدِ حیات سمجھتا ہے۔ یہ لوگ زمین پر بیٹھتے ہیں اور زانوؤں پر رکھ کر روٹی کھاتے ہیں۔ ان کا فوجی حاکم اپنے آپ کو ان کے برابر سمجھتا ہے اور ان میں چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہیں۔ نماز کے لیے وہ اکٹھے کھڑے ہوتے ہیں اور نماز عجز و انکساری اور پوری صدق دلی سے پڑھتے ہیں۔" یہ سُن کر جاسوس کے کمانڈر نے کہا: "یہی وہ لوگ ہیں جو اگر چاہیں تو پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر سکتے ہیں۔"

انصاف کے بنیادی اصول جو حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ایک نئے مقرر شدہ قاضی کو سمجھائے وہ انصاف کے عنوان کے تحت بیان کئے جا چکے ہیں۔ ایک دفعہ طواف کرتے ہوئے ایک غریب آدمی کا پاؤں اتفاقیہ ایک سردار کی پوشاک پر پڑ گیا۔ سردار نے غصہ میں آکر غریب آدمی کے ناک پر مکّہ مار دیا۔ اُس کے اِس رویّہ کی حضرت عمرؓ کے پاس شکایت ہوئی۔ آپ نے سردار کو معافی مانگنے کی ہدایت کی اور شاکی کو مطمئن کرنے کا حکم دیا۔ سردار نے کہا کہ ایک سردار اور غریب آدمی کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے ؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ نے فرمایا: "اسلام میں چھوٹے بڑے کی سوائے تقوےٰ کے کوئی تمیز نہیں "۔

حضرت عثمانؓ

حضرت عثمان غنیؓ ایک متموّل آدمی تھے اور آپ ان ۳۰ افراد میں سے تھے جنہوں نے شروع شروع میں اسلام قبول کیا۔ آپ اور آپ کی زوجہ اس قافلہ میں شامل تھے جو مکّہ کے مظالم سے تنگ آکر اور اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر حبشہ ہجرت کر گیا تھا۔ غنی آپ کو اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ آپ اپنی دولت بلا تامل اسلام اور مسلمانوں کی بہبودی پر صرف کرتے تھے۔ ہجرت کے بعد آپ نے مدینہ میں مسلمانوں کے لیے ایک کنواں کھدوایا اور اپنے خرچ پر مسلمانوں کے قبرستان کے لیے جگہ خریدی۔ آپ نے کئی ایک غلام آزاد کئے۔ خلیفہ منتخب ہونے کے وقت آپ سب سے زیادہ مویشیوں کے مالک تھے مگر وفات کے وقت آپ کے پاس صرف دو اونٹنیاں رہ گئی تھیں۔

حضرت علیؓ

حضرت علی کرم اللہ وجہہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے داماد تھے۔ آپ کی شادی رسول اللہؐ کی صاحبزادی سیدہ فاطمۃ الزہرہ سے ہوئی تھی۔ کم عمروں میں آپ نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ اپنے پیش روؤں کی طرح آپ سادہ زندگی بسر کرتے تھے، سادہ خوراک کھاتے تھے اور سادہ لباس پہنتے تھے۔ آپ اس قدر بے بضاعت تھے کہ تن ڈھانپنے کے لیے آپ نے اپنی تلوار بیچنی چاہی تو کسی ہمدرد دوست نے آپ کو ضروری رقم مہیا کر دی۔ آپ کی زوجہ حضرت فاطمۃ الزہرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی دختر اپنا اناج خود پیستی تھیں اور تن ڈھانپنے کے لیے آپ کے پاس صرف ایک چادر تھی۔ شادی کے موقعہ پر آپ کو جہیز میں صرف ایک بستر، ایک چادر، ایک مشکیزہ، اور ایک چکی ملی تھی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا کوئی ذاتی ملازم نہ تھا اور

کئی کئی دن آپ فاقہ سے گزارتے تھے۔ مگر آپ کی جسمانی طاقت، شجاعت اور فصاحت ضرب المثل تھی۔

بنو اُمیّہ

بنو امیہ میں ایک ایسے خلیفہ بھی تھے جن کے رگ وریشہ میں اسلام کوٹ کوٹ کر بھرا گیا تھا۔ یہ تھے حضرت عمر ثانیؒ۔ جن کا احساس غریبوں، محتاجوں اور مصیبت زدہ رعایا کے لئے اتنا تیز تھا کہ آپ کا وقت راتوں کو جاگنے اور آنسو بھری آنکھوں سے نماز پڑھنے میں گزرتا تھا۔ نمازوں میں آپ اپنی اس رعایا کے لیے دعا کرتے تھے جو کسی مصیبت یا تکلیف میں مبتلا ہو اور ان کی بہتری کی کوشش میں ہر وقت مصروف رہتے تھے۔

امام حسین علیہ السلام

دُنیائے اسلام میں کون شخص حسینؑ کے نام سے واقف نہیں۔ جنہوں نے اپنی جان ایک اسلامی اصول پر قائم رہتے ہوئے قربان کردی۔ ابتدائے اسلام میں اور بھی بہت سے نام ہیں جو اسلامی عقیدہ اور کردار کے پیکر تھے۔ مثلاً ابو عبیدہؓ، سعد بن وقاصؓ، خالد بن ولیدؓ، طارق زیادؒ، اور اُن کے پسر اسامہؓ اور جنگِ دمشق کے مشاہیر مثلاً زید، جعفر، عبداللہ اور وہ سپاہی عورت جس کا نام خولہ تھا اور جو مشہور مجاہد ضرار کی بہن تھیں۔ خولہ نے اپنی ہم خیال چند عورتوں کے ساتھ صرف خیموں کے بانسوں کی مدد سے رومہ کے سپاہیوں کی کھوپڑیاں توڑ دیں۔ خولہ کے بھائی ضرار بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔

اُوپر مَیں نے اسلامی مردانگی کے چند نمونے پیش کئے ہیں۔ اگرچہ ان سب کا تعلق ابتدائے اسلام سے ہے۔ اس سے یہ فرض نہیں کر لینا چاہیئے کہ ظہورِ اسلام کے چند صدیوں بعد سے دورِ حاضرہ تک اسلام نے مردانِ مومن پیدا نہیں کئے۔ یہ خیال بالکل غلط ہی نہ ہو گا بلکہ تاریخ عالم کی رو میں اسلام کو بے سُود ضمنی قصّہ بنا دے گا۔ مَیں نے ان برگزیدہ ہستیوں کا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ تاریخ اسلام میں وہ ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان میں سے پانچ تو نئی تحریک کے سربراہ تھے اور اس طاقت کی وجہ سے جو ان کو اس حیثیت میں حاصل تھی اُنہیں ہر طرح کی ترغیب، لالچ، اور خواہشاتِ نفسانی مغلوب کر سکتی تھیں۔ جن سے وہ انسان جو اختیارِ مطلق رکھتے ہیں گھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ مگر اختیارِ کُلی کے مالک ہونے کے باوجود وہ بخوبی اس بات سے آگاہ تھے کہ اُن کے اختیارات احکامِ الٰہی اور سُنتِ رسول کے تابع ہیں۔ ان کے بعد

بھی بے شمار انسان دائرۂ اسلام میں پیدا ہوئے ہیں جن کی زندگیاں شمعِ روشن کی طرح تاریخ میں درخشاں ہیں اور اب بھی ملّتِ اسلامیہ کے مختلف طبقوں میں ایسے لوگ موجود ہیں، خواہ وہ گنتی کے ہی ہوں، جو اپنے ایمان، فرائض مذہبی اور خصلت کی وجہ سے اسلام کے مقرر کردہ اعمال و افعال پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں وہ افراد بھی شامل ہیں جو معاشرے کے اونچے سے اونچے مقام پر فائز ہیں اور ایسے بدنصیب انسان بھی ہیں جن کی اقتصادی بدحالی ان میں راہِ راست سے ہٹنے کا خیال پیدا کرتی ہے۔ مگر ان کی ایمان داری ان کو دنیوی لالچ اور مجبوری کے باوجود راہِ راست سے ایک قدم ادھر اُدھر نہیں ہونے دیتی۔ مگر دوسرے مذاہب میں بھی اسی پیمانے پر متشینات پائی جاتی ہیں۔ اس لیے یہ دعوےٰ کرنا کہ اخلاقیات اور معاشرتی خوبیوں میں آج کل کے مسلمان دوسرے مذاہب کے پیروؤں پر سبقت رکھتے ہیں حقیقت کے خلاف ہوگا۔ اور جب تک مسلمانوں کو یہ سبقت حاصل نہ ہو وہ کس طرح خیرُ اُمّۃٍ کے افراد کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں؟

لالچ، تعصّب، نفرت، تنگ دلی، خواہشاتِ سفلی کی غلامی اور دوسروں کی بدتعریفی انسان کو ایک گوشت خور حیوان کے مشابہ بنا دیتی ہیں۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک دفعہ یہ نہیں فرمایا تھا کہ "غیبت کرنے والا شخص اس شخص کا گوشت کھاتا ہے جس کی وہ غیبت کرتا ہے اور مَیں ایسے شخص کے نماز روزے کو کیا کروں جو دوسروں کا گوشت کھانے میں مزہ لیتا ہے؟" مسلمانوں کے اخلاقی انحطاط کی وجہ ان کی اقتصادی حالت ہے جن کا کہیں دوسری جگہ ذکر کیا گیا ہے مگر مختصراً یہاں یہ کہنا کافی ہے کہ موجودہ اقتصادی حالات نے مذہبی اور اخلاقی اقدار کو نیچے دبا رکھا ہے۔

مُسلمانوں کے لیے سائنسی مصنوعات کا علم حاصل کرنا ان کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے ضروری ہے خواہ یہ علم حاصل کرنے کے لیے اُنہیں چین جانا پڑے۔ یا جاپان یا امریکہ یا کسی اور صنعتی ملک میں۔ کیونکہ اقتصادی حالت سُدھرنے سے اخلاقی حالت بھی سنور سکتی ہے۔ مَیں ان دونوں حالتوں کو لازم و ملزوم سمجھتا ہوں۔

اوپر بیان کیا گیا اصول عوام کی اخلاقی حالت میں تبدیلی پیدا کرنے کی غرض سے بتایا گیا ہے۔ مگر قوموں کی قسمت بدلنے والے اور انسان ہوتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ صرف ایک فرد جو اپنے اندر ایمان کی قوت رکھتا ہو اور قوم بھی اُس پر اعتماد رکھتی ہو اپنی مثالی زندگی سے قوم کو بیدار کر کے تھوڑے ہی عرصہ میں ایک اُونچے مقام پر لے جا سکتا ہے۔ دُنیا کے موجودہ حالات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے

مُسلمانوں میں بطور ایک جماعت کے نہ یگانگت ہے نہ ہم آہنگی اور نہ ہی باہمی تعاون ہے۔ ہر ایک مُلک کے حالات مُختلف ہیں۔ اس لیے ایک عالم گیر سیاسی ملّت کا نظریہ ناقابلِ عمل ہے۔ اس لیے ضرورت اِس بات کی ہے کہ اسلامی ملکوں میں اتحاد ہو۔ اور ہر ایک ملک میں کوئی ایسی ہستی پیدا ہو جس کی دیانت داری، نیک عملی، بلند کرداری، قابلیّت اور حُبّ الوطنی ہر شُبہ سے بالا ہو۔ قوم کی بہبود اس کا مطمحِ نظر ہو۔ اور وہ دُنیا کے حالات کا علم رکھتے ہوئے ساری قوم کے لئے ایک مشترکہ نصب العین مقرر کر سکے۔ جس کو قوم کا ہر فرد اپنا سکے۔ اور اس کو حاصل کرنے کے لیے ہمہ تن مصروفِ عمل ہو جائے اور یہ قابلِ نفرین فعل ہے کہ اسلام کو کسی گروہ کے لیے سیاسی قوت حاصل کرنے کے لیے منافقانہ طور پر استعمال کیا جائے۔ سیاسی ابن الوقت خواہ وہ اسلام کا کتنا ہی پرچار کریں اسلام کے سچّے وفادار نہیں ہو سکتے۔

درمِ تزویر مکن چوں دگراں قرآن را

باب ۱۰

اسلام اور دیگر مذاہب

پیشتر اس کے کہ ہم اس باب میں داخل ہوں۔ چند تمہیدی امور کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ انسان کسی نہ کسی معاشرہ کا ایک فرد ہوتا ہے۔ اور معاشرے کی اقتصادی صورت یہ ہے کہ وہ تقسیم کار پر مبنی ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ ہر ایک فرد کا دوسرے افراد کے ساتھ کوئی نہ کوئی رشتہ یا تعلق ہے۔ کوئی فرد اپنی زندگی اپنے آپ اور دیگر افراد سے تعلق رکھے بغیر نہیں گزار سکتا۔ ہر شخص کے لیے خوراک ضروری ہے۔ اور وہ تن تنہا خوراک پیدا نہیں کر سکتا۔ اسے کپڑے کی ضرورت ہے۔ مگر وہ کپڑا خود نہیں بنا سکتا۔ اس کو رہائش کے لیے مکان ضروری ہے۔ مگر وہ خود دوسروں سے بے نیاز ہو کر اپنے لیے گھر نہیں بنا سکتا۔ اُسے کنبہ میں رہنا اور کنبہ کے دیگر افراد کے ساتھ تعلق رکھنا پڑتا ہے۔ معاشرے کے لیے حکومت ضروری ہے اس لیے حکومت کے لیے اس کو کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اور حکومت اس کے لیے بہت کچھ کرتی ہے۔ اس لیے ان تعلقات کو نبھانے کے لیے ہر شخص کو کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اور ان افعال کو مجموعی طور پر عمل کہا جاتا ہے۔ عمل میں تعبدیت کا وہ حصّہ بھی شامل ہے جو صرف یقین سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ اُن عمل کے لیے کچھ قواعد چاہئیں۔ یہ قواعد یا تو حکومت بناتی ہے۔ جن کو قانون کہا جاتا ہے۔ کچھ قواعد اس کو مذہب سے لینے پڑتے ہیں اگر وہ کوئی مذہب رکھتا ہے۔ کچھ افعال اس کے اپنے ضمیر یا معاشرے کی رائے سے متاثر ہوتے ہیں۔ کچھ افعال میں وہ بالکل خود مختار ہوتا ہے۔ نہ قانون اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ نہ معاشرہ اور نہ ہی ضمیر یا کوئی اخلاقی اصول۔

مذہب عام طور پر دو قسموں کے ہیں ۱ وہ مذاہب جو الہام یا وحی پر مبنی ہیں ۲ وہ مذاہب جو کسی انسانی دماغ کی اختراع ہیں۔

الہامی مذاہب کے دو حصّے ہوتے ہیں (۱) عقیدہ اور (۲) عمل

اس لئے مذہب کے مطالعہ کرنے سے یہ بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذہب میں ترجیح عقیدے کو ہے یا عمل کو۔ یا ان دونوں میں ترجیح کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

اسلام میں اس مسئلہ پر کافی بحث ہوئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہاں بیان کرنا ضروری نہیں اس مسئلہ

سے متعلق ایک اور مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے یعنی کیا عمل عقیدہ سے متاثر ہوتا ہے یا نہیں۔ عمل ایک ظاہری چیز ہے مگر عقیدہ ایک باطنی بات ہے۔ اگر عمل کو عقیدہ متاثر نہیں کرتا۔ تو عقیدہ ایک ذاتی ذہنی یا دماغی حالت یا مافوق الفطرت مسئلہ بن کر رہ جاتا ہے۔ جس کا دوسرے افراد سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اس لیے الہامی مذہبوں میں عقیدہ کو اسی صورت میں اصل اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ جب کہ وہ انسانی عمل کو متاثر کرے۔

دوسری بات جو مدنظر رکھنی چاہیئے وہ یہ ہے۔ کہ تعدیت چھوڑ کر عمل کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جن کو عام طور پر برائی یا اچھائی کہا جاتا ہے۔ مگر اچھائی یا برائی ابدی نہیں ہوتی۔ اچھائی یا برائی کا تصور ہمیشہ مکان و زماں کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ دنیا کے سب سے بڑے انگریز شاعر شیکسپیئر کا قول ہے۔ کہ اچھائی برائی کی حیثیت کچھ نہیں۔ یہ انسانی تخیل کا نتیجہ ہیں۔ اگر کسی اچھائی یا برائی کو کسی فعل کے حوالہ سے اچھا یا برا کہا جائے یعنی اچھے اور برے افعال کا معیار مذہب کے اوامر و نواہی سے لیا جائے۔ اور یہ مذہب ابدی ہو۔ تو انسان کو مذہب کی رو سے اسی مخصوص فعل کا پابند رہنا پڑتا ہے۔ یہ بحث میں نے اس لیے ضروری سمجھی ہے۔ تاکہ یہ سمجھایا جا سکے۔ کہ اسلام میں قرآن اور حدیث نے اچھے برے اعمال کی وضاحتاً تعریف کی ہے۔ اور ان کو عام الفاظ یعنی نیکی بدی پر نہیں چھوڑا گیا۔ اگرچہ یہ کہنا غلط ہوگا۔ کہ یہ الفاظ اپنے عمومی معنوں میں استعمال ہی نہیں کیے گئے

جو غیر الہامی مذاہب ہیں۔ ان سب میں تقریباً اچھائی کو سراہا گیا ہے اور برائی کی مذمت کی گئی ہے۔ اگر یہ مذاہب انسان کو اچھائی برائی کے اسی طرح پابند کر سکتے ہیں۔ جیسے کہ الہامی مذاہب۔ تو پھر اعمال کے لیے کسی خاص عقیدہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور اس وجہ سے جہاں تک عمل کا تعلق ہے' الہامی مذہب کی اہمیت پہ بھی اثر پڑتا ہے

اس تمہیدی بحث کے بعد ہم مختلف مذاہب کا اسلام کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں

معتمر العالم ال اسلامی کے اعداد و شمار کے مطابق جو مسلم گزیٹر ۱۹۶۴ء میں شائع کیے گئے ہیں دنیا کی مسلم آبادی ۱۹۶۴ء میں ۸۸ ، ۱۱ ، ۷۰ ، ۶۴ ، ۷ تھی۔ دس سال گزرنے کے بعد مسلمانوں کی آبادی اب ۷۰، کروڑ کے قریب ہوگی۔ یہ آبادی ۳۷ خود مختار مسلم ممالک' ۲ نیم خود مختار ممالک اور ان علاقوں کی ہے جو غیر مسلم حکومتوں کے ماتحت ہیں۔ ۱۹۶۴ء کے بعد خود مختار مسلم ممالک کی تعداد میں بھی کچھ اضافہ ہوا ہے جغرافیائی لحاظ سے کوئی ایسا برِ اعظم نہیں جہاں مسلمان نہ پائے جاتے ہوں کیونکہ مسلمان ایک عالمی برادری سے ہیں۔ خاص کر ایشیا' افریقہ اور یورپ کا کوئی اہم حصہ نہیں جہاں مسلم جماعت نہ پائی جاتی ہو۔

انسائیکلو پیڈیا برٹینکا کے (ENC YCLO PEDIA BRIT TAN ICA) مطابق اسلام نے دنیا کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ دنیا اس کی سٹیج ہے۔ اور ساتویں صدی عیسوی

کے بعد تاریخ اس کا وقت ہے۔ اور اس کی اہم ہستیاں دنیا کے تمام باشندوں میں پیدا ہوئی ہیں۔ عربوں میں، ترکوں میں، یورپ میں، منگول قوم میں، حبشیوں میں، ہندوستان میں، ملائشیا میں، اور انڈونیشیا میں، جب عیسائیت تاریکی کے دور میں سے گزر رہی تھی تو بغداد، دمشق، قاہرہ، سیول، تولیدو، اور قرطبہ میں ایک زبردست تعقل کی رو چل رہی تھی۔ نویں سے گیارھویں صدی عیسوی تک دنیا میں سب سے بڑی تہذیب اسلام کی تھی۔ ہسپانیہ کے عربوں نے دنیا کو فلسفی، ہیئت دان، ریاضی دان، صوفی، شعراء اور تاریخ دان مہیا کئے۔ ترقی کے اس دور میں بلا لحاظ قومیت و مذہب عربی زبان عام طور پر بولی جاتی تھی۔ خود مختار مسلم حکومتوں میں سے صرف ۱۳ ممالک یعنی الجیریا، انڈونیشیا، ایران، لیبیا، مراکش، نائجیریا، سعودی عرب، سوڈان، شام، ترکی، مصر، بنگلہ دیش اور پاکستان کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے۔ مگر ترکی اور ایران کے سوا یہ سب ممالک پسماندہ ملک شمار ہوتے ہیں۔ اگرچہ حال ہی میں مصر، پاکستان اور تیل پیدا کرنے والے مسلم ممالک نے ایک خاص اہمیت حاصل کر لی ہے۔ ان ممالک میں سے کوئی بھی صنعتی لحاظ سے مغربی ممالک کا ہم پلہ نہیں ہے۔ اگرچہ ان ممالک سے کئی اشیاء برآمد ہوتی ہیں۔ ان میں سے کوئی ملک بھی بغیر بیرونی امداد اور سہارے کے، سوائے ان ممالک کے جو تیل پیدا کرنے کی وجہ سے دولتمند کہلاتے ہیں، اقتصادی لحاظ سے اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ تیل پیدا کرنے والے ممالک اپنے ذرائع دوسرے ملکوں کو فروخت کرتے ہیں اور باوجود کثیر زرمبادلہ حاصل کرنے کے انہوں نے پوری طرح اپنی اقتصادیات کو صنعتی غلبہ نہیں دیا ہے۔ ان میں سے بہت ہی کم ملک ایک دوسرے سے ملحق ہیں۔ بلکہ بعض ممالک تو ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فاصلے سے جدا ہیں۔ وہ اپنی آب و ہوا، پیداوار اور سطح زمین کی شکل میں مختلف ہیں۔ سوائے عرب ممالک کے ان کی کوئی مشترکہ زبان نہیں۔ اور نہ ہی وہ ایک نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا ماضی بھی ایک دوسرے سے مختلف مراحل میں سے گزرا ہے۔ اور ان کے رسم و رواج بھی علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اس طرح اگرچہ اسلام دنیا کے بڑے مذہبوں میں شمار ہوتا ہے۔ مسلم ممالک امن یا جنگ کی صورت میں ایک معمولی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو اگر کوئی بین الاقوامی اہمیت حاصل ہے تو اپنے جائے وقوع کی وجہ سے۔ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ عظیم قوم، جس نے ایک وقت دنیا میں غلبہ حاصل کر کے ایک ایسی تہذیب کو جنم دیا جس کے آثار صاف طور پر دور حاضر میں بھی پائے جاتے ہیں، جس نے ایسا ضابطہ اصول دیا جو آج کل بھی قابل عمل ہے، اور دنیا کو ان اصولوں کا سراغ مہیا کیا۔ جن کو اپنا کر مغرب طاقت اور تہذیب کے موجودہ زینہ پر پہنچا۔ کس طرح اپنی عظمت کو واپس لا سکتی ہے ؟ یا دنیا کی موجودہ ترقی یافتہ طاقتوں کے شانہ بشانہ کھڑی ہو سکتی ہے ؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم عقیدہ اور عمل کے تعلق کو مد نظر رکھتے ہوئے اسلام کا دوسرے مذاہب کے ساتھ مقابلہ کریں۔ ان خدمات کی نشاندہی کریں جو اسلام نے ارتقاء انسانی میں انجام دیں اور پھر مسلمانوں کی زوال کے اسباب ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔

اسلام سے پہلے دنیا میں کئی ایک مذاہب گزر چکے ہیں۔ جنہوں نے دنیا کو اپنے عقیدہ، عمل اور فلسفہ سے متاثر کیا۔ مگر ان کا پورا تذکرہ اس کتاب کے دائرے سے باہر ہے۔ ان کے صرف موٹے موٹے اصول بیان کیے جائیں گے۔

ہندو مذہب

ہندوؤں کا کوئی مشترکہ مذہب نہیں۔ وہ کئی فرقوں میں تقسیم ہیں اور اصنام پرستوں کا مجموعہ ہیں۔ ان میں سے بہت سے فرقے وشنو اور شو کے کئی ناموں کے پرستار ہیں۔ ہندو مت کے خاص اعتقادات ذاتوں کا نظام، اداگون یعنی روح کا مختلف جسموں میں داخل ہونا، کرما کا اصول، گائے کی تکریم اور رہبانیت ہیں۔ اس واسطے یہ ناممکن ہے۔ کہ اس صورت کو ایک مذہبی نظام کا نام دیا جائے۔ ایک شخص خواہ ملحد ہو یا دھریہ ہو، دو یا دو سے زیادہ خداؤں پر یقین رکھنے والا ہو، یا کائنات ہی کو خدا سمجھنے والا ہو، یا مختلف بتوں کی پرستش کرنے والا ہو، ہندو کہلانے کا مستحق ہے۔ کیونکہ ہندو عام معنوں میں اس شخص کو کہتے ہیں۔ جو ملک ہند میں رہنے والا ہو۔ ہندو مذہب کیونکہ ایک سسٹم پر مبنی نہیں اس لیے یہ تبلیغی مذہب نہیں اور ہندوستان سے باہر کبھی نہیں پہنچا۔ ایک وقت ہندوؤں کا ملک سے باہر جانا بھی منع تھا۔ مگر اب اس ممانعت کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ منو کا ذات پات کا نظام جس میں رتبہ کے لحاظ سے برہمن سب سے اوپر ہیں۔ اور شودروں کی حیثیت حیوانوں سے بدتر ہے۔ ہندو مذہب کا ایک پہلو ہے۔ ہندو مذہب میں نہ خدا کا اور نہ تخلیق کا کوئی صاف تصور ہے۔ تناسخ اور کرما کے اصولوں کو اکٹھا کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ حیات و ممات تبدیلیٔ اجسام کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ انسان کی سابقہ زندگی اس کے بعد کی زندگی میں اس کو کتے، سور یا شودر کی شکل دے سکتی ہے۔ اور کیونکہ بعد کی زندگی سابقہ زندگی کے اعمال کا نتیجہ ہے اس لیے زندگی ایک قسم کی سزا یا جزا ہے۔ جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور موجودہ زندگی میں انسان ترقی کی خواہش کھو بیٹھتا ہے۔ مگر یہ بات کہنا بھی ضروری ہے۔ کہ حال میں کئی ایک مُصلحین نے ہندو مذہب کو اوہام اور دیومالا کے چکر سے باہر نکالنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ اس کو ایک فلسفیانہ اور تصوّف کی شکل دی جا سکے۔ برہمو سماج اور دیو سماج ایسی ہی اصلاحی تحریکیں ہیں۔ بعد کے بھگوت گیتا کے اپنیشد ایک ارفع ہستی کا موہوم سا تصور بھی پیش کرتے ہیں۔ مگر اس نظام کے دیوتا (بت) عام طور پر اپنی جگہ سے نہیں ہلے اور وہیں ہیں جہاں وہ پہلے تھے۔ ویدوں کے مطابق ان دیوتاؤں کی تعداد ۳۳ سے ۳۳۴۰ تک پہنچتی ہے۔ مگر جن ہستیوں کو وہ اب خالق کا درجہ دیتے ہیں۔ ان کے نام الیشر، پرماتما، کرشنا اور بھگوان ہیں۔ جو کہ ایک خدا کے تصور سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ کہ اسلام اور مختلف ہندو متوں میں کوئی مشترکہ عقیدہ نہیں۔ اور نہ ہی رسم و رواج میں کوئی مماثلت۔

بُدھ مت

ہندوستان کے سب سے مشہور مذہبی تصور کا نام بُدھ مت ہے جس کا بانی شاہی خاندان کا ایک نوجوان ساکیا منی گوتم تھا۔ اور جس کو اس کی دانائی کی وجہ سے بدھ نام دیا گیا۔ بدھ سے پہلے کئی ایک تہذیبیں اور مذاہب گزر چکے تھے مثلاً آریہ مت، چینی مذاہب، مصری مذہب، سمیر والوں اور آشوریوں کا مذہب۔ بدھ چینی کنفوشیس، کلدانیوں اور عبرانیوں کا ہمعصر تھا۔

بدھ مت خدا اور کائنات کے تخیل سے اپنے آپ کو دور رکھتا ہے۔ اس کی ساری توجہ مکتی یعنی نجات پانے پر مرکوز ہے۔ جس کا مقصد شخصیت کو زندگی کی واحدانیت سے ملا دینا ہے۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنے جذبات اور خواہشات کو دبا دینا بلکہ فنا کر دینا ہے اور یہ راستہ ہے نروان کی منزل حاصل کرنے کا جس میں زندگی کی تمام خواہشات، تمام احساسات اور دولت کی حرص ختم ہو جاتے ہیں۔

اگرچہ گوتم شاہی خاندان کا چراغ تھا۔ اور نوجوان تھا۔ اس کی زندگی اور خیالات سے صاف ظاہر ہے کہ وہ انسانی زندگی کے مصائب سے پوری طرح آگاہ تھا۔ اور یہی آگاہی اس کے تخیل اور مذہب کی بنیاد ہے اگر دنیا میں تکالیف، دُکھ درد، بیماری اور غریبوں کی بے بسی سے، جو ان کو جسمانی تکالیف پہنچتی ہیں موجود ہیں۔ اور دوسری طرف امراء عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تو گوتم کے لیے اس خیال کا پیدا ہونا کچھ مشکل نہ تھا۔ کہ عیش و عشرت اور دکھ درد کسی گزشتہ زندگی کا نتیجہ ہیں۔ اس گزشتہ زندگی میں اگر کسی شخص نے نیک کام کیے ہیں۔ تو آئندہ زندگی میں اس کی روح ایسے جسم میں داخل ہو گی۔ جس کو دُکھ درد نہ ہو۔ اور اگر کسی شخص نے گزشتہ زندگی میں بُرے کام کیے ہیں۔ تو اس کی روح بھی آئندہ زندگی میں ایسے جسم میں داخل ہو گی۔ جس کو کوئی آرام اور آسائش حاصل نہ ہو۔ اس فلسفہ میں کئی ایک مفروضے ہیں جن کے بغیر کوئی بات نہیں بنتی اور ایک قدم آگے اٹھایا نہیں جا سکتا۔ اوّل مفروضہ تو یہ ہے۔ کہ روح کچھ عرصہ تک لافانی ہے اور شکلیں بدلتی رہتی ہے۔ اور موت کے بعد کوئی اور جسم اختیار کر لیتی ہے۔ دوسرا مفروضہ کرما کا ہے جس کے مطابق موجودہ زندگی گزشتہ زندگی کے کرموں کا پھل ہے۔ اور تیسرا مفروضہ یہ ہے کہ روح اگرچہ لافانی ہے۔ بذریعہ اعمال انساں روح کو موت کے بعد ایسے عالم میں لے جا سکتا ہے۔ جہاں نہ کوئی دُکھ ہے نہ درد نہ کوئی خواہش یا احساس۔ یہاں تک کہ خودی کا احساس بھی ختم ہو جاتا ہے۔ یہ عالم نروان ہے جس سے پھر کوئی روح واپس نہیں آ سکتی۔

بُدھ نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ مگر بعد میں اس کی تعلیمات کو جو تری پلا کا میں سنسکرت زباں میں جمع کی گئیں اولیت کا تقدس حاصل ہے۔ تری پلا کا کا ترجمہ چینی اور جاپانی زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔

بُدھ مت کی مقدس کتابیں تین حصوں میں منقسم ہیں (۱) جو عوام کے لیے ہیں (۲) جو بدھ راہبوں کے

لیے ہیں۔ اور (۳) جو عالم غیب سے متعلق ہیں۔

بدھ مت کے نزدیک چار اعلیٰ حقیقتیں ہیں (۱) دنیا میں تکالیف اور مصیبتیں ہیں۔ (۲) یہ تکالیف اور مصیبتیں خواہشات سے پیدا ہوتی ہیں (۳) ان مصائب اور تکالیف کو ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے (۴) یہ طریقہ آٹھ راہوں پر چلنے کا ہے۔ یعنی صحیح عقیدہ، اعلیٰ مقصد، پاکیزہ طرز تکلم، اعلیٰ عمل و کردار، پاکیزگی، بلند تخیل، صحیح تجرد، وجد استغراق اور صحیح انبساط۔

دراصل بدھ مت ہندوؤں کے ذات پات کے نظریے۔ اور رسوم و رواج کا ردِ عمل تھا۔ جو جلد ہی اتنا مقبول ہوا۔ کہ وہ ہندوستان، چین، جاپان، وسط ایشیا اور لنکا میں پھیل گیا۔ اور ایک وقت اس کے پیروؤں کی تعداد ۲ کروڑ چالیس لاکھ تھی۔ مگر ہندوستان میں برہمنوں کی مخالفت نے اسے ختم کر ڈالا۔ اور چین نے اشتراکیت اختیار کر کے اس کو وہاں بھی مٹا ڈالا۔ جاپان میں شنٹو مذہب اس پر غالب آگیا۔ یہ دیکھنے کی بات ہے۔ کہ بدھ کے جو آٹھ اصول ہیں وہ اسلامی عمل سے ملتے جلتے ہیں۔ مگر خدا سے بے پروائی بلکہ خدا اور وحی کا انکار، اس کے رسم و رواج، رہبانیت، اور بدھ کے مجسمہ کی پرستش جو بدھ خانقاہوں میں رواج پا چکی ہے۔ اس کو اسلام سے ایسے علیحدہ کرتی ہیں۔ جیسے زمین آسمان سے جدا ہے۔ صحیح انبساط اسلامی تصوف کی یاد دلاتا ہے۔ مگر اسلام کا تصوف خدا کے تصور اور اس کی محبت سے وابستہ ہے۔

شنٹو مذہب

جاپان کا اصل اور قدیم مذہب شنٹو ہے۔ جس کی بنیاد قومیت کا نظریہ ہے۔ اور جس کی بڑی خصوصیات ہیں جاپان کے بادشاہ میکاڈو اور قومی ذہن کی پرستش اور آباؤ اجداد کا پوجنا ہے۔ اس مذہب پر کنفوشیس کے خیالات کا گہرا اثر پڑا۔ اور جاپانیوں کے لیے شنٹو اور کنفوشیس کے خیالات عام طور پر ایک قسم کی ملاوٹ بن گئے ہیں۔ شنٹو کے بارہ فرقے ہیں۔

طاؤ کا مذہب

طاؤ مذہب چینی فلسفہ اور بدھ مت کے ساتھ مل کر اپنی خصوصیت گنوا بیٹھا ہے۔ اس چینی فلسفہ کی ابتداء لاؤ ذی (LAOZE) سے ہوئی۔ جو ۶۰۴ قبل مسیح پیدا ہوا۔

ابتداء میں اس فلسفہ کی خصوصیت صوفیانہ وحدانیت تھی۔ جس کا انحصار وجدان پر اور کنفوشیس کے دلائل کی تردید پر تھا۔ مگر بدھ مت رائج ہونے کے بعد اس مذہب کا اس پر بھی اثر پڑا اور قریباً یہ بدھ مت کے مترادف ہو گیا۔ اس کے پجاریوں اور راہبوں نے بعد میں کئی قسم کے جادو کے عمل اور خفیہ رسوم اختیار کر لیں مذہبی مزاج چینی اب بلا تمیز طاؤ، کنفوشیس اور بدھ مت کے مندروں میں جا کر تینوں کی پرستش کرتے ہیں

بلکہ چینی اشتراکیت نے ان سب مذاہب کو قریباً قریباً ختم کر دیا ہے۔

کنفوشیس

کنفوشیس چین کا ایک بڑا عارف گزرا ہے۔ اس کے خیالات نے ۵۵۰ سے ۴۷۹ قبل مسیح تک بڑا فروغ پایا۔ اس کے مذہب کی بنیاد اخلاق کی پرستش اور نیک عمل پر تھی۔ اس کے خیال میں دنیا بزرگوں کے اخلاق سے بنی ہے۔ اور اپنے پیروؤں کو بھی وہ یہی ہدایت کرتا تھا۔ کہ بزرگوں کے اخلاق اور اعمال کی پیروی کریں۔ اس نے اپنے اردگرد بہت سے مشیر اور چیلے اکٹھے کر لیے اور اس کی موت کے بعد خود اس کی پرستش شروع ہو گئی۔ اس کے شریف شہری کا نمونہ وہ شخص تھا۔ جو طبقہ امراء سے تعلق رکھتا ہو وہ ایک تعمیری سیاست دان بھی تھا۔ اور اس کے فلسفہ میں ریاست کی طرف براہِ راست اشارہ بھی ہے۔ اس کا خیال تھا۔ کہ ہر شہری کو کئی ایک باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ مثلاً خوراک اور پوشاک کا جو ہر طبقے کے لیے مختلف ہوں اور قبروں کا جو ایک خاص شکل کی اور ایک جگہ میں بنائی جائیں۔ اس کے فلسفہ میں کوئی اہم بات نظر نہیں آتی۔ جو اس مفروضہ پر مبنی تھا۔ کہ معاشرے میں کئی قسم کے طبقات ہوں گے جن میں سب سے اچھا طبقہ امراء کا ہوگا۔ اس لیے آج کل چین میں اس کو ایک عارف سمجھنے کی بجائے دھوکہ باز انسانوں کا جدِ امجد سمجھا جاتا ہے۔ یعنی ایک رجعت پسند انسان جس کی غرض یہ تھی۔ کہ غلاموں کے حاکموں کی حکومت قائم رہے۔ اس کی تعلیم سے یہ مطلب بھی اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کہ طلبِ منفعت ایک قابلِ تحسین چیز ہے اور بغاوت جرم۔

قدیم مصر

قدیم مصری دیوتاؤں پر ایمان رکھتے تھے۔ مگر ان کے دیوتا خود ان کے بادشاہ ہوتے تھے۔ وہ موت کے بعد زندگی پر یقین رکھتے تھے۔ اور سمجھتے تھے۔ کہ موت کے بعد انہوں نے دیوتاؤں کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ درحقیقت موت کے بعد زندگی کا خیال ان کے دلوں پر ہر وقت مسلط رہتا تھا۔ جیسا کہ ان کے بڑے بڑے اہرام سے ثابت ہوتا ہے جو مرنے کے بعد ان کو دفن کرنے کے لیے بنائے جاتے تھے اور جن میں ان کے مردہ جسموں کے ساتھ زندگی کی ضروریات بھی رکھ دی جاتی تھیں۔ ایک ارفع ہستی اور خالق کا خیال ان کے لیے نابود تھا۔ سوائے فرعون اخناطوں کے جو اس معنی میں مواحد تھا کہ وہ ایک بڑے دیوتا کو خدا کا مرتبہ دیتا تھا۔ اس نے اپنی بہن سے شادی کی تھی۔ اور یہ عورت نہایت ہی حسین تھی۔ جیسا کہ اس کی تصویروں سے ثابت ہوتا ہے۔

قدیم رومہ

قدیم رومہ کا کسی پہلے باب میں ذکر آچکا ہے۔ قدیم رومی روحانی لوگ نہیں تھے۔ ان کو اپنی سلطنت کے وسیع کرنے کی خواہش نے متواتر مصروف جنگ رکھا۔ اس لیے وہ عملی لوگ تھے۔ ان کا ایک مذہبی نظام ضرور تھا۔ مگر وہ سراسر توہم پر مبنی تھا۔ جس کو نجومی اور پیش گو چلاتے تھے۔ فتوحات نے ان کو خوشحال اور عیش پرست بنا دیا تھا۔ مساوات کا تخیل ان کے ذہن کے لیے ایک اجنبی شے تھی امیر اور غریب طبقہ میں اتنا فرق تھا۔ کہ اس فرق کو یسوع ناصری نے اپنے وعظ کی بنیاد بنایا۔ وہ کسی ارفع ہستی کا صاف تصور نہیں رکھتے تھے۔ اور ان کے دیومالا کی ایک لمبی فہرست تھی۔ اور سائنس دانوں، فلسفیوں اور علم کی دوسری شاخوں کے ماہروں کا ان میں ہمیشہ فقدان رہا۔ وہ صرف سڑکیں اور عمارتیں بنانے میں ماہر تھے۔ اس لئے یورپ نے ان سے سوائے سڑکوں، عمارتوں، عملی سیاسیات، لاطینی زبان اور ان کے خاص قانون کے کچھ حاصل نہیں کیا اسلامی علوم و تخیل میں ان کا ذرہ بھر بھی حصہ نہیں۔

قدیم یونان

قدیم یونان میں مندروں اور پجاریوں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ دیوتاؤں پر یقین رکھتے تھے اور ان کے مجسمے بناتے تھے۔ مگر یہ دیوتا یا تو زمانہ گزشتہ کی معروف ہستیاں ہوئی تھیں۔ یا ان کو قدرتی طاقتوں کا مظہر خیال کیا جاتا تھا۔ جو انسانی زندگی پر اثر ڈال سکتی تھیں۔ وہ فال نکالنے والوں پر اعتقاد رکھتے تھے جو ان سے مشورہ کرنے والوں کو بتا سکتے تھے۔ کہ کسی مہم یا کسی دیگر معاملہ میں دیوتاؤں کی کیا منشا ہے۔ انسانی برابری کا نظریہ ان کے لیے ایک اجنبی بات تھی۔ غلام اور اجنبی ان کے ہاں کوئی قانونی حیثیت نہیں رکھتے تھے بلکہ ارسطو جیسے فلسفی کا یہ خیال تھا کہ غلامی فلسفہ دانوں کی ضروریات مہیا کرنے کے لیے ایک مفید رسم ہے۔ کسی ارفع ہستی کا خیال ان کے چند فلسفیوں تک محدود تھا۔ سیاسیات بیشک ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اور اس مضمون پر انہوں نے کچھ قابلِ قدر کام کیا۔ آئندہ کی زندگی یا اس زندگی میں نیک و بد افعال کی جزا و سزا کا ان کو خیال تک نہ تھا۔

زرتشت

زرتشت ایرانیوں کا سب سے قدیم مذہبی رہنما اور فلسفی تھا۔ اس مفکر کے خیال کے مطابق ایک دو رُخہ ارفع ہستی ضرور ہے جس کا ایک رُخ تعمیری اور دوسرا تخریبی ہے۔ وہ ایک معنی میں مواحد تھا۔ اور موت کے بعد زندگی پر یقین رکھتا تھا۔ اس ارفعی ہستی کے ایک رُخ کا نام اہورہ مزدہ ہے۔ اور وہ ہمیشہ بدی کی مخالفت

میں مصروف رہتا ہے بدی کی طرف راغب کرنے والے روح کا نام اہرمن ہے ۔ اور اس کے بہت سے کارندے ہیں جن کا نام دیوا ہے ۔ اس کے نزدیک مادہ خود بخود وجود میں نہیں آیا۔ اس کو اہورہ مذدہ نے پیدا کیا ہے جو کامل، ابدی، ناقابل تبدیل، آسمانوں کو پیدا کرنے والا اور کائنات کو شکل دینے والا ہے اہورہ کے تعمیری کام میں روشنی، زندگی اور نیکی شامل ہیں ۔ رہرمن کا کام تاریکی، موت، اور بدی ہے ۔ ان دونوں پہلوؤں کا ساری کائنات میں ظہور ہے ۔

مادہ ان دونوں ہستیوں یا صفتوں کو قبول کرتا ہے اہورہ کی مدد کے لیے چند اور خیالی چیزیں بھی ہیں ۔ مثلاً عالمی عقل، عالمی روح اور عالمی منشا جس کو ازل سے مادہ قبول کر کے کائنات کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے ۔ غیر محدود خلا اور نہ ختم ہونے والا وقت ان پر اضافہ ہیں ۔ انسانی روح یا تو مخلوق ہے ۔ یا خود بخود ظہور میں آ جاتی ہے ۔ موت نئی زندگی ہے یعنی اپنی روح کی اصلیت سے آگاہی اس کے اخلاق کا فلسفہ اس تصور پر مبنی ہے ۔ کہ انسان کے لیے دو راستے ہیں ۔ مادہ یا روح، نیکی یا بدی، خُلق یا بدخُلقی، تاریکی یا روشنی ۔ ان سب متضاد چیزوں میں سے اس نے ایک کو اختیار کرنا ہے ۔ اگر وہ نیکی اختیار کرتا ہے ۔ تو اس کو نیک کام کرنے چاہئیں ۔ بلکہ اپنی سوچ اور خیال میں بھی اسے نیک ہونا چاہیئے ۔ جہاں تک ممکن ہو اسے اپنے آپ کو غیر آلود اور صاف رکھنا چاہیئے ۔ اس کو چاروں عناصر یعنی آگ، ہوا، پانی، مٹی، فطرت کے قوانین اور اپنے بادشاہ اور ملک کا مطیع، بشاش، قانع، ہمدرد، خوددار، اپنے آپ پر ضبط رکھنے والا، دور اندیش، باحیا، صلح پسند اور ضمیر کی پیروی کرنے والا ہونا چاہیئے ۔ اس کے علاوہ اسے دوسروں سے دوستانہ تعلقات رکھنے، بزرگوں کی عزت کرنے اور ان کا حکم ماننے اور اپنے سے نیچے درجہ رکھنے والے لوگوں کے ساتھ مہربانی اور خوش خلقی سے پیش آنے والا ہونا چاہیئے ۔ زرتشت کے اصولوں نے ساری سلطنت روم کو اور شمالی افریقہ کو متاثر کیا ۔ اس کے پیروؤں کو اسلام میں مجوسی کہا گیا ہے ۔ ازرتشت کی تعلیمات میں اللہ اور شیطان کے تصور کی ہلکی سی جھلک ہے ۔ نیک کاموں پہ وہ اسی طرح زور دیتا ہے ۔ جیسے اسلام ۔ عمل کے متعلق اس کا فلسفہ ایک فقرے میں بیان کیا جا سکتا ہے یعنی کوئی برا کام نہ کرو ۔ کوئی بری بات نہ سنو ۔ اور کسی بری بات کا کبھی خیال نہ کرو ۔

یہودیت

یہودیت اس وحی پر مبنی مذہب ہے ۔ جو حضرت موسیٰ پر سینا میں نازل ہوئی ۔ یہودیوں کی الہامی کتاب توریت ہے ۔ جو تقریباً سو سال قبل مسیح موجود ہونی بیان کی جاتی ہے ۔ مگر یقین سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جو وحی حضرت موسیٰ پہ نازل ہوئی وہ اپنی اصلی صورت میں توریت میں موجود ہے ۔ یا اس میں کچھ رد و بدل بھی ہوا ہے ۔ کیونکہ یہ زمانہ قبل از تاریخ کی بات ہے ۔ اہل یہود کی ایک اور کتاب تلمود ہے ۔ جو یہودی

قوانین کی شرح ہے۔ یہ ایک مستند کتاب سمجھی جاتی ہے جو توریت سے دوسرے درجے پر ہے۔

حضرت موسیٰ مصر میں پیدا ہوئے۔ مگر کیونکہ اس وقت فرعون مصر کا حکم تھا۔ کہ عبرانیوں کے جو اولاد نرینہ پیدا ہو۔ اس کو مار دیا جائے۔ حضرت موسیٰ کی ماں نے شیر خوار بچہ کو دریائے نیل کے کنارے کی جھاڑیوں میں ایک صندوق میں چھپا کر رکھ دیا۔ مگر دریا کی رو سے یہ صندوق بہتے بہتے فرعون کے محل کے نیچے جا پہنچا۔ اور فرعون کی بیٹی نے بچہ کو صندوق میں سے اٹھا کر ایک طرح سے اپنا متبنٰہ "بیٹا" بنا لیا۔ اور اس کی پرورش فرعون کے محل میں ہی ہوئی۔ اہل مصر عبرانیوں پر بہت ظلم کرتے تھے۔ چنانچہ جب ایک مصری نے ایک عبرانی کو قتل کر دیا۔ تو حضرت موسیٰ نے قاتل کو بدلے میں مار ڈالا۔ اور آپ مصر سے بھاگ کر جزیرہ نما سینا میں آ گئے۔ جہاں انہوں نے ایک خاتون کے ساتھ شادی کر لی۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے ایک پہاڑی میں تجلیٔ باری تعالیٰ دیکھی اور آپ کو الہام ہوا۔ کہ اسرائیل کی اولاد کو بچانے والے آپ ہی ہیں۔ اس لیے آپ مصر واپس ہوئے۔ اور اپنے بھائی ہارون کے ساتھ فرعون سے ملتجی ہوئے کہ عبرانیوں کو جو بنی اسرائیل بھی کہلاتے تھے مصر سے باہر جانے کی اجازت دے دی جائے مگر فرعون نہ مانا۔ اور حضرت موسیٰ نے خدا سے مدد کیلئے دعا مانگی۔ اس دُعا کا یہ اثر ہوا۔ کہ مصر پر وبائی طاعون کا حملہ ہوا۔ جو دس سال جاری رہا۔ دسویں سال مصر والوں کے پہلوٹھی کے بچے طاعون میں مبتلا ہو کر مرنے لگے۔ اس پر فرعون نے اسرائیلیوں کو مصر چھوڑنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ اسرائیلیوں کو اپنے ساتھ لے کر پھر جزیرہ نما سینا میں آ گئے۔ جہاں انہوں نے ۴۹ دن قیام کیا۔ یہیں آپ کو خدا کی طرف سے احکام عشرہ موصول ہوئے۔ اور خدا اور اسرائیلیوں کے درمیان ایک میثاق طے پایا۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ مذہب یہود کے تمیزی نشان یہ ہیں۔

۱۔ توحید جس کی خصوصیت یہ ہے کہ خدا صرف یہودیوں کا خدا ہے۔ جس نے ان کے ساتھ ایک معاہدہ کیا ہوا ہے۔

۲۔ یوم السبت یعنی آرام اور عبادت کا دن۔ ۳۔ خطنہ

۴۔ کھانے کے متعلق ہدایات ۵۔ ضابطۂ صحت پر عمل۔

۶۔ چند تہواروں کا منانا خاص طور پر عید کے دن کا، اس واقعہ کی یاد میں جب اہل مصر پر ایک آفت سماوی نازل ہوئی اور اسرائیلی اس سے محفوظ رہے، ۷۔ یوم کفارہ

۸۔ قربانی جو ۷۰ء میں یروشلم کی فتح سے پہلے رائج تھی۔ یہ رسوم یہودی پروہت انجام دیتے تھے۔ اور اس کا خرچ اس عشر سے پورا کیا جاتا تھا۔ جو پروہت خود وصول کرتے تھے۔

ایک وقت یہودی امت مسلمہ میں شامل شمار کیے جاتے تھے۔ مگر وہ مدینہ میں فریب و دغا کے مرتکب ہوئے جس وجہ سے یا تو ان کو مدینہ سے نکال دیا گیا۔ یا وہ خود بخود مدینہ چھوڑ گئے۔

جس سرزمین کو آج کل فلسطین کہا جاتا ہے۔ اس کو کنعان بھی کہا جاتا تھا۔ اور اس علاقے کے باشندے کنعانی یا فونیشین (PHOENICIAN) کہلاتے تھے۔ اپنی جائے وقوع اور حدود کی وجہ سے اس سرزمین کا خود مختار رہنا ناممکن تھا۔ کیونکہ اس کے دو طرف بڑی سلطنتیں تھیں جو اکثر برسرِ پیکار رہتی تھیں اور کیونکہ ان سلطنتوں کے لشکروں کو فلسطین سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس لیے یہ سرزمین روندی جاتی تھی۔ یا اس کے باشندوں کو کسی ایک متحارب فریق سے اتحاد کرنا پڑتا تھا۔ اور ایسے اتحاد سے ان کی آزادی پر زد پڑتی تھی۔

حضرت ابراہیم کے دو بیٹے تھے۔ جن میں سے ایک کا نام اسمٰعیل اور دوسرے کا نام اسحٰق تھا اس خاندان کے ایک لڑکے کو جس کا نام یعقوب تھا۔ اسرائیل بھی کہتے تھے۔ کنعان میں جب ایک دفعہ قحط پڑا تو اسرائیل کے بارہ بیٹے مصر ہجرت کر گئے۔ ان بیٹوں کی اولاد کو حضرت موسیٰ مصر سے نکال کر واپس لے گئے۔

تین صدیوں کی کشمکش کے بعد بخت نصر نے اسرائیلیوں کو قید کر کے یروشلم سے بابل بھیج دیا۔ مگر جب سیرس شاہ فارس نے بابل فتح کیا۔ تو اسرائیلیوں کو یروشلم، جو کنعان میں واقع شہر تھا، واپس بھیج دیا۔

حضرت موسیٰ جب جزیرہ نما سینا میں تھے۔ تو آپ کو خدا کی طرف سے کوہِ طور کی چوٹی پہ آنے کا حکم ہوا۔ چالیس دن چوٹی پہ ٹھہرنے کے بعد جب آپ نیچے اترے۔ تو آپ نے دیکھا کہ آپ کی غیر حاضری میں اسرائیلیوں نے حضرت موسیٰ کے بھائی ہارون کو ترغیب دے کر ایک سونے کے بچھڑے کا بُت بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی ہے۔ حضرت موسیٰ بتوں کی پرستش کے سخت خلاف تھے۔ اس لیے وہ بچھڑے کی پرستش کرنے والوں پر بہت خفا ہوئے۔ اور آپ نے لیوی (LEVY) کے لڑکوں کو حکم دیا۔ کہ ان بُت پرستوں کو تباہ کر دو۔ توریت میں درج ہے۔ کہ اس حکم کی تعمیل میں بھائی نے بھائی کو مارا۔ باپ نے بیٹے کو اور بیٹے نے باپ کو قتل کیا۔ اور لڑائی کے پہلے دن ہی ۳۰۰۰ آدمی مارے گئے۔ خدا نے حضرت موسیٰ سے وعدہ کیا کہ اسرائیلی اگر احکامِ عشرہ پر عمل کریں گے۔ جو حضرت موسیٰ کو خدا نے بذریعہ الہام بتائے تھے۔ اور خدا کے قیام کے لیے ایک ڈیرہ، ایک لکڑی کا صندوق جس میں توریت کی تختیاں محفوظ کی جا سکیں اور ایک معبد بنا دیں تو اسرائیلیوں کو ان کی سرزمین واپس مل جائے گی۔ جس میں شہد اور دودھ کی نہریں بہیں گی۔ یہ اس میثاق کی شرائط ہیں جو اسرائیلیوں اور خدا کے درمیان قرار پایا۔ اسرائیلیوں کی طرف سے یہ وعدہ تھا۔ کہ سوائے خدا کے وہ کسی اور کی پرستش نہیں کریں گے۔ اور نہ کوئی تراشیدہ بُت رکھیں گے۔

احکامِ عشرہ جو حضرت موسیٰ کو بذریعہ وحی بتائے گئے تھے۔ وہ یہ تھے۔

۱۔ تم کسی کو قتل نہ کرو گے ۲۔ تم زنا کے مرتکب نہ ہو گے۔

۳۔ تم چوری نہ کرو گے ۴۔ تم اپنے پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہی نہ دو گے۔
۵۔ تم اپنے پڑوسی کی بیوی کی طرف بُری نظر نہ ڈالو گے۔
۶۔ تم اپنے پڑوسی کو حسد سے نہیں دیکھو گے۔
۷۔ تم پڑوسی کے کھیت، نوکر، نوکرانی، بیل، گدھے یا اس کی کسی اور چیز پر حسد نہ کرو گے۔

ان احکام کے علاوہ کچھ اور بھی احکامات تھے مثلاً غلاموں اور خادماؤں کو بیچنے یا ان کو اپنی ملکیت میں لانے کی ممانعت، ماں باپ کو پیٹنے کی ممانعت، کسی شخص کو چرانے یا بیچنے یا اپنے تصرف میں لانے کی ممانعت، حاملہ عورت کو پیٹنے کی ممانعت۔ کچھ احکام بیلوں کی دوسروں کے کھیتوں میں مداخلت یا کسی شخص کو زخمی کرنے کے متعلق۔ یہ سب افعال قابلِ تعزیر قرار دیے گئے۔ اور چند جرموں کے لیے سزائے موت مقرر کی گئی۔ قاعدہ کلیہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا "جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، زخم کے بدلے زخم، اور درّے کے بدلے درّہ"۔

یہودیت اور اسلام میں بڑا فرق خدا کے تصوّر کے متعلق ہے۔ یہودیوں کا خدا یہودیوں کے لیے تھا اور وہ ایک معاہدہ کا پابند تھا۔ اس کا بنی نوعِ آدم کے خدا ہونے کا یہودیت میں کہیں ذکر نہیں۔ وہ ایک منصف، روادار، صلح پسند خدا نہ تھا۔ بلکہ ایک حاسد اور تجارتی خدا تھا۔

عیسائیت

عیسائیت کے اعتقادات اور مذہبی رسوم یسوع ناصری، جن کا قرآن میں عیسیٰ ابن مریم کے نام سے ذکر آتا ہے۔ اور جن کو اسلام میں ایک ایسے نبی کی حیثیت حاصل ہے جن پر انجیل کی شکل میں وحی نازل ہوئی تھی۔ کی پیدائش، زندگی، ان کے صلیب پر چڑھائے جانے اور آسمان پر اٹھائے جانے کے گرد گھومتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک عقیدے اور رسم کا معجزہ نما یا فوق الفطرت پہلو ہے۔

یسوع ناصری ٹائی بیریس (TIBERIUS) شہنشاہِ مشرقی رومہ کے عہد میں بی مریم کے بطن سے پیدا ہوئے۔ بی مریم کی شادی یوسف نجّار سے ہوئی تھی۔ اور اگرچہ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جلد ۱۱ صفحہ ۳۹۰ کے مطابق یسوع کی پیدائش کے بعد یوسف نے ان کو اپنا حقیقی پسر تسلیم کیا۔ اسلام اور عیسائیت میں یہ مشترکہ عقیدہ ہے۔ کہ بی مریم کو بغیر کسی جنسی ملاپ کے حمل ٹھہرا اور یسوع کی پیدائش کے بعد بھی وہ کنواری رہیں۔ ان کی پیدائش ایک یہودی خاندان میں ہوئی۔ اور جب آپ سنِ بلوغت کو پہنچے تو آپ نے قصبہ ناصر یا ناصرہ میں، جو بحیرۂ گیلی لی کے ساحل کے ... واقع ہے۔ رہائش اختیار کر لی۔ یہ علاقہ شہنشاہ مشرقی رومہ (بازنطینہ) کے زیرِ حکومت تھا۔ کیونکہ قدرت نے آپ کو حساس ذہن عطا کیا تھا اس لیے آپ کی طبیعت پر ارد گرد کے ماحول کا گہرا اثر پڑا۔ خاص طور پر امیر غریب

کے فرق اور حکمران طبقے کے تعیش سے آپ بہت متاثر ہوئے

تیس برس کی عمر میں انہوں نے اس تفریق اور عیش پرستی پر اظہارِ ناراضگی شروع کیا۔ وہ کسانوں اور اردگرد کے ماہی گیروں کو اکٹھا کر کے ان کو نصیحت کرتے تھے۔ غریبوں کو تسلی دیتے تھے۔ اور امراء کے تعیش پر اظہار ناپسندیدگی کرتے تھے۔ آپ کی تعلیمات بہت سادہ تھیں۔ اس لیے غریب طبقہ ان کو آسانی سے سمجھ کر قبول کرتا تھا۔ اپنے بے داغ کردار اور مواعظِ حسنہ سے آپ نے اپنے گرد معتقدین کا ایک گروہ پیدا کر لیا۔ اور بارہ آدمی تو آپ کے حواری بن گئے جن میں ایک شخص جوڈس (JUDAS) بھی تھا۔ آپ کی ہر دلعزیزی نے بہت سے لوگوں کو آپ کا پیرو بنا لیا۔ مگر یہودی آپ کے دشمن بن گئے۔

آپ کی عمر تنتیس سال کی تھی۔ جب آپ نے اپنے حواریوں کے ساتھ یروشلم کا رُخ کیا۔ اور وہاں ایک ہفتہ تک وعظ ونصیحت کا سلسلہ جاری رکھا۔ یروشلم کے مندر میں داخل ہو کر آپ نے فاختاؤں کو، جو پنجروں میں بند تھیں اور جن کو رحم دل آدمی خرید کر آزاد کر دیتے تھے، پنجروں سے نکال کر اڑا دیا۔ جو مویشی فروخت کرنے کی غرض سے احاطہ میں جمع کیے گیے تھے ان کو بھگا دیا۔ اور جو لوگ سکّوں کے تبادلے کے لیے میزیں لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے سکّوں کو بکھیر دیا اور میزیں الٹ پلٹ کر دیں۔ آپ کے ایک حواری جوڈس نے چند سکّے لے کر آپ کے خلاف شکایت دائر کر دی۔ اور آپ پر مقدمہ چلا۔ یہودیوں کی سپریم کورٹ، جو سانے ہیڈرین (SINEHEDRIN) کہلاتی تھی، مقدمہ کی سماعت کے لیے بیٹھی استغاثہ کی پیروی یہودیوں کے سب سے بڑے رہنما نے کی۔ اور آپ کو اس الزام میں مجرم قرار دیا گیا کہ آپ اپنے کو خدا کا بیٹا اور مسیح موعود کہتے ہیں آپ کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ آپ کے خدا کا بیٹے کہنے اور مسیح موعود ہونے کی حقیقت صرف یہ تھی کہ ایک دفعہ ان کے ایک حواری سائمن پیٹر نے کہہ دیا تھا۔ کہ میں یقین کرتا ہوں کہ آپ یسوع موعود ہیں۔ حالانکہ اپنے وعظ میں خدا کے متعلق باپ (FATHER) کا لفظ آپ عام معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ کیونکہ ایک لحاظ سے خدا سب کا باپ ہے۔

سزائے موت کے حکم کی تعمیل رومی حاکم (PONTIUS PILATE) کے سپرد ہوئی اور آپ کو صلیب پر چڑھادیا گیا۔ صلیب پر چڑھتے ہوئے آپ کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ "میرے خدا! میرے خدا! تو مجھے کیوں بھول گیا ہے" اس بے بسی کی حالت میں آپ کے مرید بھی آپ کو چھوڑ گئے جوڈس تو خود مستغیث بن گیا تھا۔ ایک اور حواری سے آپ کے متعلق کچھ سوال پوچھے گیے۔ جواب ملا میں تو اس شخص کو جانتا ہی نہیں۔

یسوع کے صلیب پر الفاظ "میرے خدا۔ میرے خدا! تو مجھے کیوں بھول گیا ہے" نے لوگوں کے

دلوں میں طرح طرح کے خیالات پیدا کر دیے۔ پہلی اور دوسری صدی میں اسکندریہ علم و فضل کا گھر تھا۔ اور اس طرح جملہ مذاہب کی چھان بین کا گھر۔ وہاں یہودیوں اور مجوسیوں کے سوا ایک تحریک شروع ہو چکی تھی۔ جہاں مختلف دیوتاؤں کی بجائے ایک دیوتا یعنی خدا کا دھندلا سا تصور شروع ہو چکا تھا جیسا کہ آغاز اسلام سے پہلے ایک جماعت نے جس کو حنیف کہتے تھے ایک خدا کے نظریے کا رجحان پیدا کر دیا تھا۔ یسوع ایک خدا اور خدا کی بادشاہت کا پرچار کرتے تھے۔ بلکہ ایک عالمی خدا کا جو صرف انصاف پسند ہی نہ تھا۔ بلکہ نیک آدمیوں اور عاجزوں کا ہمدرد۔ اس لیئے لوگوں نے سوچنا شروع کیا کہ اگر ایک خدا ہے اور عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق یسوع اس کا بیٹا بھی ہے۔ تو خدا نے یسوع کو صلیب پر ایک مجرم کی ذلیل موت کیوں مرنے دیا۔ اور وہ بھی ایک رومی حاکم کے حکم کے ماتحت۔ خدا اس شخص کو کیوں بھول گیا جو ہر وقت خدا اور اس کی بادشاہت کا ذکر کرتا تھا۔ اس وقت کے ذہن کے مطابق ان سوالوں کا ایک ہی جواب ہو سکتا تھا۔ کہ جو کچھ لوگوں نے دیکھا وہ اس طرح واقع نہیں ہوا اور حقیقت کسی پردے کے پیچھے چھپی ہے۔

آپ کے صلیب پر وفات پانے کے متعلق کئی نظریے ہیں۔ جو ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں

۱۔ کہ حضرت عیسیٰ کی صلیب پر وفات ہوئی۔ اور وہ دوبارہ نہیں آئیں گے۔

۲۔ کہ حضرت عیسیٰ کی وفات صلیب پر نہیں ہوئی اور وہ چوتھے آسمان پر زندہ ہیں۔ جہاں سے وہ قیامت کے دن سے پہلے اتریں گے اور ان کا اترنا قیامت کی ایک نشانی ہوگی۔

۳۔ قرآن کی متعلقہ آیات کی، جن میں سورت $\frac{4}{58}$ بھی شامل ہے، تشریح اس طرح پر کی جاتی ہے کہ جو منظاہرہ لوگوں نے حضرت عیسیٰ کے صلیب پر چڑھائے جانے کا دیکھا۔ وہ ایک قسم کا فریب نظر تھا۔ دراصل حضرت عیسیٰ کی وفات صلیب پر نہیں ہوئی بلکہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھا لیا۔ جہاں وہ چوتھے آسمان پر زندہ ہیں۔ وہاں سے وہ قیامت سے پہلے اتریں گے۔

۴۔ ایک نظریہ فرقۂ ادریت یا غناسطی کا ہے۔ جس کی متبرک کتابیں حال ہی میں مصر میں ایک مقبرے سے جو ناغ حمادی کے قریب ہے برآمد ہوئی ہیں۔ اس فرقہ کے عقائد کا یہاں بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اس فرقہ کے پیرو اب تک عراق کے دلدلوں میں رہتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے۔ کہ دنیا دکھ درد اور بدی سے بھری ہے (اسی خیال کا مقابلہ کریں۔ بدھ مت کے عقیدے کے ساتھ) یہ کسی ارفع ہستی کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔ حقیقی ارفع ہستی کی دنیا آسمانوں پر ہے۔ جو نظر نہیں آسکتی۔ اور جس پر ارفع ہستی کی حکومت ہے۔ یہ مذہب عیسائیت کے منفی مگر متوازی خیال پر مبنی ہے۔ اس فرقہ کے عقیدے

کے مطابق اس ارفع ہستی کی دنیا کے نچلے طبقہ میں ایک عورت تھی جس کا نام صفیہ تھا۔ اس عورت نے بغیر جنسی تعلق کے ایک بچہ کو جنم دیا۔ جس کا نام بلدا باؤث دیوتا تھا۔ اور موجودہ مادی دنیا اس دیوتا کی پیدا کردہ ہے۔ اس فرقہ کے عقیدے کے مطابق نجات کا طریقہ بذریعہ ایک خاص علم ارفع ہستی میں جذب ہو جانا ہے۔ ان کے خیال میں یسوع ناصری کی وفات صلیب پر واقع نہیں ہوئی بلکہ ایک شخص سائمن صلیب کو مع یسوع ناصری اٹھا کر گلغوثہ پہاڑی پر لے گیا۔ اور کسی حادثہ کی وجہ سے سائمن خود، صلیب پر چڑھ کر مر گیا۔ اور یسوع ناصری اس واقعہ کو ہنس کر دیکھتے رہے۔ باغِ عدن کے سانپ کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ وہ ایک قسم کا ہیرو نہ کہ شیطان ثابت ہوا۔ کیونکہ اس نے علم کے شجر کا راز افشاں کر دیا۔ جس کو بلدا باؤث مخفی رکھنا چاہتا تھا۔ اسی طرح حضرت نوح کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ انہوں نے بلدا باؤث کے ساتھ مل کر غنا سطیوں کو ایک طوفان پیدا کر کے تباہ کرنا چاہا۔ اور بعد میں جب انہوں نے سادوم اور عمورہ کے شہروں میں پناہ لی تو بلدا باؤث نے ان پر پتھر برسائے۔

(TIME JUNE 9, 1975)

تثلیث: کیونکہ عیسائی عقیدوں اور رسوم کا ایک معجزہ نما اور فوق الفطرت پہلو ہے۔ اس لیے شروع سے ہی عیسائیت میں مختلف فرقے پیدا ہونے شروع ہوئے۔ عیسائیت میں اول مسئلہ تثلیث ہے۔ اس مسئلہ پر کیتھولک فرقے کی پہلی کونسل میں جو ۳۲۵ء میں منعقد ہوئی تثلیثیوں اور مواحدین (UNITARIANS) میں سخت نزاع پیدا ہوا۔ مواحدین کا عقیدہ ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ خدا کے ماتحت ہیں۔ اور خدا نے ہی ان کو پیدا کیا۔ اس کے برعکس اہل تثلیث ایک خدا کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں (۱) خدا باپ (۲) عیسیٰ بیٹا اور (۳) روح القدس۔ ان تینوں کی اصلیت اور قسم ایک ہے اور وہ تینوں آپس میں برابر ہیں۔ ان کی تخلیق نہیں ہوئی اور وہ قادر مطلق ہیں۔

رفع سماوی: دوسرا عقیدہ جو عیسائیت میں بنیادی عقیدہ ہے یہ ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ دوبارہ جسمی طور پر زندہ ہو کر روح کے ساتھ مل گیے۔ ابتداء کے عیسائیوں میں یہ عقیدہ نہیں تھا۔ اور زمانہ حال تک عیسائی تعلیم یہی رہی ہے۔ کہ دوسری زندگی میں انسان اپنے طبعی جسم کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ عام طور پر عیسائی تعلیمات انسانی جسم اور دوبارہ زندہ ہونے والے میں ایک غیر منقطع تعلق پر اصرار کرتی ہیں۔ عیسائی روائتوں کے مطابق حضرت عیسیٰ کے صلیب پر وفات پانے کے بعد ان کا جسم اتوار کے دن قبر سے غائب ہو گیا اور وہ زمین پر چلتے پھرتے دیکھے گیے اور وفات کے چالیس دن بعد لوگوں نے دیکھا کہ آپ کو فرشتے آسمان کی طرف اٹھائے لیے جا رہے ہیں۔ اس دن کو عیسائی بطور تہوار گرجوں میں ایسٹر کے چالیس دن بعد کی جمعرات کو مناتے ہیں۔

عشاءِ ربانی: رومن کیتھولک فرقہ کا ایک عقیدہ، جس پر کونسل آف ٹرینٹ (CUNCIL OF TRENT)

کے بعد یقین رکھنا پڑتا ہے' یہ ہے۔ کہ عشاءِ ربانی پہ جو کھانا کھایا جاتا ہے۔ اس میں روٹی حضرت عیسیٰ کے گوشت اور شراب حضرت عیسیٰ کے خون میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ظاہرہ طور پہ روٹی اور شراب اپنی اصل شکل قائم رکھتی ہیں۔ مگر درحقیقت ان دونوں میں اندرونی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ یہ عقیدہ عام عیسائیوں کا نہیں۔ مگر انگلستان کے کلیسا کے ایک فرقہ کا اس معجزہ پہ ایمان ہے۔

معصوم حمل کا مسئلہ : اس مسئلہ کا اوپر کچھ ذکر آچکا ہے۔ معصوم حمل کے عقیدے کا یہ مطلب ہے۔ کہ حضرت مریم کو بغیر کسی گناہ یعنی جنسی ملاپ کے حمل ٹھہرا اور حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے۔ یہ مسئلہ پہلی دفعہ بارھویں صدی میں سُنا گیا۔ جب اس مسئلہ کے متعلق ایک تہوار منایا گیا۔ چودھویں صدی میں یہ مسئلہ متنازع مسئلہ بن گیا۔ مگر ۱۸۵۹ء میں یہی مسئلہ رومن کیتھولک فرقے کے عقیدہ کا ایک لازمی جزو بن گیا۔

اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ نے اپنے وعظوں میں جو باپ (FATHER) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ وہ عام معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ خدا تو ساری مخلوق کا ایک معنی میں باپ ہے یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ نے اپنے آپ کو انسان کا پسر (SON OF MAN) بھی کہا ہے۔ (ENCYCLOPEDIA)

کفارہ : کفارہ ایک عام لفظ ہے۔ جس کے معنی گناہ کا معاوضہ دے کر یا اس کی سزا پا کر گناہ سے پاک ہونا اور خدا کے حضور میں مقبول ہونا ہیں۔ عیسائی پادری اس مسئلہ پہ شدید اختلاف رکھتے ہیں۔ مگر عام عیسائیوں میں اس لفظ کے معنی یہ لیے جاتے ہیں۔ کہ حضرت عیسیٰ نے صلیب پہ موت کی تکلیف اس لیے اٹھائی کہ آپ کے پیرو گناہوں کی سزا سے نجات پا سکیں۔

یسوع کی تعلیمات سے غریب طبقہ بہت متاثر ہوا۔ آپ نے بدی، بے رحمی، ظلم اور عیش و عشرت کی زندگی کی مخالفت کی اور نیکی اور دیانتداری کی تلقین کی۔ حضرت موسیٰ کے دس احکام کو بذریعہ ترامیم اور بھی سخت کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ احکام زمانہ حاضرہ میں انسانی فطرت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ناقابلِ عمل ہیں۔ آپ کی ضروری تعلیمات آپ کے پہاڑی وعظ اور انجیل میں درج ہیں۔ آپ نے ان لوگوں کو جو مسکین، یا کسی غم میں ماتم کناں، یا نیکی کی بھوک پیاس رکھتے تھے' یا رحم دل تھے' یا دل کے غریب تھے' یا صلح جُو تھے اور اپنے حواریوں اور مریدوں کو مخاطب کر کے فرمایا

۱۔ نیکی کرو اور خدا کی بادشاہت ڈھونڈو۔

۲۔ زنا کا خیال تک نہ کرو۔

۳۔ اپنی بیوی کو مت چھوڑو۔

۴۔ مطلقہ سے شادی نہ کرو۔

۵۔ اگر آپ کی دائیں آنکھ یا دایاں ہاتھ کوئی گناہ کرے۔ تو آنکھ کو نکال ڈالو اور ہاتھ کو کاٹ دو۔

۶۔ خیرات کرو۔ دعا میں مشغول رہو اور بغیر کسی نمائش کے روزہ رکھو۔
۷۔ خیرات یا قرضہ مانگنے والے کو مایوس نہ کرو۔
۸۔ جو لوگ آپ کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔ ان کو معاف کر دو۔
۹۔ اپنے دشمنوں سے بھی محبت کرو اور ان کے لیے دعا کرو۔
۱۰۔ اگر آپ کے دائیں رخسار پر کوئی تھپڑ مارے تو اس کے آگے بایاں رخسار بھی کر دو۔
۱۱۔ جو آپ کا کوٹ مانگتا ہے۔ اس کو اپنا چوغہ بھی دے دو۔
۱۲۔ جو آپ کو گال دے۔ اس کو برکت سے یاد کرو۔
۱۳۔ پیشتر اس کے کہ آپ دوسروں میں کوئی نقص تلاش کرو۔ اپنا نقص دور کرو۔
۱۴۔ دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کرو جو آپ اپنے ساتھ کروانا چاہتے ہو۔
۱۵۔ آخرت کے لیے خزانے اکٹھے کرو نہ کہ اس زندگی کے لیے کیونکہ آپ اصل خدا اور دولت کے بھوت دونوں کی ایک وقت میں خدمت نہیں کر سکتے۔
۱۶۔ اپنے لباس کا خیال نہ کرو کیونکہ خدا تو جنگل کے اس پھول کو بھی لباس دیتا ہے۔ جس کی خوبصورتی کے آگے سلیمان کی زرق برق پوشش کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔

سامعین کو بتایا گیا۔ کہ اگر وہ ان اصولوں پر عمل کریں گے۔ تو ان میں سے ہر شخص اپنے لیے ایک دانا انسان کی طرح ہوگا۔ جو چٹان پر مکان بناتا ہے۔ جس کو نہ بارش، نہ ہوا اور نہ سیلاب ہلا سکتا ہے۔ یہ نصائح اتنی بلندی رکھتے ہیں کہ آج کل کے زمانہ میں ناقابل عمل معلوم ہوتے ہیں۔ مگر انہی اصولوں پر چل کر گاندھی جی مہاتما بن گئے اور دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے پنجے سے اپنے ملک کو آزاد کرا گئے۔

عیسائیت میں، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، شروع سے ہی عقائد و رسوم میں اختلافات شروع ہو گئے تھے۔ ان تفرقات نے سولہویں صدی کے آغاز میں ایک شدید صورت اختیار کر لی۔ پاپائے روم عیسائیت کا والی تسلیم کیا جاتا تھا۔ اور تمام عیسائی ممالک کے مذہبی امور کی نگہداشت اس کے سپرد تھی۔ اور اسی وجہ سے اس کو ان ممالک کی سیاسیات میں دخل حاصل ہو چکا تھا۔ مگر سولہویں صدی کے شروع میں ان اختیارات کی مخالفت شروع ہو گئی۔ اس کے کئی اسباب تھے۔

۱۔ یورپ میں اس وقت قومیت کا نظریہ ابھر رہا تھا۔ جو بیرونِ ملک کی مداخلت کے خلاف تھا۔
۲۔ کلیسا کے پادریوں کی مختلف جماعتوں میں بداخلاقی اور رشوت کا عام رواج ہو گیا تھا۔
۳۔ تجدید علوم کے زمانے نے عیسائیت کے عقائد میں شکوک پیدا کر دیے تھے۔

اس لیے پاپائے روم نے سینٹ پیٹر کے گرجا کی عمارت میں کچھ ایزادی کرنے کے لیے چندہ

اکٹھا کرنا اور جو لوگ چندہ دیتے تھے ان کی نجات کا ذمہ لینا شروع کیا۔ تو اس کی مخالفت شروع ہوگئی۔ کیونکہ نجات کا راستہ روپیہ بن گیا نہ کہ اعمال نیک اور عقیدہ۔ سب سے پہلے پوپ اور اس کے سلسلہ کا مخالف جرمن کا مارٹن لوتھر (MARTEN LUTHER) بنا۔ آہستہ آہستہ اس کے نظریہ کو اور لوگوں میں مقبولیت حاصل ہوگئی۔ اس طرح عیسائیت کے دوسرے اہم فرقے پروٹسٹنٹ (PROTESTANT) کی بنیاد پڑی۔

پوپ نے مارٹن لوتھر کو عیسائیت سے خارج کر دیا۔ مگر پھر عشق اور مذہب میں بھی ٹکراؤ کا موقع پیدا ہو گیا۔ جب انگلستان کے بادشاہ ہنری ہشتم نے اپنی پہلی بیوی سے طلاق حاصل کر کے اپنی معشوقہ این بولین (ANNE BOLEYN) سے شادی کرنی چاہی۔ پوپ نے مجوزہ طلاق اور شادی کی مخالفت کی۔ مگر ہنری کا عشق ایک جنون کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اس لیے اس نے پوپ کا جوا اپنے کندھے سے اتار کر چرچ آف انگلینڈ قائم کر کے پاپائے روم سے بالکل قطع تعلقی کا اعلان کر دیا۔

کیونکہ پوپ اپنے آپ کو عیسائی عقیدہ کا نگہبان سمجھتا تھا۔ اس نے مذہبی عدالتیں قائم کیں۔ جن کا یہ فرض تھا۔ کہ جو لوگ پوپ کی عیسائیت سے اختلاف کا اظہار کریں ان کو سزا دی جائے۔ ان عدالتوں نے ایسے مذہبی جوش کا اظہار کیا۔ اور وہ ایسے غیر انسانی افعال کی مرتکب ہوئیں۔ کہ تاریخ میں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ نزاع تاریخ کا ایک سیاہ ورق بن کر رہ گیا۔ دیانتدار اور مخلص انسان مذہب کے اختلاف کی وجہ سے زندہ جلا دینے شروع ہوئے۔ ان کی جائدادیں ضبط کی گئیں۔ ان کو اپنی بے گناہی یا سچائی ثابت کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا۔ ان کی طرف سے وکیل پیش نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک مصنف لیکی (LECKY) لکھتا ہے۔ کہ روم کے کلیسا نے اتنا معصوم خون بہایا۔ کہ تاریخ انسان میں کسی اور مذہب یا ادارے نے نہیں بہایا تھا۔ فرانس میں پروٹسٹنٹ ہیوگے نوٹ (HUGUENOT) کہلاتے تھے۔ اور سینٹ بارتھولومیو (ST BATHOLOMEW) کے تہوار پہ ۴۰۰۰ پروٹسٹنٹ ۱۵۷۲ء میں قتلِ عام کے دوران مارے گئے۔ ہسپانیہ میں ۵۰۰۰ ہزار سے زائد یہودی، ۲۲۰ پروٹسٹنٹ اور رہے سہے مور مسلمان مارے گئے۔ مذہبی دشمنی اس قدر بڑھی۔ کہ بھلے چنگے انسان مقتولین کی کھوپڑیوں کو پانی یا شراب پینے کا پیالہ بنا کر خوش ہوتے تھے۔

ہالینڈ کے پروٹسٹنٹ ملحد کہلائے۔ اسی فرقہ پہ جو مظالم ۸۰ سال تک روا رکھے گئے ناقابلِ بیان ہیں۔ کسی شخص کو ملحد قرار دینے کا طریقہ یہ تھا۔ کہ اگر دہکتے ہوئے لوہے یا اُبلتے ہوئے پانی سے ملزم متاثر ہو تو اس کا جرم ثابت شدہ قرار دیا جاتا تھا۔ سزا جرم کی یہ تھی۔ کہ مجرم کے کپڑے اتار کر اس کو لکڑیوں کے انبار سے باندھ کر جلتی ہوئی لکڑیوں کی آگ میں ڈال دیا جاتا تھا۔ پھر اس کی کھال ادھیڑی جاتی تھی اور اس کو مزید تکلیف پہنچانے کے لیے اس کے رستے ہوئے زخموں پر شہد کی

مکھیاں چھوڑ دی جاتی تھیں تاوقتیکہ موت اس کو اس عذاب سے نجات نہ دلا دے۔

اگر عیسائیت کی بنیاد یسوع ناصری کے اصولوں اور اخلاقی نصیحتوں کے نچوڑ پر پڑتی۔ تو عیسائیت ایک متحدہ اور معقول المعنی مذہب رہتا اور مختلف فرقوں میں بٹ کر اس میں وہ توہم، نفاق اور انتشار پیدا نہ ہوتا جو بعد میں خون خرابے کا باعث بنا۔ مگر عیسائیت کی پیدائش زمانہ قبل از تاریخ میں ہوئی جن دنوں میں لوگ معجزوں، جادو اور پیشگوئی کرنے والوں پر یقین رکھتے تھے۔ اور جب تک کسی مذہب میں معجزات جگہ نہ لیں مذہب ایک بے رنگ عقیدہ رہتا تھا۔ چنانچہ اس زمانے کی صریح الاعتقادی کی وجہ سے عیسائیت میں ایسے معجزات شامل ہو گئے۔ جن سے عیسائیت عجائبات کا ایک مجموعہ بن گئی۔ جس کی ساخت میں سینٹ پال نے، جو شروع میں یہودی اور عیسائیت کا دشمن تھا مگر بعد میں ایک رویا دیکھ کر عیسائی ہو گیا تھا، اہم کردار ادا کیا۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے۔ کہ موجودہ عیسائیت کے اس بانی نے یسوع ناصری کو اپنی زندگی میں کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔

یسوع ناصری کا موت کے بعد زمین پر زندہ پھرنا اور پھر آسمان کی طرف اٹھایا جانا یعنی رفع سماوی، تثلیث، کفارہ، عشاء ربانی، یسوع کا مُردوں کو زندہ کرنا۔ یہ سب مافوق الفطرت عقائد تھے مگر عیسائیت پر کاری ضرب اس وقت لگی جب ڈارون نے ہزارہا میلوں کے سفر کے دوران حیوانات کی قسموں کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے بعد اور محنت شاقہ اور عمیق تخیل سے یہ ثابت کر دیا۔ کہ عیسائیت کا یہ عقیدہ کہ نسل انسانی ۴۰۰۴ قبل مسیح شروع ہوئی غلط ہے۔ اور بعد کی کھدائیوں نے ڈارون کے اس نظریے کی تصدیق کر دی۔

اگر یسوع ناصری کے پہاڑی وعظ کی اخلاقی ہدایات کے اصولوں کا اسلامی اخلاقیات سے مقابلہ کیا جائے تو ان دونوں میں بہت حد تک مشابہت پائی جائے گی۔ اگرچہ ان میں سے چند ہدایات آج کل کے زمانہ میں فطرت انسانی کو مدنظر رکھتے ہوئے ناقابلِ عمل ہیں۔ اور اسلام کی ہدایات زیادہ وسیع اور واضح ہیں اور ان میں سے کچھ تبدیلیٔ زمانہ سے بھی متاثر ہوئی نظر آتی ہیں۔ اگرچہ ان کی بنیاد وحی ہی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ بعض اخلاقی اور سماجی معیار ایسے ہیں کہ وہ انسانی معاشرہ کی بقا اور ترقی کے لیے وقت کے مطابق بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر یسوع ناصری کے معاشرے اور اسلام کے معاشرے میں قریباً ۶۰۰ سال کا فرق ہے۔ اور اس عرصہ میں بہت سی سماجی، سیاسی اور اقتصادی تبدیلیاں واقع ہو چکی تھیں۔ اس لیے اس وحی کے لیے جو اسلام کی بنیاد ہے آخری وحی ہونے کی وجہ سے ضروری تھا۔ کہ وہ انسان کی نئی سرگرمیوں پر بھی حاوی ہو۔ اس متواتر تبدیلی اور مکان و زماں کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اسلام سے بہتر اور کوئی مذہبی نظام نہیں ہے۔ اسلام کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ کہ اسلامی معاشرہ ہمیشہ کے لیے منجمد ہو کر رہ جائے۔ اس لیے یہ ضروری تھا۔ کہ مستقبل کی سرگرمیوں کے جائز یا ناجائز ٹھہرانے

کے لیے جو اسلام کے ابتدائی وقت میں موجود نہ تھیں کوئی ذریعہ یا طریقہ بنایا جائے
پلیٹ فارم اور ممبر سے جو اس بات کا بار بار اعلان کیا جاتا ہے۔ کہ اسلام ایک مکمل اور مستقل ضابطۂ حیات ہے جس میں کسی قسم کی تبدیلی یا ترمیم کی ضرورت نہیں۔ صرف ان معنوں میں درست ہے۔ کہ اللہ نے آخری ضابطۂ حیات انسان کو عطا کیا اور کہ آئندہ کوئی صاحبِ شریعت نبی نہیں آئے گا۔ اور وحی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے۔ آئندہ کے لیے مسلمانوں نے اپنے معاملات وحی اور سُنت کے اصول کے اندر رہ کر طے کرنے ہیں۔ دوسری بات جو یاد رکھنی چاہیئے اور جس پر عیسائی بھی زور دیتے ہیں' یہ ہے کہ حضرت عیسٰی کے پہاڑی وعظ اور دیگر ہدایات کا منشا بھی یہ تھا۔ کہ عیسائی ایک علیحدہ اور افضل معاشرہ کے افراد ہوں جو دوسرے معاشروں کے افراد سے اپنی خوبیوں کی وجہ سے ممتاز ہوں۔ مسلمانوں کو اللہ نے خَیْرَ اُمَّۃٍ کے نام سے پکارا ہے۔ اور سوائے چند ہدایات کے جو احادیث سے لی گئی ہیں۔ خود قرآن نے سچے مسلمانوں کے اوصاف بیان کر دیے ہیں۔ یہ بات قرآن کے ان حوالہ جات سے عیاں ہو جائے گی۔ جو پہلے بیان کیے جا چکے ہیں۔ قرآن کی ان آیات میں بار بار نیک کاموں اور عمل صالح پر زور دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن نے ذخیرہ اندوزی اور سود کی مذمت کی ہے۔ غریبوں کو خیرات دینے اور ان لوگوں کی مدد کرنے پر زور دیا ہے۔ جو تنگدست ہوں، محتاج یا یتیم ہوں یا ایسی عورتیں ہوں جو بیوہ ہو چکی ہوں اور بے سہارا ہوں۔

دنیا کے مشہور مذاہب کے عقیدوں' مذہبی رسوم اور اخلاقی عمل کا ذکر کرنے کے بعد اب اسی سوال پر رائے ظاہر کرنا باقی رہ گیا ہے کہ ان تمام مذاہب میں کون سا مذہب ایسا ہے۔ جو ایک خاص قسم کا یعنی مثالی یا کامل انسان پیدا کر سکتا ہے اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ اسلام سے قبل مذاہب کا نہ ہی یہ منشا تھا اور نہ ہی انسان کو ایسے عمل کی ہدایت کی گئی تھی جس کو ریاست کی پالیسی کہا جائے۔ مگر اسلام میں ایسی پالیسی کے متعلق احکامات موجود ہیں۔

اگر اسلام کا منشا مردِ کامل یا مثالی انسان پیدا کرنا تھا۔ تو یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا اس مقصد میں اسلام آج کل بھی کامیاب ہے۔ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ایک اور بات ذہن نشین ہونی چاہیئے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ زمانہ قدیم سے زمانہ حال تک مذہب کا وہ حصّہ جو انسان کے باہمی تعلقات (حقوق العباد) کے متعلق ہے۔ دوسرے مذاہب سے کچھ زیادہ متصادم نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ مذہب کے اس حصّہ کے دو مدعا ہیں (۱) معاشرہ کی محافظت (۲) معاشرہ کی اخلاقی، روحانی، دنیوی سماجی اور ذہنی نشو و نما۔ اس لیے یہ مقاصد حاصل کرنے کے لیے قواعد و ضوابط بھی ایک ہی قسم کے ہونے چاہئیں۔ مگر ان میں مکان و زماں کے اختلاف کو مدِنظر رکھنا ضروری ہے۔ اس واسطے یہ قواعد' خواہ ہموّرابی کے قوانین میں پائے جاتے ہوں یا سولن کے قوانین میں یا بدھ مت کی ہدایات میں یا

زرتشت کی تعلیمات میں یا حضرت موسیٰ کے دس احکام میں یا حضرت عیسیٰ کے پہاڑی وعظ میں یا قرآن وحدیث میں، بہت حد تک مشابہت رکھتے ہیں۔ چھوٹے موٹے اختلافات ان میں ضرور ہیں۔ لیکن اگر ان کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ تو ان سب میں کچھ مشترکہ اصول ضرور پائے جاتے ہیں۔

بدھ خدا پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس کو زندگی دکھ درد سے بھری نظر آتی تھی۔ اور اس کی تعلیمات کا مقصد یہ تھا۔ کہ اس دکھ درد سے نجات پائی جائے۔ اس مدعا کو حاصل کرنے کے لیے اس نے زندگی ہی کا خاتمہ ضروری سمجھا۔ بذریعہ خودکشی نہیں۔ بلکہ بار بار پیدائش اور موت کے لامتناہی سلسلہ اواگون کو ختم کرنے سے۔ مگر یہ سلسلہ نیک کاموں کے کرنے سے ہی ختم ہو سکتا تھا۔ اس لیے نیکی بدھ کی تعلیمات میں پہلی کڑی بنی۔ زرتشت کی تعلیم کا خلاصہ صرف ایک فقرہ میں بیان کیا جا سکتا ہے "کوئی بدی نہ کرو، بدی کا خیال نہ کرو اور بدی کی بات نہ سنو۔" اس سے وہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ جو بدھ کے زیرِ نظر تھا۔ حضرت موسیٰ کے دس احکام بنیادی نیکیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن پر معاشرے میں رہتے ہوئے انسان کو عمل کرنا پڑتا ہے۔ حضرت عیسیٰ نے ان کو اور بھی سخت بنا دیا۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن نیکی کی بار بار تاکید کرتا ہے۔ اور حدیث بعض جگہ اس کو مذہبی رسوم مثلاً نماز اور روزہ پر بھی ترجیح دیتی ہے۔ اس لیے وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ سب مذاہب یکساں ہیں۔ اس حد تک درست ہیں کہ ہر مذہب کا مدعا انسان کو اخلاقی اقدار اور عمل صالح کی رغبت دلانا ہے۔

ایک اور بات جو نظر سے اوجھل نہیں ہونی چاہئیے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اخلاق کا ایک بڑا حصہ جو شروع میں مذہب کے لیے مخصوص تھا۔ اب دائرہ قانون میں آکر قابلِ تعزیر بن چکا ہے۔ اور فرد کا دائرہ اختیار اور اخلاقی سرگرمی بہت حد تک سکڑ چکے ہیں۔ اس سے بعض لوگ استدلال کرنے میں تامل نہیں کرتے کہ اب مذہب انسانی کے لیے ضروری نہیں رہا۔ کیونکہ حکومت جو توقع عوام سے رکھتی ہے۔ یا جس عمل پر عوام کو مجبور کرتی ہے وہ یہ ہے کہ قانون پر عمل کرو۔ باقی جو کچھ آپ کرتے ہو۔ حکومت کو اس سے سروکار نہیں۔ یہ غیر دینی مملکت، جمہوریت اور سرمایہ داری کا پہلا اصول ہے اسلام میں جو اخلاقی احکام کی فہرست ہے۔ ایک محقق کے مطابق اس کے اٹھارہ بنیادی اجزا میں سے ۱۵ موجودہ قانون کے دائرے میں آ چکے ہیں اور صرف تین فرد کے دائرۂ اختیار میں رہ گئے ہیں۔ اس فہرست میں وہ افعال درج نہیں جن کے لیے شریعت نے سزا مقرر کی ہے۔ اس لیے پھر وہی سوال سامنے آتا ہے۔ کہ اسلام نے انسانی ارتقا میں کیا کردار ادا کیا ہے۔ اس مرحلہ پہ ایک اور بات کی طرف توجہ دلانا نامناسب نہ ہوگا۔ ان لوگوں کی تعداد جو مذہبی جنگوں کی نذر ہوئے۔ اس تعداد سے زیادہ ہے۔ جو کسی اور وجہ سے غیر مذہبی جنگوں میں مارے گئے۔ مگر یہ بغیر کسی اختلاف کے کہا جا سکتا ہے۔ کہ ایسے پرہیزگار اور متقی لوگ موجود ہیں جو مذہب کو صرف سیاسی اغراض کے لیے استعمال نہیں کرتے۔ اور جو یہ یقین رکھتے ہیں۔ کہ کوئی مذہب

دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے لیے دشمنی اور نفرت نہیں پھیلاتا کیونکہ سب مذاہب کی بنیادی اقدار یکساں ہیں۔ ان اقدار کو فروغ دینے والے قابلِ قدر انسان ہیں۔

مذاہب کو غلط ملط کر کے ان سے مشترکہ جوہر چننے کے لیے کئی تحریکیں جاری ہوئیں۔ سکھ مذہب، برہمو سماج، مسز این بسنٹ کی تھیوسوفیکل سوسائٹی، اور گاندھی جی کی ہفتہ وار دعائیہ مجلسیں اسی تحریک کے نظریہ پر مبنی تھیں۔ کبیر اور گورونانک کے تصوف سے یہ پتہ لگانا مشکل ہے۔ کہ وہ کس مذہب کے پیرو تھے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذاہب کو یکساں درجہ دیتے تھے۔ اکبر اعظم، کی جو تاریخ میں سب سے بڑا فراخدل بادشاہ گزرا ہے۔ کی بے سود کوششیں اسی سلسلہ میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ ایک اور تحریک، جس کا صدر مقام جینوا کے نزدیک لوسان میں ہے، روٹری اور لائن کلب جو مذہبی تخصیص روا نہیں رکھتے۔ اسی اصول پر مبنی ہیں اس سلسلہ کی ایک دلچسپ حالیہ تحریک ہے۔ جس کا مدعا تمام مذاہب میں اتحاد پیدا کرنا ہے۔ اس کے بانی ایک ڈاڑھی رکھنے والے نوجوان پیر ولایت عنایت خاں ہیں۔ وہ ایک ہندستانی صوفی کے پسر ہیں اور برطانیہ میں پیدا ہوئے۔ گزشتہ اکتوبر میں اس تحریک کا اجلاس نیویارک میں ہوا۔ جس میں یہودیوں، عیسائیوں، مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے نمائندے شامل ہوئے۔ ایک اونچا پلیٹ فارم بنایا گیا جس کے کئی درجے تھے۔ سب سے اونچی جگہ پیر ولایت عنایت خاں سنہری ریشم میں ملبوس خدا بن کر بیٹھے۔ اس سے نچلے درجے پر مادر عالم، جن کی آنکھوں پر نیلے کپڑے کی پٹی بندھی ہوئی تھی، بیٹھیں۔ راما پاکستانی نما کپڑوں میں ملبوس ایک خوبصورت لڑکی معلوم ہوتے ہیں اور وہ خدا کی دائیں طرف کھڑے ایک بھجن گا رہے ہیں۔ پلیٹ فارم کے سامنے سے اچھلتے کودتے جن اور فضا میں تیرتے ہوئے فرشتے گزرے۔ اس کے بعد بانیان مذاہب، موسیٰ، عیسیٰ (حضرت) محمد، بدھا، شو وغیرہ اپنے اپنے مذہب کا مرکزی اصول بیان کرتے ہوئے گزرے پھر پیر ولایت عنایت خاں اس طرح مخاطب ہوئے "میں وہ واحد ہوں جس سے مجھے خود عشق ہے صرف ایک ہی واحد ہے۔ جو سب میں ہے اور جس میں سب ہیں" اس سارے تماشے پر ٹائم نے صرف ایک فقرے میں تبصرہ کیا کہ (حضرت) محمد نے جنہوں نے انسان سے کسی اونچے درجے کا دعویٰ نہیں کیا تھا اپنے آپ کو خداؤں کی ایک عجیب صحبت میں پایا ہو گا"۔ بہت سے لوگوں کے دل میں یہ خیال موجود ہے۔ کہ ایک مشترکہ مذہب اتنا ہی ممکن یا ناممکن ہے۔ جیسے کہ دنیا کی ایک حکومت یا زبان۔ مگر اس غرض کے حصول کے لیے انسانی ذہن میں ایک بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس لیے غیر معین عرصہ تک اپنا اپنا مذہب انسان کے لیے اتنا ہی ضروری رہے گا۔ جتنا آج کل۔

امن، آشتی، صلح جوئی، امداد باہمی پر اسلام نے شروع سے ہی زور دیا ہے۔ اور یہ ایسی صفات ہیں جن کی بنا پر ایک عالمگیر وفاق قائم ہو سکتا ہے۔ جس میں لڑائی جھگڑے کی گنجائش نہ ہو۔ انسانی

ہمدردی اور امداد کا جذبہ ہر شخص اور قوم پر ایسا غالب آجائے۔ جو دنیا کی شکل بدل کر ایک راحت و خوشی کے دور کا آغاز کر دے۔ میں اس مدعا کے حاصل کرنے میں اسلام کو سدِّ راہ نہیں سمجھتا ہوں۔ ایسے وفاق میں ہر ایک گروہ اپنی قومی خصوصیات، تہذیب، ثقافت اور مذہبی رسوم قائم رکھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ ان میں نفرت اور حقارت کا عنصر نہ ہو۔ دنیا کے سامنے آج کل جو سوال درپیش ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ کیا جنگ، جس میں دنیا کی تباہی کا امکان موجود ہے، بطور ایک تسلیم شدہ بین الاقوامی حقیقت کے جاری رہے گا یا جو تنازعات انسانوں اور قوموں میں رونما ہوتے ہیں۔ ان کو صلح صفائی سے حل کیا جائے گا۔ کیونکہ اب اگر کوئی عالمگیر جنگ ہوا۔ تو وہ ایسا ہوگا۔ کہ اس میں یا تو مہلک جراثیمی ہتھیار استعمال ہو کر انسانی نسل کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یا اس میں ایسے توانائی آلات استعمال کیے جائیں گے، جن سے زمین کے خطّے کے خطّے انسانی زندگی سے محروم ہو جائیں گے۔ میرے خیال میں انسان میں ابتک ایک ایسا مہین احساس موجود ہے جو کہ، جہاں قومیت کا جذبہ بھی مائل بہ جنگ ہونے کا رجحان رکھتا ہو، دنیا کو تباہ کرنے کی نیّت، خواہش اور ضرورت پہ غالب آکر جنگ کو دور رکھ سکتا ہے۔ اور باہمی نیک دلی، سمجھوتہ اور اعانت سے جنگ کے اسباب کو رفع کر سکتا ہے۔

اسلام کا بنیادی نظریہ توحید ہے۔ اگرچہ یہ لفظ قرآن میں استعمال نہیں کیا گیا۔ لفظ توحُد جو استعمال کیا گیا ہے توحید کا ہی تصور پیش کرتا ہے۔ اس تصوّر کا مطلب یہ ہے۔ کہ ہر لحاظ سے اللہ ایک ہے اس کا کوئی ثانی نہیں۔ نہ کوئی اس کے برابر یا اس سے اعلیٰ ہے۔

توحید کے تصور سے کچھ ایسے نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ جو اسلام کا جوہر ہیں۔ اگر خدا ایک ہے اور اس نے انسان کو پیدا کیا تو اس سے یہ مراد نہیں۔ کہ اسلام میں ایسے شخص پیدا ہوں جن پر شروع سے ہی اسلام کا ٹھپہ لگا ہوا ہو اور یہ پیدائشی ٹھپہ ان کے مسلمان کہلانے کے لیے بلالحاظ عمل کافی ہو۔ اسلام کا منشا ایسے انسان پیدا کرنا تھا۔ جو ہر لحاظ سے آپس میں برابر ہو سکیں، جن میں باہمی اتفاق ہو اور جو ایسے اوصاف کے حامل ہوں جن پر ان کی اخلاقی، روحانی اور دنیوی زندگی کا انحصار ہو۔ خدا کا یہ منشا نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ اس کے اپنے قوانین کے مطابق، نہ کہ ان قوانین میں انسانی مداخلت سے، کچھ لوگ ہمیشہ کے لیے مادی اور روحانی فوائد سے محروم رہیں اور ایک مخصوص طبقہ ان کا ٹھیکہ لے بیٹھے۔ اس وجہ سے اسلام دولت کی مبنی بر انصاف کی تقسیم پہ زور دیتا ہے۔ اور اس کے ذرائع بھی بتاتا ہے۔ مثلاً خیرات، اللہ کے نام پہ دینا، صدقہ، زکوٰۃ وغیرہ۔ اسی اصول پہ اسلام انسان کی مصیبت سے فائدہ اٹھانے، ہر قسم کے استحصال اور دوسروں کا حق چھیننے کی مذمت کرتا ہے۔ مظلوموں کی امداد اور ہر طرح کے ظلم و جبر کی مخالفت مسلمان کا فرض قرار دیتا ہے۔ غلام اور آقا کا فرق دور کرنا، عورتوں کو وہ درجہ دینا جس کی وہ مستحق ہیں، اسلام کی خوبیاں ہیں۔ اس طرح اسلام

دنیا اور اس کی چیزوں پر نئی نظر ڈال کر ایک حقیقی انقلاب کا باعث بنا۔ جیسا کہ پہلے الہامی مذہب رائج الوقت خیالات کے خلاف فضا پیدا کر کے ایک قسم کے انقلاب کے باعث بنے۔

انقلاب عظیم

سابقہ مذاہب اور تہذیبوں کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد اب ہم اس مرحلہ پر پہنچ گئے ہیں۔ کہ اس سوال کا جواب دے سکیں۔ کہ اسلام نے جس انقلاب کو جنم دیا۔ اس کی کیا نوعیت تھی۔ اور ارتقاءِ انسانی میں اس نے کیا کردار ادا کیا۔ اگر موجودہ انسانی نسل کا آغاز ... ۳۵ قبل مسیح ہوا۔ اور تاریخی دور' جو آثارِ قدیمہ کی دریافت اور سائنسی تحقیقات پر مبنی ہے (حالیہ تحقیق پیدائش انسان کو اس سے بھی پیچھے لے جاتی ہے) پندرہ ہزار قبل مسیح شروع ہوا۔ اگرچہ اس زمانے کی کوئی تاریخ موجود نہیں ہے تو پچاس ہزار سال کی اس کرۂ ارض کی انسانی زندگی میں اسلام ایک زبردست انقلاب تھا۔

بڑے بڑے مذہب اور تہذیبیں اسلام سے پہلے بھی گزر چکی تھیں۔ مگر ان میں سے کسی نے بھی انسان کو وہ بنیادی تصورات نہیں دیئے تھے۔ جو انسان کی اخلاقی، روحانی اور دنیوی ترقی کے جزو لاینفک ہیں۔ بے جان مادہ' درختوں' دریاؤں اور مردہ انسانوں کی پرستش نے انسان اور قوموں کی قوموں کو توہمات میں مبتلا اور اپنی زندگی کے مقصد اور اصل حقیقت سے غافل رکھا۔ سب سے پہلا وحی پر مبنی مذہب جس کا تاریخ سے بہت کم پتہ چلتا ہے یہودیت تھا۔ اور اس نے عبادت کی رسوم ہی پر زور دیا۔ بت پرستی کی اس نے ضرور مذمت کی۔ مگر مذہبی رسوم کی بھرمار نے انسان کو دنیا اور زندگی سے علیحدہ رکھا۔ اہل یہود اس ہستی کا انتظار کرتے رہے۔ جو ان کے لیے وہ کام کر دکھائے جو وہ خود کرنے کے قابل نہ تھے۔ یعنی اس عہد کے ایفا میں جو یہووا (JEHOVA) خدا نے ان کے ساتھ کیا تھا۔ ان کا وطن کنعان ان کو واپس دلا سکے اور ان کو ایک بڑے بادشاہ کی حکمرانی ایک مضبوط اور خوشحال قوم بنا سکے۔ مگر جس ہستی کا ان کو انتظار تھا۔ وہ نمودار نہ ہوئی۔ اور جو نمودار ہوئی بھی انہوں نے اس کو صلیب پر چڑھا دیا۔ جس کام کے وہ کسی آنے والے سے متوقع تھے۔ وہ چند یورپی طاقتوں اور امریکہ نے ان کے لیے سرانجام دیا۔ عربوں سے ان کی سرسبز سرزمین کا ٹکڑہ ایسی بیرحمی سے چھین کر جس کے سیاستدان ہی مرتکب ہو سکتے ہیں۔ اسرائیل کا ناسور ان کے سینہ میں پیدا کر دیا۔

عیسائیت اب تک ان معموں کے حل میں مصروف ہے۔ جو یسوع ناصری کی پیدائش' زندگی، صلیب پر چڑھنے اور اس کے بعد کے واقعات سے متعلق ہیں۔ عیسائی صرف مسلمانوں کے ساتھ ہی نہیں لڑے۔ بلکہ وہ آپس میں ایسے لڑے جیسے جانی دشمن ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے ہیں اور

ان لڑائیوں میں انہوں نے ایسی سفاکی اور بیرحمی سے کام لیا۔ کہ یسوع ناصری کی روح یا جسم کو خواہ وہ قبر میں ہیں یا آسمان پر لرزا دیا ہوگا۔ عیسائیت نے خدا کو تین برابر کے حصّوں میں تقسیم کر ڈالا اور ایک شخصی خدا کا تصور دیا جو مافوق الفطرت ہے۔

اسلام نے اپنے سادہ اصول' ایمان اور قابلِ عمل ہدایات اور اپنی فوری کامیابی سے بنی نوع انسان کے تمام زندگی کے نظریوں کو بدل دیا۔ سب سے بڑا تصور جو اسلام نے بنی نوع انسان کو دیا۔ وہ توحید کا تصور تھا۔ یعنی ایک خدا پر ایمان لانا۔ جو کائنات اور بنی نوع انسان کا خالق اور پالنے والا ہے۔ اس ایمان نے ایک طرف تو انسان کو اپنی ناچیز ہستی سے آگاہ کیا۔ اور دوسری طرف اس کو رتبہ' مرتبہ' اپنی حیثیت سے آگاہی اور زندگی کا ایک صاف مقصد عطا کیا۔ ایمان کی اس نعمت نے انسان کے جوہر یعنی شجاعت' ایثار' ایک بڑی ہستی کی اطاعت اور اپنے آپ کو اس ہستی کے حوالے کرنا' موت سے بے پرواہی بلکہ اس کی خواہش' حق کے لیے لڑنا اور ظلم اور استبداد اور استحصال کی مخالفت جیسے اصول کی پابندی سکھائی۔ مذہبی رواداری' انسانی مساوات' ایسے اوصاف ہیں۔ جن کو اسلام سے پہلے کوئی نہیں جانتا تھا اور نہ ان کا احساس رکھتا تھا اور عمل اسکے برعکس تھا۔

قریباً ایک ہزار سال بعد ان تصورات کی گونج پہلے فرانس اور پھر امریکہ میں سُنی گئی۔ اور ان ہر دو جگہ یہ تصورات انقلاب اور خونریزی کے باعث بنے۔ اسلام کے پیروؤں میں خصوصی استحقاق' قومیت' نسل' رنگ اور علاقائی تصورات غیر متعلقہ سمجھے جانے لگے۔ قومیت کا احساس اور لسانی اور علاقائی اختلافات ماضی میں تلخی اور کش مکش کے باعث بنے تھے۔ اور تاریخ اپنے آپ کو دہرانے میں ذرا تامل نہ کرے گی۔ اگر یہ اختلافات' جو نفرت اور دشمنی کو جنم دیتے ہیں' خود مسلمانوں میں رونما ہوگئے۔ یہ بات غلط ہوگی۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسلام لسانی اور علاقائی تفرقات کا سرے سے نوٹس ہی نہیں لیتا یہ تفرقات عقیدہ' حقوق اور فرائض کے لحاظ سے غیر متعلقہ ہیں۔ مگر طبقاتی نقطۂ نگاہ سے مسلمانوں کے مختلف طبقوں کی شناخت میں مدد دیتے ہیں۔ اسلامی اصولوں کی سادگی اور ان پر ایمان رکھنے نے مسلمانوں کو تھوڑی ہی مدت میں دنیا کا صرف حاکم ہی نہ بنا دیا۔ بلکہ دنیا کو علم و فضل' اور تہذیب و تمدن کا ایک طویل دور عطا کیا۔ اور اگر ان نتائج پر قانون اور اس کی عملداری' اخوتِ اسلامی' اخلاقی اقدار اور پند و نصائح کے ساتھ ملا کر غور کیا جائے' تو اسلام صحیح طور پر تاریخ میں ایک انقلاب عظیم کہلایا جا سکتا ہے۔ غیر ملکی دانشور خواہ وہ اسلام کے ہمدرد ہوں یا اس سے بغض رکھتے ہوں' یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں۔ مثلاً مشہور مؤرخ (GIBBON) گبن رومی شہنشاہی کے زوال کے مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۹۴۹ پر اسلام کے طلوع ہونے کے متعلق لکھتے ہیں "ہماری آنکھیں ایک عجیب اور نادر انقلاب پر پڑتی ہیں۔ جس نے دنیا کی سب قوموں پر ایک نیا اور دائمی اثر چھوڑا"۔ ایچ۔جی ویلز (WELLS) جیسا متعصب مؤرخ بھی اپنی کتاب (OUTLINE OF HISTORY OF THE WORLD) میں تسلیم کرتا ہے "کہ

اُسلام کی کامیابی کا راز اس کے عقائد کی سادگی اور انسانی برابری کا احساس تھا۔ جو کہ اس نے بنی نوع انسان کی تاریخ کے خاص مرحلہ پر انسان کو دیا۔ جب کہ مساوات کا تصور غائب تھا۔ بلکہ غلامی اور بے حقوق رعیت اور سماجی گھٹیاپن کو انسانیت کے ایک بڑے حصّہ کا مقسوم سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے دنیا کو ایک بہترین سماجی اور اقتصادی نظام دیا۔ جو تاریخ کے اس مرحلہ پر انسانیت کو دیا جا سکتا تھا۔"

اور علامہ اقبالؒ اپنے چھ لیکچروں میں ایک مورّخ سے مندرجہ ذیل اقتباس دیتے ہیں۔

"یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ بڑی بڑی تہذیبیں جن کی تعمیر میں ۴۰۰۰ سال صرف ہوئے تھے۔ انتشار کے دہانے پر کھڑی تھیں۔ اور انسان اس وحشی پن اور جاہلیت کے زمانہ کی طرف لوٹنے کو تھا۔ جہاں ہر قبیلہ اور فرقہ دوسرے قبائل اور فرقوں سے برسرِ پیکار رہتا تھا۔ اور قانون اور نظام کا نام غائب تھا۔ سابقہ قبائل اپنی طاقت کھو چکے تھے۔ اس لیے پرانی شہنشاہی کے طریقوں کا عمل مسدود ہو چکا تھا۔ عیسائیت نے جو نئے قوانین وضع کیے تھے ان سے تفریق پیدا ہو رہی تھی۔ اور اتحاد اور نظام کی جگہ تباہی لے رہی تھی۔ یہ ایک ایسا وقت تھا کہ دنیا کسی بھی سانحہ سے دوچار ہو سکتی تھی۔ تہذیب ایک بڑے درخت کے پتوں کی طرح دنیا پر چھا چکی تھی۔ اور اس کی شاخیں فن اور سائنس اور ادب کا سنہری پھل دے چکی تھیں۔ یہ درخت اب ڈگمگا رہا تھا۔ کیونکہ اس کے تنے کو جوشِ عقیدت اور احترام کا رس پہنچنا بند ہو کر اس کی جڑیں سوکھنا شروع ہو چکی تھیں۔ جنگ کے طوفان نے اس درخت کو پھاڑ ڈالا تھا۔ اب یہ صرف قدیم رواج اور قانون کے سہارے سے کھڑا تھا۔ اس طرح یہ کسی وقت بھی ٹوٹ سکتا تھا۔ کیا کوئی ایسی جذباتی تہذیب اس کی جگہ لے سکتی تھی۔ جو انسان کو پھر متحد کر سکے اور تہذیب کو بچا سکے۔ یہ تہذیب کسی نئی قسم کی ہونی چاہیئے تھی۔ کیونکہ پرانے قاعدے اور رسوم مر چکے تھے اور ان کا احیاء صدیوں کا کام تھا۔"

اور جو انقلاب آیا۔ وہ اتنا بسیط تھا۔ کہ مشہور انگریز مصنّف کارلائل اپنی کتاب (HERO And HERO WORSHIP) میں لکھتا ہے۔ کہ گیٹے (GOETHE) مشہور جرمن شاعر نے ایک دفعہ کہا تھا۔ کہ اگر "اسلام اپنے آپ کو اللہ کی مرضی کے تابع رکھنے کا نام ہے۔ تو کیا ہم سب اسلام میں نہیں رہتے۔"

عیسائیت کو دنیا نئی تاویل کے بغیر قبول نہیں کر سکتی تھی۔ مگر اسلام جس میں کوئی پیچیدہ اصول نہیں ہے، جو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے، ہر ایک معاشرے پر لاگو ہو سکتا ہے اور اسے بطورِ ضابطۂ حیات بغیر کسی خطرے کے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ افریقہ کے حبشی اور امریکہ کے سیاہ فام اسلام کی طرف کیوں راغب نظر آتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ وہ محسوس کرتے ہیں۔ کہ دوسرے نظاموں

میں کوئی کمی، پیچیدگی بلکہ انسانیت کے منافی عقیدے اور رسوم ہیں۔ جب کہ اسلام ان پیچیدہ مسئلوں اور بے انصافیوں سے مبرا ہے اور ان کو ایسا درجہ عطا کرتا ہے جو ہر انسان کا قدرتی حق ہے۔ اور نسلی امتیاز اور دیگر تفرقات سے آزاد ہے۔ اسی وجہ سے اسلام ہندوستان میں بہت جلد اور وسیع پیمانے پر قبول ہوا۔ غیر مسلموں پر کسی قسم کا اکراہ وجبر تبدیلیٔ مذہب میں نہیں برتا گیا اور نہ ہی ان کو کسی قسم کی تحریص دی گئی۔ ہندوستان کے اصل باشندوں بلکہ ہندوؤں کے ہی ایک طبقہ کو اونچ ذات کے (اودجنما) ہندو گھٹیا قسم کے انسان سمجھتے تھے۔ جن کی چھو ان کو ناپاک بنادیتی تھی یہ صرف انسانیت کی توہین نہیں تھی۔ بلکہ ان کے پیدا کرنے والے پر تحقیر و توہین کا الزام۔ اور کوئی خوددار انسان، اگر اس کو اس بات کا اختیار ہو، ایسے نظام کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔ ہندوؤں کے کسی بھی مذہبی نظام اور وحی پر مبنی مذاہب میں کوئی مماثلت نہیں پائی جاتی۔ اس نظام کے مطابق جس کا بانی منو ہے۔ ہندو چار طبقوں میں تقسیم کیے گیے ہیں۔ اور اس کے وضع کیے ہوئے قوانین انسان کی برادری اور برابری کے اصول کی بے حرمتی ہیں۔ اگر ان کے کسی فرقہ میں کسی ارفع ہستی کا تصور پایا جاتا ہے۔ تو وہ اس تصور سے بالکل مختلف ہے جو سامی مذاہب کا ہے۔ کیونکہ ہندوؤں کے مطابق تخلیق اور اتلاف کا کام دیوی مالا کی دو مختلف ہستیوں کے سپرد ہے۔ اور پروہت اور بت پرستی عام ہندوؤں کا ایک نمایاں پہلو ہے۔

بدھ نے کائنات کی تخلیق اور اتلاف کے مضمون کو چھوا تک نہیں۔ اور وہ کسی ارفع ہستی کا بھی قائل نہیں تھا۔ اس کے مطابق انسانی زندگی دُکھ درد کا ایک سلسلہ تھا۔ جو کہ صرف نروان حاصل کرنے سے ختم ہو سکتا ہے۔ نروان ایک ایسی حالت کا نام تھا۔ جہاں سب خواہشیں اور جذبات ختم ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کا بھی احساس نہیں رہتا۔ بدھ مت رہبانیت کا بھی قائل ہے۔ جو کہ دنیا کو ترک کر کے کسی خانقاہ میں زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے۔ آج کل خود بدھ کے مجسمے قابل پرستش سمجھے جاتے ہیں اور یہ ہندوؤں کی بت پرستی سے مختلف رسم نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ بدھ کے خیالات ہندوؤں کے مظالم اور ذات پات کی بے انصافی کا ردعمل تھے۔ اور نروان حاصل کرنے کے جو طریقے اس نے بتائے ہیں اس میں کرما (اخلاق) اور نیک کاموں پر بہت زور دیا ہے۔ مگر یہ تو قریباً تمام مذاہب کا خاصا ہے۔

قدیم مصریوں کو موت کے بعد کی زندگی کا ہمیشہ ڈر لگا رہتا تھا۔ اور ایک ارفع ہستی پر یقین رکھنے کی بجائے جو اس کی زندگی اور ماحول پر قابو رکھے۔ ان کے بادشاہ (فراعنہ) خود اپنے آپ کو دیوتا بنا کر پرستش کے طلب گار ہوتے تھے۔ اس سے پہلے وہ پتھر کے بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ جو مختلف شکل کے مندروں میں نصب کیے ہوتے تھے۔ اور جن کا انتظام پروہتوں کے ہاتھ میں تھا۔ انسانی برابری کا تصور ان کے ذہنوں سے بہت دور تھا۔ ادھر انہوں نے توجہ ہی نہیں دی تھی۔

قدیم رومہ کی تہذیب کی بنیاد ہی عدم مساوات پر تھی۔ غلام شہری نہیں تھے اور نہ ہی وہ لوگ جو باہر سے آکر رومہ میں آباد ہوئے تھے۔ اہل رومہ بھی دیوتاؤں، پیش گوئی کرنے والوں اور فال نکالنے والوں پر یقین رکھتے تھے۔

اسی طرح قدیم یونانیوں کے بہت سے بت اور فال نکالنے والے تھے۔ ان کے فلسفہ میں کسی ارفع ہستی یا موت کے بعد زندگی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ سقراط کو آنے والی زندگی اور کلی اتلاف کے کے ہونے کا صرف شبہ ہوا برادری اور مساوات کا تصور ان کے لیے ایک اجنبی خیال تھا۔ صرف افلاطون روح کو جسم سے علیحدہ کر کے لافانی ہونے کا درجہ دیتا تھا۔

بڑے چینی عاقل نے اپنے آپ کو چھوٹی چھوٹی دنیوی باتوں میں ہدایت دینے میں مصروف رکھا مثلاً لباس، خوراک، قبروں کی شکل، وغیرہ کے متعلق ہدایات دراصل وہ آباو اجداد کا پرستار تھا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا۔ کہ اخلاق کی تعریف اور حدود زمانہ ماضی کے دانشمندوں نے مقرر کر دی ہیں۔ جس میں ترمیم اور اصلاح کی ضرورت نہیں اور آنے والی نسلوں کا فرض ہے کہ وہ ان اخلاق کے پابند رہیں

زرتشت کا ارفع ہستی کا تصور کچھ حد تک اسلام کے اللہ کے تصور سے ملتا جلتا ہے۔ مگر اس نے اس ہستی کو دو حصوں میں بانٹ ڈالا۔ ایک تخلیقی اور دوسرا تخریبی۔ اس طرح اس کے نزدیک خدا (اہورہ) اور شیطان (رہرمن)، ایک ہی ہستی کے دو رخ ہیں۔ زرتشت کی اخلاقی ہدایات بھی ایک اعلیٰ درجہ رکھتی ہیں۔ کیونکہ وہ برائی کے سخت خلاف تھا۔ اس کا قول تھا۔ کہ نہ بدی کا کوئی کام کرو۔ نہ بدی کا خیال کرو۔ اور نہ ہی کسی کی بدی سنو۔

مذاہب کے اس مقابلہ سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے۔ کہ تمام روحانی پیشواؤں نے، خواہ ان کا مذہب وحی پر مبنی ہو یا نہ، نیک اعمال پر زور دیا ہے۔ اور ان کے تصورات اور دیگر مذاہب میں میں بہت سی اخلاقی اقدار مشترک ہیں۔ اسلامی اخلاقیات میں خصوصیت یہ ہے۔ کہ اسلام نے نیک اور برے افعال کی تخصیص اور توسیع کی ہے۔ اگرچہ عام برائی کی مذمت اور نیک اعمال کی تعریف اس میں بھی پائی جاتی ہے۔

اسلام نے اپنے بنیادی تصورِ توحید سے مسلمان کو جہاں عجز و انکساری اور تکبر اور غرور سے اجتناب کرنا سکھایا وہاں ان کے دلوں سے موت کا ڈر نکال کر ان کو شجاعت، بے خوفی اور ایثار جیسے جوہر عطا کیے۔ زندگی کے مقصد کا ایک صاف تصور دیا۔ اور ایک ایسی تہذیب سے روشناس کیا۔ جو ازمنۂ وسطےٰ میں صدیوں عالمگیر تہذیب رہی اور جس کا موجودہ علوم و تہذیب کے آغاز سے گہرا تعلق ہے۔

****

باب ۱۱
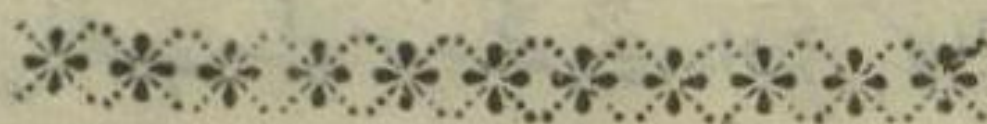
اِسلام اور دہریّت و لاادریّت کا تحلیل

جب سے کرۂ ارض پر انسان کا ورود ہوا ہے وہ کسی نہ کسی مذہب کا پیرو رہا ہے خواہ وہ مذہب کتنا ہی نامکمل اور توہم پر مبنی ہو۔ مگر یہ کہنا بھی درست ہے کہ دُنیا میں شروع سے ہی وقتاً فوقتاً ایسے مُنکر بھی پیدا ہوتے رہے جنہوں نے مذہب کے تصوّر کو مسترد کیا اور خدا کی ہستی، آخرت کی زندگی اور روح کی ہستی سے انکار کیا۔ جب بڑے بڑے مذاہب نے پُرزور طریقہ سے ایک ارفع ہستی کا تصوّر پیش کیا اور سائنسی تحقیق کے نتائج کا عیسائیت کے ایک بنیادی عقیدے کے ساتھ تصادم ہُوا تو انسان غیر مذہبی یا مذہب کے خلاف خیالات سے متاثر ہونے لگا۔ اگرچہ ان خیالات نے یورپ میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں زیادہ قوت پکڑی تاہم موجودہ صدی میں بھی یہ خیالات انسانی دماغ کو متاثر کر رہے ہیں۔ اس سے یہ فرض نہیں کر لینا چاہیئے کہ قدیم تہذیبوں میں ان خیالات کا وجود نہیں پایا جاتا تھا۔ چند یونانی فلسفی مذہب کے تصوّر کے خلاف تھے اور یونانی فلسفہ کے بانی (باپ) سقراط نے، جب اس کو اپنے خیالات کی وجہ سے بطور سزا زہر کا پیالہ پینا پڑا، مرنے سے چند لمحہ پہلے اس خیال کا اظہار کیا کہ وہ نہیں جانتا کہ آیا وہ دوسری زندگی میں داخل ہو رہا ہے یا دائمی نیند اور بے خبری کی حالت میں منتقل ہو رہا ہے۔ روم کے فلسفی لوکریشیس، (LUCRETIUS) نے حقیقت کی دُنیا سے کسی خدا یا کسی پنہاں عالم کے تصوّر کو اپنے فلسفہ سے خارج رکھا۔ ہندوستان کا بدھ، جس کی تعلیمات نے بہت سے ملکوں کو متاثر کیا اور جس کے خیالات اُس کے مرنے کے ہزارہا سال بعد اب بھی کئی ممالک میں مقبول ہیں، خدا پر ایمان نہیں رکھتا تھا اور نہ موت کے بعد کسی دائمی جسمانی یا روحانی زندگی پر یقین رکھتا تھا۔

وہ کرما، عارضی تناسخ اور نروان کے نظریے کا معتقد تھا۔ جین مذہب کے بانی مہاویرا نے خدا کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ اسی طرح چین کے عارف کنفوشیس کا عقیدہ غیر مذہبی عقیدہ تھا۔ یورپ میں اکثر طبقے اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کو خیر باد کہہ چکے ہیں۔ اس طرح سماجی اور

فکری قوتوں نے مل کر ایک عملی دہریت کو جنم دیا ہے۔

دہریت کے تخیّل میں تین منزلیں ہیں :-

۱- انگریزی زبان بولنے والے ممالک میں اٹھارہویں صدی کے شکوک کو ۱۹ویں صدی کے مذہبی مباحث اور جھگڑوں نے زور سے اُبھارا۔

۲- جرمن دہریت کی تشکیل جو کہ ، فیور بک (FEUERBACH) مارکس (MARX) اور نیٹشے (NITZSCHEE) کی تصانیف میں ملتی ہے۔

۳- دہریت کی ایک نئی قسم جو جنگِ عظیم دوم کے بعد فرانس میں پیدا ہوئی جس کا فلسفہ یہ ہے :-

"کہ انسان انفرادی طور پر ایک بے مقصد دُنیا میں رہتا ہے اور اس کو اپنی آزاد قوت ارادی سے اپنے ماحول پر قابو پاکر دُنیا کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا ہے۔"

یہ منازل جرمن کے فلسفی ہیگل (HEGEL) کے تخیل کا ردِّ عمل ہیں جس کا فلسفہ ایک وقت تمام یورپ پر حاوی ہو چکا تھا۔

مذہب کے حق میں جو دلائل دیئے جا سکتے ہیں وہ یہ ہیں :- انسان خواہ وہ حیثیت کی کسی منزل میں ہو اپنی زندگی سے محبت کرتا رہا ہے۔ کیونکہ زندگی اس کو خوش گوار احساسات مہیا کرتی ہے اس لیے وہ یقین نہیں کر سکتا کہ زندگی کے احساسات موت پر ختم ہو جاتے ہیں اس لیے مرنے کے بعد بھی وہ ان احساسات کے جاری رہنے کا خواہشمند رہا ہے۔ یہ خواہش اس کو ایک عمیق تخیل کی طرف لے گئی۔ جس کا مقصد انسان کو ایک خالق کے نظریے سے روشناس کرنا تھا۔ لافانی روح ، آخرت کی زندگی ، اپنے اعمال کا حساب کسی ارفع ہستی کو دے کر سزا یا جزا کا مستحق ہونا۔ اسی تخیل کا ایک ضمن ہیں۔ اس عقیدے نے یہ ناممکن سمجھا کہ انسان کا بھی مرنے کے بعد وہی حشر ہوتا ہے جو دوسری غیر انسانی مخلوق کا۔ یہ دلیلِ خیالات نہیں کہلائے جا سکتے۔ یہ صرف انسان کی موجودہ زندگی میں آئندہ زندگی کی محض خواہشات ہیں اور اسی وجہ سے خدا کے منکر مفکّرین کہتے ہیں کہ مذہب خوف اور اُمید پر مبنی ہے۔

سامی انبیاء نے ایک ارفع ہستی کے وجود کا تصور ، ایسی ہستی جس نے کائنات کو پیدا کیا ، وحی سے لیا۔ مگر سوائے اسلام کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے کسی نے مفصّل دلیل اس ہستی کے وجود کی نہیں دی ۔ اسلام میں نہ کوئی کلیسا ہے اور نہ کوئی پادری ۔ مگر کلیسا کے پادریوں نے اُسی عقیدے کے مطابق ، جو غلط یا صحیح طور پر وہ بائبل سے اخذ کرتے تھے ، اپنے پیروؤں کے دماغ اور تخیّل کو اپنے تابع رکھنے کی کوشش کی اور یورپ میں جب احیاء العلوم اور فن کی تحریک شروع ہوئی اور اس تحریک نے انسانی دماغ اور تخیّل کو آزادی بخشی اور اس آزادی

کی وجہ سے سائنس نے مختلف علوم میں تیزی سے ترقی کرنی شروع کی اور مدرت کے اسرار جواب تک نہاں تھے آشکار ہونے شروع ہوئے تو سائنس کا عیسائیت کے چند عقیدوں کے ساتھ تصادم ہوا۔ اور یہاں سے ایک طرف دماغ اور عقل اور دوسری طرف غیر مدلّل عیسائیت کے عقیدوں میں کش مکش شروع ہوئی۔ اس واسطے موجودہ جدوجہد ایک عقلی جدوجہد ہے، پاکستان میں ہم اس کشمکش سے دور ہیں۔ مگر آمدورفت کے ذرائع نے دُنیا کو سکیڑ کر بہت چھوٹا بنا دیا ہے اور نئے خیالات اس تیزی سے سفر کرتے ہیں کہ خواہ ہم کتنا ہی اس بحث سے بچنا چاہیں، اگر ہم معقول افراد کی قوم ہیں، ہم کو اس تنازعہ میں زود یا بدیر شریک ہونا پڑے گا۔ جس تنازعہ کا لب لباب ایک ارفع ہستی کا یعنی خالق عالم کا وجود ہے۔ مذاہب اور دہریانہ نظریئے کی تصنیفات پر آپ کتنی ہی پابندیاں عائد کر دیں۔ ہم اس مسئلے میں اُلجھے بغیر نہیں رہ سکتے اور یہ بحث اتنی وسیع اور ادق ہے اور اس میں فلسفیانہ اور سائنسی خیالات اس طرح داخل ہو چکے ہیں کہ اس چھوٹی سی کتاب میں ان پر مفصّل بحث کرنا ناممکن ہے کیونکہ بہت سے قارئین کے لیے یہ فلسفی تدلّل اور تخیّل ناقابلِ فہم ہوگا تاہم اس مسئلہ پر موٹی موٹی باتیں بتانی ضروری ہیں۔

مسئلہ تخلیق

اگرچہ اس مسئلہ کو ہم بائبل اور قرآن کے نظریۂ تخلیق یا ابن مسکویہ یا مولانا روم کے ارتقائی تصوّر سے شروع کر سکتے ہیں اور مغرب کے مختلف سائنس دانوں کی دریافتوں سے گزرتے ہوئے ان نتائج تک پہنچ سکتے ہیں، جو حال ہی میں ان ہوابازوں نے دریافت کئے جو چاند پر پہنچے۔ اور جنھوں نے سیاروں کے راز بذریعہ ان راکٹوں کے جو چاند پر اترے اور مشتری اور مریخ کے گرد گھوم کر اور زہرہ پر ایک سائنسی آلہ اتار کر ان سیاروں کی تصویریں زمین پر بھیجیں، بہتر ہوگا کہ ہم موجودہ دہریت اور لاادریت کے تخیّل کے آغاز کا ذکر کریں۔ پیشتر اس کے کہ ہم الہامی مذاہب خاص طور پر اسلام کا نظریہ بیان کریں۔ اس سلسلہ میں جو مشہور نام آتے ہیں وہ فیور بک ۱۸۸۳ - ۱۸ ، مارکس، نیٹشے، جان ڈیوای ۱۹۵۲ - ۱۸۵۹ ، ہیوم ۱۸۵۵ - ۱۷۷۱ اور کرک گارڈ کے ہیں۔ یہ عموماً سب مغربی مفکّر ہیں، مگر ان میں زیادہ تر جرمن نژاد ہیں اور یہ تمام ایک زبردست الحاد کی مہم چلانے والے ہیں۔

آغاز ہم نے (HEGEL) سے کرنا ہے جس کا فلسفہ نہایت باریک تخیّل پر مبنی ہے اِس کے اور اُس کے پیشرو کانٹ (KANT) کے مطابق علم حاصل کرنے کے لیے صرف تجربہ ہی ضروری نہیں بلکہ فلسفہ کے ان شعبوں کے مطالعہ کی بھی ضرورت ہے جو بذریعہ عقل

تجربہ کی تعبیر کرتے ہیں۔ کانٹ سے اختلاف رکھتے ہوئے ہیگل کا یہ خیال تھا کہ ظاہرہ چیزیں، بذاتِ خود دراصل تجربہ نہیں۔ وہ عقل یا ذہن کی تخلیق ہیں۔ انفرادی عقل سے وہ عقل مطلق تک پہنچتا ہے جو انفرادی عقل سے مختلف ہے مگر انفرادی عقل کا مجموعہ ہے۔ اس لیے حقیقت دراصل جسمانی نہیں روحانی ہے۔ اس کا دوسرا تخیل وہ تھا جس کو علم منطق کہتے ہیں۔ اور جس کے مطابق عقل اور فطرت ایک ہی طریقہ پر عمل کرتی ہیں۔ اس لیے اُس نے منطق کو فطرت اور تاریخ کے عمل پر حاوی کیا۔

یہ فلسفہ سمجھنا بڑا مشکل ہے کیونکہ اُردو میں اس کے اصطلاحی الفاظ کے مترادفات نہیں مل سکتے۔ صرف یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ اس نے اپنے طریقۂ استدلال سے عقلِ مطلق کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی اور یہ عقلِ مطلق ایک ارفع ہستی کے مترادف ہے۔

فیوربک (FEUERBACH) ہیگل کے نظریئے کو مسترد کرتا ہے اور وہ یہ دلیل دیتا ہے کہ ہیگل کے نظریہ کے مطابق ہر چیز روحانی بن جاتی ہے۔ اور اس کا عقل مطلق کا تصور بھیس میں چھپا ہوا علم الٰہیت یعنی مذہبیت ہے۔ کیونکہ خدا اور فطرت کو پوری روح کے حصے بنا کر وہ خدا اور حقیقت کو انسانی تخیل کے دائرے میں لے آتا ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا انسانیت کے تصور میں آجاتا ہے اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ خدا اور عقلِ مطلق اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانی خواہشات اور خیالات کو اُبھارا جائے۔ اس طرح مذہب کا آخری مُدعا خود انسان بن جاتا ہے۔ جو اپنی فطرت کو ایک ایسی چیز سمجھتا ہے جو بیشتر اس کے کہ انسان اس کو اپنا اندرونی جزو بنالے وہ انسان کے باہر ہی رہتی ہے۔ اس طرح سے مذہبیت کا ماحصل اپنے آپ سے آگاہی حاصل کرنا رہ جاتا ہے۔ اس کو حاصل کرتے ہوئے انسان قدیم مذہب کے غلط تصور کو اور ہیگل کے علم بعدازطبیعیات کو ایک طرف پھینک دیتا ہے۔

اس متنازعہ مسئلہ میں مارکس (MARX) کی بالکل علیٰحدہ شخصیت ہے اس کی دہریت اقتصادی قوتوں کا تقاضا ہے اور یہ قوتیں صنعتی انقلاب کی پیدا کردہ ہیں۔ اسی انقلاب کا پیدا کردہ مزدور طبقہ ہے جس کا سرمایہ دار بے رحمانہ اور انسانی التفات کو نظر انداز کرتے ہوئے متواتر استحصال کر رہا ہے۔ سرمایہ داری کے نظام میں کوئی قدم یا اصول جس کا مقصد مزدور کو مطمئن کرنا ہو اس کی مصیبت میں ذرا بھی کمی نہیں کر سکتا۔ اس ملحد کا ایک فقرہ تاریخ میں ابدی شہرت پا چکا ہے اور وہ یہ ہے: کہ:—

"مذہب ایک افیون جیسی نشہ آور چیز ہے"

جہاں تک خدا کی ہستی کے خلاف ثبوت کا تعلق ہے وہ یہ بات کہہ کر اپنی دلیل ختم

کہ دیتا ہے کہ یہ ثبوت تو فیور بک مکمل طور پر دے چکا ہے۔ اس مسئلہ پر سوچ بچار کے لیے اس نے نہ تو کوئی توجہ دی اور نہ ہی کوئی وقت۔ صرف اس بات پر اس نے اکتفا کیا ہے کہ فیور بک نے ثابت کر دیا ہے کہ خدا کا تصوّر انسان کے شعور میں ایک اجنبی چیز ہے اور انسانی فطرت کو آسمان تک لے جانے کی سعی بے سود ہے۔ اس اجنبیت کے اسباب سماجی ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنا اصلی نقطہ پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ فلسفیوں نے دنیا کی مختلف طریقوں سے توضیح کی ہے جبکہ اصلی مقصد یہ ہونا چاہئیے کہ دُنیا کے نظام کو بدلا جائے۔ اس نے الزام لگایا کہ سرمایہ داری نظام میں مزدور کا استحصال یعنی مزدور کو جلب منفعت کے لیے استعمال کرنا جاری رہے گا۔ کیونکہ سرمایہ دار کا مدعا مزدور کے ذریعے روپیہ حاصل کرنا ہے اور جب مزدور کا بوجھ ناقابل برداشت ہو جائے گا تو ایک ایسا عوامی انقلاب آئے گا جو اس نظام کو ختم کر دے گا۔ اور ایک نیا معاشرہ اس کی جگہ لے گا۔ جس کا مستقبل شاندار ہو گا۔ اور دُنیا میں ایک نئی زندگی وجود میں آئے گی جس میں لوگ اپنی قابلیّت کا پورا استعمال کریں گے۔ وہ کسی خاص حرفت کے ساتھ نہ بندھے ہوں گے۔ بلکہ ان کو آزادی ہو گی کہ جس کام کے وہ قابل ہیں اس میں پوری مہارت حاصل کریں۔ اس قسم کے معاشرے سے نا اتفاقیاں اور برائیاں غائب ہو جائیں گی۔ کیونکہ یہ دونوں سماجی ماحول کی پیدا کردہ ہیں۔ اگر معاشرہ اچھا ہے تو اس میں انسان بھی اچھا رہے گا۔ یہ ایک شریفانہ خیال تھا جس میں صاف طور پر مذہب کا رنگ نظر آتا تھا۔ کیونکہ یہ خیالات حضرت عیسےٰ کے دوبارہ آنے اور عہدِ سعادت اور مثالی معاشرہ قائم ہونے کی خوشخبری دینے کے مترادف تھے۔ جو معاشرہ مارکس کی نظر میں تھا وہ جزوی طور پر اسلام سے متصادم نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ اِس مُنکر نے خدا کے تصوّر کو معاشرے کی تعمیر سے خارج کر دیا تھا۔

خدا کی ہستی، یا یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ مذہب کے خلاف اس کی دلیل ایک غیر ضروری اور ضمنی اظہار تھا جو اس کے دلائل سے آسانی سے علیحدہ کیا جا سکتا تھا۔ اشتراکی فلسفہ میں کوئی ایسی دلیل نہیں جس سے خدا کے تصوّر کو اشتراکی نظام سے علیحدہ کر دیا جائے۔ یہ اور بات ہے کہ اشتراکی دستور میں خدا پر ایمان نہ رکھنے کی کوئی شرط ہو۔ مارکس کے فلسفہ میں مذہب کے خلاف اس کا مشہور تاریخی فقرہ بطور ایک جملہ معترضہ تھا۔ جو معاشرہ مارکس کے ذہن میں تھا، وہ روس، چین اور کئی ایک مشرقی یورپ کے ممالک میں قائم ہوا۔ ایشیا میں بھی ایسے معاشرہ کے کچھ آثار ہیں۔ جو کچھ اشتراکی معاشرہ قائم کرنے میں پیش آیا وہ تاریخ کا ایک علیحدہ باب ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے انقلاب لانے میں حصّہ لیا انسانی دکھ درد سے بے پرواہ اور نا آشنا تھے۔ قدیم آزمائش شدہ اور پسندیدہ اقدار کا منہدم کرنا ان کا مدعا تھا۔ آیا نئی اقدار جو اس نئے معاشرہ

ہیں پیدا ہوئیں ۔ سابقہ اقدار سے بہتر تھیں یا نہیں اپنی اپنی سوچ پر منحصر ہے ۔ اس معاشرے میں جرائم میں کمی ہوئی یا نہیں اس سوال کا جواب کوئی نہیں دے سکتا ۔ مگر ایک بات ظاہر ہے کہ یہ معاشرہ آزادئ خیال کو برداشت نہیں کر سکتا ۔ اگر اس خیال سے معاشرے کی بنیاد پر چوٹ پڑتی ہے یہ قیمت ہے جو اس معاشرے کے مشکوک مادی فوائد کے لیے اس معاشرے کے افراد کو ادا کرنی پڑتی ہو ۔

انقلاب کے بعد جس پارٹی نے روس میں عنانِ اختیار سنبھالی ۔ اس کے لیے غیر روحانی نظام کی زمین پہلے سے تیار ہو چکی تھی ۔ عیسائیت روس میں اپنی ہر دل عزیزی کھو بیٹھی تھی ۔ کیونکہ یہ صرف چند رسوم کی ادائیگی کے معنی لے چکی تھی ۔ یہاں تک کہ جو لوگ صلیب کی علامت بنانے کے لیے مروجہ تین انگلیوں کی جگہ دو استعمال کرتے تھے ان کو سزا دی جاتی تھی اتنی سخت سزا کہ ان کا ایک طبقہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گیا ۔ اور لاکھوں کی تعداد میں صعوبتیں برداشت کرنے والے یہ لوگ پہلے منچوریا پہنچے اور وہاں سے ہانگ کانگ ، ہانگ کانگ سے برازیل ، برازیل سے اوریگون (OREGON) اور وہاں سے الاسکا ۔ جہاں وہ برفوں میں آج کل زندگی گزار رہے ہیں ۔ گرجا گھر بد اخلاقی کے اڈے بن چکے تھے جس کے نتیجے پر لوگ خدا سے ہی منکر ہو بیٹھے تھے ۔ وہ لوگ جواز یہ پیش کرتے تھے کہ اگر خدا کا مذہب یہ ہے تو ہم ایسے خدا کو خیرباد کہتے ہیں ۔

اشتراکی روس میں نہ ہی مذہب اور نہ ہی کلیسا خلاف قانون ہے اگرچہ ہر دو کی ہی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے لاکھوں مسلمان روس میں آباد ہیں ۔ چین میں روس سے بھی زیادہ مسلمان آباد ہیں ۔ یوگوسلاویہ میں بھی کافی تعداد مسلمانوں کی ہے ۔ اور ان کی مسجدیں بھی قائم ہیں جیسے خلافت عثمانیہ کے عہد میں تھیں ۔ تاہم ان سب ممالک میں مذہب اور اس کے پیرو مشکوک نظر سے دیکھے جاتے ہیں ۔ نیٹشے (NIETZCHE) دہریہ فلاسفروں میں تخیل اور عبارت کے لحاظ سے سب سے جارح مفکر ہے ۔ وہ اپنی زندگی میں نبی کہلایا ۔ مگر اس کی موت دیوانگی کی حالت میں ہوئی ۔

وہ کہتا ہے " خدا مر چکا ہے کیونکہ لامحدودیت کا تصور انسانی ذہن کی تخلیق ہے " ۔ ایک دوسری جگہ وہ خدا کے متعلق یہ الفاظ استعمال کرتا ہے " خدا کا تصور زندگی ، قدرت اور زندگی کی خواہشات کے خلاف اعلانِ جنگ ہے ۔ یہ ایک خیال ہے اس دُنیا کو بدنام کرنے کے لیے ، آخرت کے متعلق ہر جھوٹ بولنے کے لیے ۔ خدا ایک معدوم چیز کو دیوتا بنانے اور اس معدوم چیز کا نام لے کر اسی کو پارسائی کا درجہ دینے کا نام ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس نے حدِ اعتدال سے نکل کر یہ رنجیدہ الفاظ عیسائیت کو رد کرنے اور یسوع ناصری کا جس نے انسانی محبت اور عجز و حلم کی تعلیم

دی تھی، مضحکہ اڑانے کے لیے استعمال کئے۔ ان سب تصورات کو رد کرنے کے بعد اس نے ایک ارفع انسان کا تصور دیا۔ جو طاقت، شان و شوکت اور غلبہ حاصل کرنے کی خواہش کا مجسمہ ہو۔ نیٹشے عیسائیت سے اتنا متنفر کیوں ہوا؟ اس کے بہت سے اسباب تھے۔ مثلاً عیسائیوں کے فرقوں میں نااتفاقی اور کشمکش، پادریوں کی عدالتیں، اور ان کی زیادتیاں اور سیاسی قدامت پسندی کیونکہ کلیسا کی یہ متواتر پالیسی رہی تھی کہ وہ پرانے نظام کی حلیف اور مددگار رہے، ہر قسم کی اصلاح اور تبدیلی کی مخالفت کرے، رہبانیت کا پرچار کرے، اس صریح ظلم سے جو غریبوں پر ہوتا تھا بے پرواہ رہے، اور انسانی سرگرمیوں پر پابندی و قیود عائد کرے جو اظہارِ خیال کے راستے میں رکاوٹ ہوں۔

صنعتی نظام نے جو معاشرے میں بے ترتیبی پیدا کر دی تھی اس نے مزدوروں اور کاریگروں کو عیسائیت سے متنفر کر دیا تھا۔ حکومت کی مطلق العنانی کو کلیسا نے مزید قوت پہنچائی تھی۔ نیٹشے کی دہریت صرف قدامت پسند عیسائیت کی تعلیم سے بے زاری اور عیسائیت کے اخلاق کو خداداد سمجھ کر ان کو جمود کی صورت دینے کی وجہ سے ہی نہ تھی بلکہ اس کے کچھ سماجی اسباب بھی تھے۔ جن کو مروجہ صنعت کاری کے نظام نے پیدا کیا تھا۔ نیٹشے کی دہریت کے ثبوت میں کوئی منطقی دلیل یا طبیعات پر مبنی دلیل نہیں پائی جاتی اور اس کا ارفع انسان نازیوں کی شکل میں نمودار ہوا۔ جس کو انسانی ضمیر نے مسترد کر کے ایک بین الاقوامی عدالت کے حکم کے ماتحت پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

ہیوم (HUME) ایک سکاٹ لینڈ کا فلاسفر تھا جس کی دہریت کا عقیدہ فیور بک سے مختلف تھا۔ اس مضمون پر اُس نے دو کتابیں لکھیں۔ پہلی کتاب کا نام فطری مذہب کے متعلق مکالمہ (DIALOGUE CONCERING NATUROL RELIGIN) اور دوسری کا نام معجزات پر جواب مضمون ہے (ESSAYS ON MIRACLES)۔ پہلی کتاب میں اس نے اس عام دلیل پر جو ترکیب نظامِ عالم پر مبنی ہے بحث کی ہے۔ اس عام دلیل کو مفصل طور پر اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ جو ترتیب اور تدبیر قدرت کے نظام میں پائی جاتی ہے وہ ایک ارفع معمار کائنات کے وجود پر دلالت کرتی ہے۔ اس دلیل میں جو خامیاں اور غلط مفروضے پائے جاتے ہیں۔ ان کی اس کتاب میں نشان دہی کی گئی ہے۔ دوسری کتاب میں اس نے ان معجزوں کو رد کیا ہے۔ جو حضرت عیسٰے علیہ السّلام سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ مثلاً حضرت عیسٰے علیہ السلام کا پانچ ہزار آدمیوں کو کھانا کھلانا، مُردوں کو زندہ کرنا، پانی کو شراب میں تبدیل کرنا وغیرہ۔ اس نے ان معجزات سے یہ نتیجہ نکالنے پر کہ یہ افعال وہی ہستی کر سکتی ہے جو غیب دان ہو اور

جس کو ایسا کرنے کی قوت حاصل ہو پر بھی نکتہ چینی کی ہے اور کہا ہے کہ ایسے معجزات کی کوئی بھی تاریخی شہادت نہیں اور یہ باتیں قانون فطرت کے خلاف ہیں اس لیے ان کو اور جو نتیجہ ان سے اخذ کیا جاتا ہے اس کو مسترد کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ایسی کراماتیں کسی نئے مذہب کے پیرو جوش میں آکر ایجاد کر دیتے ہیں۔ ہیوم (HUME) کے شکوک اس فلسفے کا نتیجہ ہیں جس کے مطابق تمام علم و ادراک اور احساسات سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ بات سائنسی طریقے سے مطابقت رکھتی ہے اور اس علم کے متعلق دلیل میں خدا کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ خدا کو دیکھا یا محسوس نہیں کیا جا سکتا۔

مگر سب سے مضبوط دلیل عیسائیت کے بنیادی اصول کے خلاف ڈاروِن (DARWIN) کا نظریہ ارتقاء تھا۔ جس کی تفصیل اور صراحت اس کی کتاب آغاز انواع (ORIGIN OF SPECIES) میں ملتی ہے۔ کیونکہ یہ نظریہ تخلیق کے اس بیان سے جو بائبل میں آتا ہے متضاد ہے اور مزید جغرافیائی تحقیق نے اس بیان کو غلط ثابت کر دیا ہے کہ دنیا ۴۰۰۰ قبل مسیح پیدا ہوئی۔ اس لیے ڈاروِن کے سمجھنے والوں میں شکوک کا پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ اگر ڈاروِن کی تحقیقات کا نتیجہ درست تھا تو پھر بائبل کے ایک اور بیان کا کہ خدا نے انسان کو فرشتوں سے ذرا کم درجہ پہ پیدا کیا اس نظریہ سے ملاپ نہیں کیا جا سکتا کہ انسان بندر سے صرف ایک درجہ اُونچا ہے۔ مغرب کو ڈاروِن کے تخلیق انسانی کے نظریے نے بڑا متاثر کیا ہے۔ اس نے نہ صرف دانشوروں کو عیسائیت سے علیحدہ کر دیا بلکہ کچھ پادریوں کو مجبور کر دیا کہ بائبل کے تخلیق کے مسئلہ کی وہ مختلف تفسیر کریں۔ اس مرحلہ پر یہ بتانا ضروری ہے کہ اپنی کتاب نزول انسان (DESCENT OF MAN) میں ڈاروِن خود رقمطراز ہے "انسانی عقل اس نتیجہ سے بغاوت کرتی ہے کہ واقعات کا یہ عظیم سلسلہ ایک اتفاقیہ حادثہ تھا"۔ یہ الفاظ ڈاروِن کے دوست اور دشمن دونوں کی نظر سے اوجھل ہیں۔

سر برٹلینڈ (SIR BERTLAND RUSSEL) کی ایک دلیل لاادریت کے ثبوت میں ہم اُوپر بیان کر چکے ہیں۔ قاری کی یاد تازہ کرنے کے لیے وہ دلیل مختصراً یہ ہے کہ:۔

"اگر خدا پر طبیعیات کے قانون کا اطلاق نہیں ہوتا تو اس کے وجود کا طبیعاتی مشاہدہ سے ثبوت نہیں مل سکتا اور اگر یہ قانون اس پہ لاگو ہیں تو پھر حرحرکیات (THERMODYNAMICS) کے دوسرے قانون کے مطابق اس کو خود اپنے لیے ایک خالق کی ضرورت ہے۔

رسل اپنے آپ کو لاادریت کے عقیدے کا قائل سمجھتا تھا جو دہریت کے نظریئے سے مختلف ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ دہریوں کے مطابق درحقیقت خدا جیسی کوئی ہستی نہیں ہے۔ مگر

مگر لاادریت کا عقیدہ رکھنے والے لوگ اس معاملہ میں صرف شک رکھتے ہیں۔ نہ تو وہ یہ کہتے ہیں کہ خدا نہیں اور نہ یہ کہ خدا ہے۔ مگر وہ اپنے معاملات میں خواہ وہ دستور سے یا اخلاق سے یا کسی دوسری انسانی سرگرمی سے متعلق ہوں اس مفروضہ پر عمل کرتے ہیں کہ خدا نہیں ہے۔

جان سٹوارٹ مل (JOHN STUART MILL) ایک انگریزی فلاسفر تھا جو تجرباتی نظریہ کا قائل تھا۔ یعنی وہ بغیر تجربہ علم کو رد کرتا تھا اور جو علم تجربہ سے حاصل ہو اس کو حقیقت سمجھتا تھا۔ مل کو خدا کی ہستی سے انکار نہیں تھا۔ وہ ایسی ہستی کو صرف ایک مفروضہ سمجھتا تھا جس کی احساسی تجربہ میں کچھ شہادت ملتی ہے۔ مگر وہ اس بے نظمی اور برائی سے متاثر تھا، جو دُنیا میں پائی جاتی ہے اور اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتا تھا کہ یا تو خدا کلی طور پر قادر نہیں یا وہ برائی اور بدنظمی کو پسند کرتا ہے۔ وہ خدا کو بالکل رد کرنے سے اس کو محدود اور غیر قادر سمجھنے کو ترجیح دیتا تھا۔ علم اخلاق میں مل کا عقیدہ تھا کہ سچ اور جھوٹ، نیکی اور بُرائی کی تعریف کے لیے خداوندی احکامات کا تلاش کرنا ضروری نہیں۔ کسی فعل کا اچھا یا بُرا ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ کیا وہ فعل زیادہ سے زیادہ افراد کی مسرت کا باعث ہو سکتا ہے۔ یا اُن کے دکھ درد میں زیادہ سے زیادہ تخفیف کر سکتا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق اخلاقی قواعد دائمی نہیں اور ان میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ ایک فعل کی اچھائی یا برائی اس اثر سے متعیّن ہوتی ہے جو یہ عام لوگوں کی خوشی پر ڈالتا ہے۔ یہ نظریہ بینتھم کے تخیّل سے ملتا جلتا ہے جس نے قانون سازی کا یہ معیار قائم کیا تھا کہ کیا مجوزہ قانون سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔

جین پال سارترے (JANE POUL SARTRE) ایک فرانسیسی فلسفی تھا۔ یہ اس خیال کا بانی تھا کہ انسان ایک بے مقصد دُنیا میں رہتا ہے جس میں ہر ایک فرد کی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ اپنے نقصان رساں ماحول سے مقابلہ کر کے اس پر غالب آئے۔ اس کا خیال تھا کہ خدا پر یقین رکھنا انسان کی سرشت میں داخل ہے اور اگرچہ وہ دہریہ تھا مگر وہ محسوس کرتا تھا کہ ایک غیر اللہ معاشرے میں خدا کی ہستی کے انکار سے تکلیف محسوس ہوتی ہے اور یہی بات اس کے دہریت کے فلسفہ کو دوسرے دہریہ فلسفوں سے ممیز کرتی ہے۔ مگر کیونکہ وہ خدا کی ہستی کا منکر تھا۔ اس کے اخلاقی اصولوں کے پسِ پشت خدا کے نہ ہونے کا مفروضہ ہے اور کیونکہ خدا نہیں اس لیے اخلاقی اقدار باہر سے نہیں لی جاتیں بلکہ وہ خود انسان کی تخلیق ہیں۔ اس کی رائے میں صحیح آدمی وہ ہے جس کو کسی رسّی سے باندھ کر نہیں گھسیٹا جا سکتا اور نہ ہی ایسا فرد صحیح آدمی کہلا سکتا ہے جو معاشرے کے پیدا کردہ یا کسی اور طریق سے پیدا شدہ نظریات سے اپنے آپ کو مجبور سمجھے۔ کیونکہ انسان فعل کی اختیاری قوت رکھتا ہے اس لیے

مروجہ اخلاق کی بندشوں کو توڑ کر ان سے آزاد ہو سکتا ہے۔ یعنی اس فلاسفر کے خیال کے مطابق انسان اپنے تجربہ اور ماحول کی روشنی میں اپنی اقدار خود مقرر کرتا ہے۔ مگر جو کچھ بھی اس کا اپنا نظریہ ہے اس کی رائے میں ہر فرد کو معاشرے کے بتلائے ہوئے قوانین کے تابع رہنا پڑتا ہے اور اس کے خیال کے مطابق معاشرے کو بھی غیر قدرتی قیود سے آزاد ہونا چاہیئے۔ خواہ یہ قیود رسم و رواج کی پیدا کردہ ہوں یا وہ کسی ارفع ہستی کے حکم سے پیدا ہوتی ہوں جس کی اس کے خیال کے مطابق کوئی بنیاد نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس طرح وہ سند نہیں بن سکتیں۔

ڈیوای ایک با اثر امریکی مفکر تھا۔ مگر وہ خدا کا منکر تھا۔ اس کے خیال کے مطابق خدا پر اعتقاد رکھنا ان خیالات پر منحصر ہے جو خود بخود انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ امر سائنسی طریقہ کے خلاف ہے جو احساسات اور تجربہ پر مبنی ہے۔ ہر وہ شخص جو آخرت کی زندگی کو ایک نعمت سمجھتا ہے۔ اس دنیا کو حقیر سمجھتا ہے اور اس خیال سے انسانی فعل کا سرچشمہ خشک ہو جاتا ہے اور اس دُنیا کی خوشیوں کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ مل ، رسل اور ڈیوای کے خیالات اس نظریئے کے مظہر سمجھے جاتے ہیں جس کو انسان دوستی کا نام دیا جاتا ہے اور یہ نظریہ مارکس کی دہریت سے متصادم ہے جو انسانی حقوق، آزادیٔ مذہب اور دیرینہ اقدار کو تباہ کرتا ہے اور دوسری دُنیا کی مشکوک خوشیوں پر موجودہ دنیا کی خوشیوں کو ترجیح دیتا ہے۔

بے مقصد کائنات میں فرد کا فرض : ایک نظریہ جو متعلق بہ وجود (EXISTENTIALISM) کہلاتا ہے۔ ابتداء میں عیسائیت کے چند نظریوں سے پیدا ہوا۔ مگر اب اس کو عیسائیت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس نظریئے کے مطابق دُنیا ایک بے مقصد شئے ہے۔ مگر فرد خود مختار ہے جو اپنے اختیاری ارادے سے اپنے ناموافق ماحول پر قابو پا کر اپنے لیے خود اقدار پیدا کرتا ہے۔ یہ نظریہ ایک وقت مغرب میں اتنا مقبول ہوا کہ اس نے مغرب کے تخیّل کو ایک سانچے میں ڈھال دیا۔ یہ نظریہ ایک ڈنمارک کے مفکر سورن کرک گارڈ (SOREN KIERKGAARD) کے تخیّل کا نتیجہ ہے۔ جس کا مرکزی عقیدہ یہ ہے کہ وحی یعنی انسان کے سامنے خدا کا اپنے آپ کو انسان پر ظاہر کرنا خدا کا ہی مفت عطیہ ہے۔ اور یہ ایسی چیز ہے جو انسانی طاقت سے بالا ہے اور کیونکہ استدلال ایک انسانی قوت ہے اس لیے عقل کے ذریعے ہم خدا تک نہیں پہنچ سکتے۔ ایمان کو سمجھنے کے لیے وحی کی ایک چھلانگ لگانی پڑتی ہے مگر ہم یہ نہیں کہہ

سکتے کہ خدا کس طرح کا ہو گا۔ عیسائیت کا خدا ہیگل کی عقلِ مطلق نہیں ہو سکتی اور کوئی فلسفہ انسان کو اس تک نہیں پہنچا سکتا۔ اگر یہ فرض بھی کیا جائے کہ ہیگل کا عقلِ کل کا تصور انسانی خواہشات اور مثالی تصورات کا ابھارنا تھا تو اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں ہوتا کہ خدا ہے اور کیونکہ خدا عقلِ مطلق نہیں اس واسطے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی چیز نہیں۔

موجودہ بات میں ہم مغرب کی دماغی دُنیا میں گھومتے رہے ہیں۔ صرف یہ دریافت کرنے کے لیے کہ جو مغربی مفکر خدا کی ہستی سے مُنکر ہیں وہ خدا کی عدمِ ہستی کی کیا دلیل دیتے ہیں؛ اور اسلام کے بنیادی تصورات یعنی توحید، خالق اور عالم کی پرورش کرنے والے کے خلاف کیا دلیل پیش کرتے ہیں۔ بہت سے مفکرّ جن کا ہم نے ذکر کیا ہے دہریہ ہیں۔ یعنی خدا کے منکر۔ دُوسرے مفکرّ وہ ہیں جو لاادریت کا تخیل رکھتے ہیں اور دہریت کی حد تک نہیں جاتے اور خدا کی ہستی کے متعلق شُبہ میں مُبتلا ہیں۔ نہ وہ خدا کی ہستی کو ثابت شُدہ سمجھتے ہیں اور نہ ہی غیر ثابت شدہ۔ یہ مسئلہ مسلمانوں کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ خاص کر ان مسلمانوں کے لیے جو نہر سویز سے اس پار رہتے ہیں۔ جن میں پاکستان کے مسلمان خاص طور پر شامل ہیں۔ کیونکہ پاکستان اسی وجہ سے وجود میں لایا گیا کہ ہم مسلمان علیٰحدہ قوم ہیں اور اپنا خاص نظریہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دہریت نے سویز سے پار ممالک میں سوائے چین، جزیرہ نما شمالی ویٹ نام اور شمالی کوریا کے مقبولیت نہیں پائی۔ اگرچہ ان ممالک میں کچھ لوگ ایسے ضرور پائے جاتے ہیں جو یا تو دہریہ ہونے کا اعلان کرتے ہیں یا وہ دلوں میں دہریت کے تصور سے متاثر ہیں۔ مگر چین اور روس کے ساتھ ہماری سرحدیں ملتی ہیں۔ اور اگرچہ ان دونوں ملکوں کے ساتھ ہماری آمدورفت بہت محدود ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان دونوں ملکوں کے تخیل سے ہمارے سب دانش ور واقف ہیں۔ ایک بات جو قابلِ ذکر ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کے ان دہریہ فلسفیوں کے دلائل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ باوجود ان مضامین کی تعداد کے جو اس بحث میں استعمال ہوئے ہیں مثلاً فلسفہ، منطق اور طبیعات، اور مابعد الطبیعات وغیرہ۔ ان فلاسفروں نے یا تو ایک دوسرے کی دلیل میں ترمیم کی ہے یا اُس کو آگے بڑھایا ہے اور یا اُس پر نکتہ چینی کی ہے اور بعض مفکر تو اس تنازعہ میں ڈانواں ڈول ہی نظر آتے ہیں۔ جو نتائج ان مفکروں نے اس مباحثہ سے حاصل کئے ہیں ان میں بھی تفاوت صاف نظر آتی ہے۔

خلق اور کائنات کا معمّہ

ساری بحث اس نکتہ پر مرکوز ہے کہ کائنات کب اور کس طرح ظہور میں آئی اور اس سوال پر ہر ایک دہریت کا قائل سائنس دان ایسے ہی شکوک رکھتا ہے اور اس کی صراحت کرنے سے قاصر ہے جیسا کہ دوسرے سائنسدان۔ حالانکہ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے میں اربوں روپیہ خرچ کیا جا چکا ہے اور کئی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ مگر یہ راز اب بھی اسی طرح سربستہ ہے جیسا کہ ماضی میں تھا۔ دراصل اس مسئلہ پر بحث ایک دائرہ کے اندر گھومتی ہے اور ہر بحث اور دلیل ہمیں اسی مقام پر لے جاتی ہے۔ جہاں سے ہم شروع ہوئے تھے اور جس سوال کا ہم حل چاہتے ہیں مزید مشکلات لے کر پھر سامنے آ جاتا ہے۔ خدا کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں اس بات پر بھی اتفاق نہیں کہ کیا متنازعہ مسئلہ کا حل فلسفہ کی مدد سے ڈھونڈا جائے یا سائنس کی مدد سے یا بذریعہ شہادت و تجربہ۔ بنیادی نقطہ جو زیر بحث ہے وہ یہ ہے کہ کیا مادہ، خواہ اس کی اصلی صورت کچھ ہی ہو کسی ارفع ہستی سے پہلے موجود تھا یا اس ہستی نے اس کو پیدا کیا۔ بائبل کے باب تخلیق اور تھوڑے بہت فرق کے ساتھ قرآن کے مطابق خدا نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کو پیدا کیا۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ مادہ خدا کی تخلیق ہے اور ارادی فعل سے اس کی تشکیل ہوئی یا اس کو ایسے قوانین کے تابع رکھا گیا جو خود بخود عمل پیرا رہتے ہیں جس کی وجہ سے انسان اس کو اس کی موجودہ شکل میں دیکھتا یا محسوس کرتا ہے اور اس میں ہمیشہ جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ان کو بھی دیکھتا رہیگا۔ تخلیق کے اس فعل کو ماننا پڑے گا تا وقتیکہ خدا کے منکر یہ ثابت نہ کر دیں کہ مادہ ازلی ہے۔ اور اس میں وہ خصوصیات یا خود بخود عمل کرنے والے قوانین موجود ہیں جو ہمیشہ اس کو نئی شکل دیتے رہتے ہیں۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ازلی ہونے کا کیا ثبوت ہے؟ کیونکہ اس کی موجودہ شکل اس بات کے خلاف نہیں کہ کسی دائمی اور ازلی عاقل ہستی نے اس کو پیدا کیا اور اگر یہی دو متضاد مفروضے ہو سکتے ہیں تو پہلا مفروضہ غلط ثابت نہیں ہو سکتا۔ تا وقتیکہ دوسرے مفروضے کو صحیح نہ ثابت کر دیا جائے۔ اور کیا کوئی سائنسدان، فلاسفر یا فوق الطبیعات کا ماہر آخر الذکر مفروضہ کو صحیح ثابت کر سکا ہے اور جب تک یہ مفروضہ ثابت نہ ہو خدا کے انکار کرنے والوں کے لیے کوئی کھڑا ہونے کی جگہ نہیں رہتی۔ اس نکتہ پر بحث کرتے ہوئے چند ضروری امور کا حوالہ دینا مناسب ہو گا جو ان سائنس دانوں کے مشترکہ علم میں ہیں جو علم ہیئت کے میدان میں کام کرتے رہے ہیں۔

ان میں پہلی بات یہ ہے کہ کائنات ایک بُلبلہ کی شکل رکھتی ہے جس کی بیرونی سطح پر بیشمار کہکشاں اور ستاروں کے جُھنڈ مخالف سمتوں میں بے پناہ تیزی کے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ کیا اس مخالف سمتوں میں سفر کرنے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ کسی وقت ان اجسام فلکی کا ایک ہی مرکز تھا۔ جہاں سے انہوں نے اپنا سفر کئی نامعلوم منزلوں کی طرف شروع کیا، اگر ان کی کوئی منزل ہے۔ اور کیا اس سے یہ بات بھی ثابت نہیں ہوتی کہ شروع میں ان کو کسی زبردست قوت نے اپنے مرکز سے دھکیلا اور یہ دھکا تخلیق کا فعل ہو سکتا ہے۔ دوسری بات جس کی صحت میں شک نہیں ہو سکتا یہ ہے کہ یہ بے شمار اجسام فلکی جو دوربین سے دیکھے جا سکتے ہیں ایک لامحدود کائنات کا ذرا سا حصّہ ہیں اور اپنے گرد گھومنے والے اجسام بھی رکھتے ہیں۔ جن میں زندگی کا امکان ہے۔

اب سائنس دانوں کا اپنا قانون ہے کہ ایک جسم کی ایک دائرے میں متحرک رکھنے کے لیے تین شرطوں کی ضرورت ہے:

(۱) دھکا جو رفتار کی تیزی مقرر کرتا ہے۔

(۲) گھومنے والے جسم کا اس جسم سے فاصلہ جس کے گرد یہ گھومتا ہے۔

(۳) اگر ایک جسم کے گرد دوسرا جسم گول دائرہ میں گھومتا ہے تو دونوں اجسام کی حرکت متوازی ہونی چاہیئے۔ حرکت کرنے والے جسم کو کس سے اور کس طرح یہ دھکا ملا۔ جو اس کی رفتار اور طرف کو قائم رکھتا ہے اور جس جسم کے گرد یہ گھومتا ہے اس سے گھومنے والے جسم کا فاصلہ کیسے مقرر ہُوا، یہ ایسے سوالات ہیں جن کا سائنس دانوں کو اس علم کی مدد سے جس پر وہ ناز کرتے ہیں جواب دینا لازم آتا ہے۔

نیوٹن کا کشش کا اصول ان تینوں باتوں کا جواب نہیں دے سکتا۔ قاری پر یہ ظاہر ہو چکا ہو گا کہ وحدانیت کی مشہور دلیل کائنات کے نظام اور ترتیب پر مبنی ہے۔ اس دلیل کا کچھ حصّہ یسوع ناصری نے اپنی پہاڑی وعظ میں ایک مختصر اور پر معنی فقرے میں بیان کیا جب آپ نے فرمایا:

"اور آپ لباس کا کیوں فکر کرتے ہیں۔ کھیت کی سوسن یا نرگس کو دیکھو وہ کیسے بڑھتی ہے؛ وہ کوئی محنت نہیں کرتی۔ نہ وہ سوت کاتتی ہے۔ اور میں آپ سے کہتا ہوں کہ سلیمان ذی شان بھی کبھی ایسے لباس میں ملبوس نہیں ہُوا۔ جیسے کہ یہ پودے۔"

یہ بات کہ موجودہ سائنس، جس سے چٹانوں کی عمر یا کسی جانور یا درخت کے مرنے کا

دقت مقرر ہو سکتا ہے، اسلام کے مسئلہ تخلیق سے متضاد نہیں اگرچہ عیسائیت کے اس دعوے
کی کہ تخلیق کا فعل ۴۰۰۴ سال قبل مسیح واقعہ ہوا کی تکذیب ہوتی ہے۔
یہ بات عام طور پر دہرائی جاتی ہے کہ سائنس اور مذہب دو مختلف چیزیں ہیں اگرچہ کسی کسی
مقام پر ان کا ظاہرہ تصادم نظر آتا ہے۔ میں یہ بات تسلیم کرتا ہوں مگر اس سے یہی نتیجہ
نکل سکتا ہے کہ مذہب کی بنیاد سائنس نہیں کوئی اور شئے ہے اور وہ شئے الہامی مذاہب
کے نبیوں کا تجربہ اور غیر الہامی مذاہب کے پیروؤں کا مراقبہ یا کسی خیال میں محویت ہے۔
قدیم مذاہب کی کوئی بھی وجہ ہو۔ مثلاً برائی کی سزا سے دل میں خوف پیدا کرنا، یا نیک کاموں
سے جزا کی توقع یا معاشرے کو قائم رکھنے کی غرض۔ ہمیں ان ہستیوں کی جن کی صداقت اور
پاک بازی میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور جن کو ان کے ہمعصروں نے نہایت قابل تکریم
سمجھا ایک لمبی فہرست ملتی ہے۔ جنہوں نے اپنے مخفی تجربہ کا مفصل حال بیان کیا ہے اور
ایک ارفع ہستی کے وجود کی شہادت دی ہے جس کو زمانۂ قدیم سے قبول کیا جا رہا ہے۔
ان میں سے کسی پر بھی خود غرضی، دیوانگی کے دورے یا فریب کا الزام نہیں لگا۔ مذہب
کی یہ بنیاد ہوتے ہوئے یہ بے فائدہ بات ہو گی اگر سائنس اور فلسفہ کو ہستیٔ ارفع کے
نظریہ کو رد کرنے کے لیے گھسیٹا جائے۔ کیونکہ سائنس اور مذہب کی بنیادیں مختلف ہیں۔
خدا کو عقل اور دلیل سے پہچاننے کی کوشش عبث ہے۔ سوائے اس قسم کی دلیل کے
جس کی طرف خود انبیاء نے اشارہ کیا ہے۔ اس واسطے اس دعوے کو تسلیم کرنے میں
کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ عقل و دلیل سے خدا کے ہونے یا نہ ہونے کو ثابت نہیں کیا
جا سکتا۔ کیونکہ خدا فہم و ادراک کے دائرے سے باہر ہے۔

اگر ہم دنیا میں بے انصافی، مصیبت، دکھ درد، بچوں کے اندھا یا اپاہج ہونے
اور غربت و افلاس کے مقابلے میں بے بہا دولت اور عیش و عشرت دیکھتے ہیں تو ہم
خدا کو الزام نہیں دے سکتے کیونکہ خدا نے یہ اختلافات رفع کرنے کے لیے انسان کو
عقل اور ذرائع بھی عطا کئے ہیں بلکہ یہ سب باتیں جن کو ظاہرہ طور پر بے انصافی سمجھا جاتا
ہے انسان کو آزمائش میں ڈالتی ہیں۔ اسلام کی وحدانیت کے لیے سب سے بڑی دلیل یعنی
کائنات کا نظام و ترتیب خود قرآن سے مہیا ہوتی ہے۔ صرف ایک ہی سائنسدان ڈاکٹر بلینڈ رسل
نے اس پر نکتہ چینی کی ہے۔ مگر معاملہ اس قدر صاف اور آسان نہیں اگرچہ مغربی فلاسفروں
اور قرآن کی دلیل میں کوئی مشترکہ بات نہیں۔ اس سے یہ فرض نہیں کر لینا چاہیئے کہ اسلام نے
اپنے فلاسفر پیدا نہیں کئے جو مغربی فلاسفروں کے ہم پلہ ہوں یا ان سے بھی اونچا مقام رکھتے ہوں

یا یہ کہ اس مسئلہ پر بحث کرنے میں اپنے تخیّل اور استدلال میں کم تھے۔ مسلم فلاسفروں کا ذکر بعد میں آئے گا مگر اس مرحلہ پر میں یہ بات دہرانا چاہتا ہوں کہ سائنسدانوں کے سامنے بنیادی سوال یہ ہے کہ وہ آیا کسی مفروضہ کی بناء پر کائنات کی کوئی جامع تعریف یا تفصیل بتا سکتے ہیں۔ یا یہ بات واضح کر سکتے ہیں کہ کائنات کس طرح وجود میں آئی؟ قرآن کہتا ہے کہ اس کو اللہ نے پیدا کیا۔ کیا سائنس دان اس دعوے کو رد کر سکتے ہیں یا کوئی متبادل طریقہ تخلیق یا اس کے ازلی ہونے کی دلیل دے سکتے ہیں؟ یا یہ بتا سکتے ہیں کہ کائنات اگر ازلی نہیں ہے تو کس وقت ایک حادثہ کے طور پر پیدا ہو گئی؟ اور اس حادثہ کی نوعیت کیا تھی؟

اُوپر بیان کیا گیا ہے کہ کائنات ایک صابن کے بلبلہ کی شکل رکھتی ہے جس کی سطح ہموار نہیں اس کو محدود سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس کی حدود متعین نہیں کی جا سکتیں۔ کیونکہ یہ حدود کے بغیر (BOUNDLESS) ہے۔ یہ ایسا خیال ہے جو عام انسان کے فہم سے بالاتر ہے۔ انسان ایک سیارے پر بستا ہے اور یہ سیارہ سورج کے گرد گردش کرتا ہے۔ سورج خود کہکشاں کے گرد پانچ لاکھ فی گھنٹہ کی رفتار سے گردش کرتا ہے۔ تمام نظام شمسی اس کہکشاں کے مقابلے میں جس کا یہ ایک حصّہ ہے ایک ناچیز شئے ہے۔ اور کہکشاں ایک نہیں بیشمار ہیں جو مرکز سے پرے جانے کے اصول پر ۴۰,۰۰۰ میل فی گھنٹہ دور ہٹ رہی ہیں۔ اسواسطے کہا جاتا ہے کہ کائنات کی وسعت میں اضافہ بذریعہ پھیلاؤ ہو رہا ہے۔

کہکشاں میں ستاروں کی گردش اور چمک ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ اور ان ستاروں کے علاوہ اور ستاروں کے جھنڈ ہیں۔ جو خاک، مٹی، گیس اور ستاروں کے جھنڈوں پر مشتمل ہیں اور یہ ستارے اتنی دور ہیں کہ وہ صرف دُھند ہی کی شکل میں نظر آ سکتے ہیں۔ ستارے کئی ایک مرحلوں سے گزرتے ہیں۔ وہ پیدا ہوتے ہیں۔ بڑھتے ہیں اور یا تو دھماکے کے ساتھ پھٹ جاتے ہیں یا اپنی حدّت کھو کر ٹھنڈے ستارے بن جاتے ہیں۔ سائنس دانوں کے خیال کے مطابق ایک خطّہ خلا سے اوپر بھی ہے جس کو ماوراء الخلاء (SUPERSPACR) کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ دریافت ہو چکا ہے کہ یہ خطّہ کائنات کے حصّوں کو سیاہ سوراخوں میں سے اپنی طرف کھینچ کر نگل رہا ہے اور پھر جو کچھ اس نے نگلا ہے اُس کو اُگل کر نکال دے گا اور کائنات پھر شروع ہو جائے گی۔ مگر برعکس طریقہ سے یعنی کائنات کا جو حصّہ نگلا گیا ہے اُگلنے پر اس کا اُوپر کا حصّہ نیچے رہے گا اور نچلا حصّہ اوپر ہو جائے گا۔

ایک اور بات قابلِ توجہ ہے کہ طبیعیات کے اُونچے درجے کے سارے علوم اس مفروضہ پر منحصر ہیں اور اس مفروضہ کو بے بنیاد نہیں کہا جاسکتا کہ سائنس کو کسی ایسی تیز رفتار شئے کا علم نہیں. جس کی رفتار روشنی کی رفتار سے زیادہ ہو یعنی ۱,۸۶,۰۰۰ میل فی سیکنڈ سے زیادہ ہو۔ مگر اب اس بات کی شہادت مہیا ہو رہی ہے کہ قواسار (QUASAR) کے ریڈیو کے ٹھوس عنصر جو سب سے زیادہ دور کائنات کے کنارے پر واقع ہیں۔ روشنی کی رفتار سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو اس تندہی اور جانفشانی سے تیار کئے ہوئے طبیعیات کے اصولوں کا کیا حشر ہوگا؟ کیا ان اصولوں کو غلط کہا جائے گا اور کیا ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ خود کائنات کے حصّوں میں مختلف اصول کام کر رہے ہیں اور کیا ہم یہ کہیں گے کہ یہ قواسار کسی دوسری کائنات کا حصّہ ہیں اور ہمیں کائنات کے متعلق اس نظریئے پر نظر ثانی کرنی پڑے گی کہ کائنات محدود ہے مگر بغیر کسی سرحد کے قواسار کی دریافت اتنی تازہ ہے کہ یہ لفظ اب تک ڈکشنریوں میں شامل نہیں ہُوا۔

جہاں تک کائنات کا تعلق ہے سائنس دانوں نے ایسے ستاروں کا بھی پتہ لگایا ہے جو اربوں روشنی کے سالوں کے فاصلوں پر ہیں اور کئی کیمیائی اجزاء جو ستاروں کے درمیان زندگی کے لیے ضروری ہیں اس فاصلہ پر پائے جاتے ہیں۔ کیا اس سے یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ زندگی اس ناقابلِ اندازہ فاصلہ پر بھی ہے یا تھی؟ حال ہی میں کینیڈا اور ہالینڈ کے ہیئت دانوں نے کائنات میں سب سے بڑا جرم فلکی دریافت کیا ہے جو کہکشاں کے گرد برقیہ ذروں کا بادل ہے۔ جس کی وسعت روشنی کے ۱۸۰۰ لاکھ سال کی ہے۔ یاد رہے کہ روشنی کی ایک سال کی مسافت ۶ کروڑ کھرب میل ہے۔

موسم سرما ۱۹۷۳ء میں ہزارہا سائنس دان نہایت ہی طاقتور دوربینوں اور دوسرے آلات سے مسلح ہو کر ایک ایسے دمدار ستارے کا مطالعہ کرنے کے لیے مختلف مقامات پر جمع ہوئے جس کو انسان نے پہلی دفعہ زمین سے دیکھنا تھا۔ اس دمدار ستارے کا نام کہوٹک تھا اور اگر اس سے پہلے کبھی اس کو دنیا والوں نے دیکھا تھا تو اس وقت دیکھا ہوگا جبکہ انسان غاروں میں رہتا تھا یا وہ وسط حجری انسان (NEANDERTHAL) کی شکل میں زمین پر پھرتا تھا۔ کوئی شخص نہیں جانتا تھا کہ یہ ستارہ کہاں سے آیا اور کدھر کا رُخ کر رہا ہے۔ سائنسدانوں کی غرض اس ستارے کے مطالعہ کرنے کی یہ تھی کہ شاید اس ستارے کے دیکھنے اور تجزیہ کرنے سے یہ پتہ چل سکے کہ نظام شمسی یا کائنات کس طرح بنی؟ کرۂ ارض پر زندگی کس طرح شروع ہوئی؟ مفروضہ ان سائنسدانوں کا یہ تھا کہ دمدار ستارے مادے کی اساسی صورت کے ٹکڑے ہیں جو

نظام شمسی میں کسی ستارے یا سیارے میں جذب نہ ہو سکے۔ جب یہ نظام تقریباً ساڑھے چار کروڑ سال پہلے ظہور میں آیا۔ دمدار ستارے کروڑوں کی تعداد میں ملبہ کے بے اندازہ ڈھیروں میں پلوٹو سیارے سے پرے، جو نزدیک ترین ستارے (PROXIMA CENTAUR) کے جو ہم سے تین لاکھ سال روشنی کے دُور ہے، نصف فاصلے تک ملتے ہیں۔ یہ ستارے بھی سورج کے گرد گھومتے ہیں جس سے دو امکانات پیدا ہوتے ہیں:

(۱) وہ زمین سے ٹکرا کر اس کو تباہ کر سکتے ہیں۔

(۲) یا اپنے مدار پر حرکت کرنے کے دوران زمین کو اپنی دم میں لپیٹ سکتے ہیں۔ اور اپنی زہریلی گیسوں سے زمین پر ساری زندگی ختم کر سکتے ہیں۔

اب یہ دریافت ہو چکا ہے کہ ایک نہایت کمیاب زہر جس کا کیمیائی نام ہائڈروسائنائڈ (HYDROGEN CYNIDE) ہے دمدار ستاروں میں پایا جاتا ہے جس سے ڈاکٹر سٹیفن پی ماراں کے جو بطور (NASA) کے اپریشن کھوٹک (OPERATION KOHUTAK) کے صدر تھے اس نظریئے کی تصدیق ہوتی ہے کہ دمدار ستارے اس خاک دھول سے بنے ہیں جو ستاروں کے درمیان سورج سے بہت دور کہکشاں میں پائی جاتی ہے۔

(PAKISTANTIMES, JAN9, 1973)

یقین کیا جاتا ہے کہ دمدار ستاروں کا بیرونی حصہ ایک چھلکا ہے جس کو سورج اپنی حرارت سے اب تک پگھلا کر اُتار نہیں سکا۔ خیال کیا جاتا تھا کہ جب یہ ستارہ سورج کے عقب سے نمودار ہوگا تو اتنا گرم ہوگا کہ اس کی شکل بدل جائے گی۔ اس سے سائنس دانوں کو اس مادہ کی ساخت کے مطالعہ کرنے کا موقع مل جائیگا جس پر سورج اثر انداز نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی اصلی حالت میں خلاء میں موجود ہے۔ کہوٹک آیا اور چلا گیا مگر اپنے پیچھے کوئی بھی مُفید سراغ نہیں چھوڑ گیا۔ ایک وقت خیال کیا جاتا تھا اور اب بھی یہ خیال ہے کہ چاند سائنسدانوں کے لیے ایک روزیٹا کتبہ[لے] ثابت ہوگا جس سے وہ کائنات سے متعلق نئی باتیں دریافت کر کے خلق کے معمّہ کو حل کر سکیں گے۔ مگر بجائے اس کے کہ چاند تخلیق سے متعلق کوئی سراغ مہیا کر سکے اس نے مزید معمّے پیدا کر دیئے ہیں اور اس نے اپنی تخلیق کے متعلق سائنسدانوں کے کسی نظریہ کی بھی تصدیق نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب تک سائنسدان اور فلسفی یہ دریافت نہیں کر سکے کہ کائنات کیا ہے؟ کس طرح بنی اور کس طرح ظہور میں آئی؟

لے یہ ایک پتھر پر کندہ کتبہ تھا جس پر قدیم مصری زبان اور اس کا ترجمہ یونانی زبان میں لکھے جانے کے باعث قدیم مصری زبان دریافت ہوئی۔

اسلام میں مسئلہ تخلیق

اس معمہ کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل آیات اور نظریات کو مدِّ نظر رکھنا ضروری ہے :۔
غلق کا لفظ قرآن میں آیات (۲/۱۱۲ - ۵۴/۴۹) اور ایک اور آیت میں آتا ہے۔ یہ آیات اللہ کے پیدائشی فعل و عمل سے تعلق رکھتی ہیں۔ آیات ۳۹/۶ ، ۴۴/۴۹ ، اور ۸۶/۵-۷ انسان کی پیدائش کے متعلق ہیں۔ آیت ۶/۱۰۲ میں لفظ الخالق استعمال کیا گیا ہے اور آیات ۳۶/۸۱ ، ۱۵/۸۶ میں لفظ الخلّاق۔ ان آیات کو ملا کر پڑھنے سے جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو اور زمین و آسمان کو ان کی اصلی صورت میں پیدا کیا اور وہ جو چیز چاہے پیدا کرتا ہے۔ مزید براں قرآن میں ایک سے زیادہ دفعہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ ایک چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور صرف یہ حکم ہوتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔

(۶/۷۳ - ۲/۱۱۷)

قضاء و قدر اور لامحدود منشاء الٰہی

فرقہ معتزلہ کا خیال تھا کہ چونکہ خدا عادل ہے۔ وہ ان افعال کی باز پرس نہیں کرے گا جن کے کرنے اور نہ کرنے پر انسان کو اختیار نہیں اور جس کا کرنا یا نہ کرنا پہلے سے مقرر ہو چکا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ فرقہ تقدیر کا قائل نہیں تھا اور انسان کو اپنے عمل و فعل میں خود مختار سمجھتا تھا۔ یہ سوال کہ آیا قرآن بھی پیدا کیا گیا۔ جیسا کہ اس فرقہ کا خیال تھا۔ یا وہ ازلی ہے۔ اس کتاب کی وسعت سے باہر ہے۔ اگرچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کیونکہ خدا "اوّل" ہے تو قرآن اس کی تخلیق ہونا چاہیئے۔ اللہ تعالےٰ نے اپنی روح انسان میں پھونکی (۳۸/۷۲)۔ اور عام طور پر تسلیم شُدہ حدیث کہ اللہ نے انسان کو اپنی شکل میں پیدا کیا۔ قرآن کی کچھ اور آیات بھی تخلیق کے مسئلہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ آیات ۸۴/۱۹ اور ۵۶/۵۷-۵۹-۶۲ ہیں۔ جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم (اللہ) نے تم (انسان) کو پیدا کیا اور تم کو ایک حالت سے دوسری حالت تک آگے لے جایا جائے گا۔ زندگی کے جراثیم کو تم پیدا کرتے ہو یا ہم۔ ہم نے موت کو آپ کا مقسوم بنایا ہے۔ مگر کیا یہ بات اس امر کے مانع ہے کہ ہم آپ کی جگہ تم جیسے دوسروں کو پیدا کریں یا ایسی شکل میں پیدا کریں جو تم نہیں جانتے ہو۔ یعنی انسان کو خدا نے ابتدا ہی میں پیدا نہیں کیا۔ بلکہ موجودہ مخلوق کو بھی وہی پیدا کرتا ہے اور انسان کو منزل بہ منزل آگے لے جاتا ہے اور اس کو (انسان کو) ایسی منزل پر لے جائے گا جس کا وہ (انسان) تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ آیات خلق سے متعلق اللہ کی قوت مطلق اور ارتقاء انسانی کو بیان کرتی ہیں۔

مسئلہ مخالفہ کا مطلب اللہ کی صفات سے غیر دوامی کے خیال کو دور کرنا، اس کی ضروری صفات کو، جو انسان کی صفات سے ملتی جلتی بیان کی گئی ہیں علیحدہ کرنا ہے یعنی ہر دو میں تمیز کرنا یا فرق ڈالنا ہے۔ صوفیوں کا یہ نظریہ کہ تمام دنیا آہستہ آہستہ اللہ میں جذب ہو جاتی ہے حتیٰ کہ یہ کہا جا سکے کہ سب کچھ اللہ ہے۔ جو نکتہ وحدانیت اور دہریت کی بحث میں یاد رکھنا چاہیئے یہ ہے کہ قطع نظر اس عقیدے کے کہ اللہ نے کائنات کو پیدا کیا۔ اسلام میں وحدانیت اور اللہ کا تصوّر دوسرے مذاہب اور مغربی فلسفہ کے نظریئے سے بالکل مختلف ہے۔ قرآن میں اللہ کے کئی نام اور صفات ہیں جو بادی النظر میں ایک دوسرے کے متضاد معلوم ہوتے ہیں۔ اور مسلم فلاسفروں اور حکماء کی پہلی کوشش یہ تھی کہ اللہ کا صاف صاف تصور اور مسلمان کی تعریف بیان کی جائے۔ آخر الذکر نے اسلام میں نفاق اور فرقے پیدا کئے۔ ہر ایک فرقہ نے اپنے سے مختلف الخیال فرقہ کو ملحد قرار دیا اور یہ صورت اب تک موجود ہے۔

اسلام کے بنیادی عقیدے وحدانیت اور رسالت ہیں۔ اور اپنے مباحثوں میں فقہانے ایسے دلائل سے احتراز کیا ہے جن سے اللہ کی تشبیہ (دوئی) کا شُبہ پیدا ہو اور اس کی وحدانیت پر اثر پڑے یا جن سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ وہ صرف ایک مبہم اور خیالی ہستی ہے کیونکہ یہ نتیجہ لاادریت کے تخیل کی طرف لے جاتا ہے اور اگرچہ قرآن میں اللہ کے ہاتھ ۳۹/۶۷، اللہ کی آنکھوں ۵۴/۱۴، چہرے ۲/۱۱۵ اور اس کے تخت پر بیٹھنے ۲۰/۵ کا ذکر ہے۔ ان آیات کی ایسی کوئی تعبیر نہ کی جائے جس سے ظاہر ہو کہ خدا ایک انسان کی شکل رکھتا ہے جو دلائل ان نتائج سے بچنے کے لیے دیئے گئے اگرچہ وہ بہت دقیق اور پُرمغز ہیں تاہم ان کا مختصراً بیان کرنا ضروری ہے۔ اس مضمون پر بحث کے تین رُخ ہیں:۔

۱۔ ایک نظریہ اہلِ حدیث کا ہے کہ جو کچھ قرآن، حدیث اور اجماع سے اخذ ہوتا ہے اس کو بلاکم و کاست اور بغیر کسی قسم کی نکتہ چینی یا بحث کے تسلیم کیا جائے اور نہ ہی اس نظریہ کو بذریعہ استدلال وسعت دی جائے۔ یہ نہ پوچھا جائے کہ یہ بات کیوں اور کس طرح مانی جائے اور نہ ہی کسی اور نظریہ سے مقابلہ کیا جائے۔ اس کے بعد دو اور اقدام لئے گئے۔

(۱) مسئلہ مخالفہ کے اصول کی تکمیل یعنی اللہ کی ہر بات اس سے مختلف ہے جو انسان کے متعلق کہی گئی ہو۔ اس سے یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوا کہ اگر اللہ تعالےٰ کی ہر صفت انسان سے مختلف ہے تو ہم اللہ کا مکمل تصوّر کیسے کر سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب اسی اصول کی تکمیل کی دوسری منزل میں پایا جاتا ہے۔ یعنی کہ اللہ ہستیٔ مطلق ہے اور مطلق کا علم ہو نہیں سکتا۔ وہ اس خیال سے جو ہم اس کے متعلق کر سکتے ہیں مختلف ہے۔ وہ ہمارے ادراک اور فہم

سے بالاتر ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ زمین اور آسمان اور دیگر ہر شئے پیدا کرنے والا ہے۔
۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳ [۶]۔ صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس میں یہ اصول اسلام کو دہریت یا لاادریت
کے تخیل سے دُور رکھ سکا۔ کیونکہ اس دلیل کو اسناد پر انحصار کرنے اور تشبیہہ کے اصول
سے ملا دیا گیا۔

۲۔ دُوسرا نظریہ اس فرقہ کا ہے جو اپنے آپ کو اسلام کا استدلال پسند فرقہ کہتا ہے۔ یعنی
فرقۂ معتزلہ۔ جو مندرجہ بالا دلیل پر یہ اعتراض کرتا ہے کہ اللہ کی بیان کردہ صفات اس کی
وحدانیت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور اس طرح سے اس کو ایک مبہم وحدانیت بنا دیتی ہیں۔ فرقہ
معتزلہ پر العشری نے، جو شروع میں منطقی نظریہ کا قائل تھا مگر بعد میں وہ تقلید پسندی کا قائل
ہُوا، اعتراض کیا اور کہا کہ یہ نہ تو پوچھو کیوں اور نہ ہی کوئی مقابلہ کی بات کرو۔ اس دلیل کا
پہلا حصّہ فرقہ معتزلہ کے خلاف تھا اور دُوسرا ان لوگوں کے خلاف جو خدا کو انسانی صفات
اور شکل دیتے ہیں۔ عشری کے نظریئے کی ابو بکر بقیلانی نے تکمیل کی اور یہی نظریہ اب
عام طور پر اللہ تعالیٰ کے دُنیا کے ساتھ رشتہ کے تصوّر پر مبنی ہے۔

ایٹم: اب یہ حقیقت مسلّمہ ہے کہ تمام مادے کی، خواہ وہ کوئی شکل اختیار کرے اور کسی
صورت میں ظاہر ہو، عنصری اساسی ایٹم ہے۔ اگرچہ موجودہ تحقیقات میں خلاء و وقت
اور خیال کا عنصر بھی ایٹم کے تصوّر کے ساتھ شامل ہو چکا ہے۔ یہ خیال کہ ایٹم کی خصوصیّت
اور اہمیت حال ہی میں یعنی انیسویں اور بیسویں صدی میں دریافت ہوئی غلط ہے۔

اسلام میں العشری کے مکتب خیال کے فلاسفروں، خاص طور بقیسلانی نے ایٹم (ذرّہ)
کو اپنے تخیّل میں جگہ دی۔ ان کا یہ نظریہ تھا کہ ایٹم دراصل صفاریہ نقطے ہیں جو اتنے ٹھوس ہیں کہ
ان میں سے کوئی چیز گزر نہیں سکتی۔ اگرچہ وہ اپنے لیے ایک مقام ضرور رکھتے ہیں۔ وہ ایک
لڑی کے دانے کی طرح ہیں۔ مگر ایک دوسرے سے جُدا ہیں۔ یعنی اُن کے درمیان ایک خلا ہے۔
اسی طرح وقت بھی ایک دُوسرے سے نہ ملنے والے لمحوں کا تواتر ہے۔ اس خیال کی تفصیل
محمد علی فضلی نے اپنے کتابچہ (THE SUFFICIENCY OF THE COMMONALTY IN THE
SCIENCE OF SCHOLASTIC THEOLOGY)
میں دی ہے، جو قاہرہ میں شائع ہوئی اور جس کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کتابچے میں مصنف
اللہ کی پچاس صفات کا ذکر کرتا ہے۔ جن میں سے بیس مثبت ہیں اور اسی تعداد میں منفی اور
دس ایسی ہیں جن کو نہ مثبت کہا جا سکتا ہے اور نہ منفی۔ اس کے خیال کے مطابق ذرّے کسی وقت
ظاہر ہوتے ہیں اور کسی وقت غائب۔ ذرّوں کے اس طرح ظاہر ہونے اور غائب ہو جانے کو

وہ منشاء الہٰی سے منسوب کرتا ہے۔ موجودہ تحقیق نے اس نظریہ کی نفی کر دی ہے کہ ذرّے ایسے ٹھوس ہیں کہ ان میں سے کوئی چیز گزر نہیں سکتی۔ موجودہ تصور ایٹم کا یہ ہے کہ ہر ایٹم کے ایک مرکز ہوتا ہے۔ جس کے گرد مختلف تعداد برقیوں کی گھومتی ہے اور مرکز کے اجزاء دو ہیں: عدلیہ اور تلبیہ۔ نہ صرف برقیوں کو مرکز سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے بلکہ عدلیہ اور تلبیہ بھی علیحدہ کئے جا سکتے ہیں۔ جن کے علیحدہ ہونے سے قوت جوہری پیدا ہوتی ہے۔ ایٹموں کی کائنات میں تعداد مقرر ہے جو نہ کم ہو سکتی ہے نہ زیادہ اور سارا عالمی نظام ان ذروں کی تبدیلئ اشکال پر منحصر ہے جس سے سائنس دان یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ چونکہ یہ ذرّے نیوٹن کے کلیۂ حرکت کے تابع ہیں۔ اور ان میں ایک کشش ہے جو ایک فاصلہ تک اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لیے کائنات میں خدا کا تصوّر ایک اجنبی خیال ہے۔ مگر سر برٹ لینڈ رسل ذرّوں کی خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ یہ ذرّے اچھلتے رہتے ہیں اور کلیۂ عدم تعین کے قانون کے مطابق کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی کہ اُچھل کر کوئی ذرہ کدھر جائے گا اور کس رفتار سے۔ کیونکہ سائنس دانوں کو ذرّے کے اچھلنے کی سمت اور رفتار سے متعلق کوئی علم نہیں۔ اس لیے مُسلم فلاسفروں نے جیسے یہ نتیجہ نکالا کہ ذرّوں کا ظاہر ہونا اور غائب ہونا منشاء الہٰی پر منحصر ہے وہ یہ نتیجہ بھی نکال سکتے تھے اور اب اس سے اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ سوائے اس کے کہ ایٹم کی رفتار اور سمت کا تعین اللہ کی مرضئ مطلق پر منحصر ہے۔ جو بغیر کسی مادے کے کام کرتی ہے اور جس پر کوئی قانونِ ضرورت اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اللہ کی منشائے مطلق ذرّوں اور ان کی صفات کو پیدا کرتی ہے اور پھر ان کو منہدم کر دیتی ہے اس طریقہ سے دُنیا میں سب حرکت اور تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ اس کے لیے کوئی قانون نہیں۔ اور دُنیا ایک متواتر اور بار بار دہرائے ہوئے معجزہ پر قائم ہے جو عام عمل قدرت کے برابر ہے۔ یہ مطلب ہے ان قرآنی آیات کا جن میں اللہ فرماتا ہے "میں کہتا ہوں ہو جا اور وہ چیز ہو جاتی ہے (پیدا ہو جاتی ہے۔ ($\frac{6}{42}$ - $\frac{2}{117}$)۔

جین مذہب کے ذرّے بالکل مختلف خصوصیات رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ کرما کے ختم ہونے پر اوپر کی کشش سے کائنات کی انتہائی بلندی پر پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں، وہ بے حرکت اور مسرت اور علم سے مملو ٹنگے رہتے ہیں۔

لبنز (LEIBTNIZ) کا فلسفہ یہ تھا کہ کائنات میں پہلے سے مرتب ہم آہنگی موجود ہے جو کہ ان ذرّوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ترتیب وار ملاتی ہے۔ اس کے برعکس مسلمان فلسفیوں نے خدا تعالےٰ کی منشاء مطلق کے ساتھ تمام تبدیلیوں کو منسوب کیا۔

پیشتر اس کے کہ ایٹم کی یہ بحث ختم کی جائے انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا (ENCYCLOPEDIA BRITTIANICA) سے مندرجہ ذیل اقتباس دینا ضروری ہے۔

" ایٹم کے تصوّر کی مثال العشری مکتب فکر کے دانشوروں سے بھی ملتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ایٹم بہت چھوٹے چھوٹے ناقابل تقسیم ذرات ہیں جو اتنے ٹھوس ہیں کہ اُن میں سے کسی شئے کا گزر نہیں ہو سکتا۔ نہ ان کا کوئی جسم ہے اور نہ شکل مگر وہ ایک مقام یا ماحول ضرور رکھتے ہیں"۔ عربوں کے نظریئے اور موجودہ نظریئے میں نمایاں فرق یہ ہے کہ آج کل ایٹم کو ناقابلِ تقسیم نہیں سمجھا جاتا۔ مسلمان مفکّروں میں الغزالی اور رازی نے بھی ایٹم پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ دراصل مسلم فلاسفروں میں ایٹم کے پانچ مختلف تصوّر تھے:

مُسلم فلاسفر

متعلقہ ابواب کی طویل بحث میں مَیں نے کئی اور مفکّروں کا ذکر نہیں کیا ہے مگر اس سلسلہ میں کوئی شخص بھی غزالی کے نام کو نظر انداز نہیں کر سکتا ہے۔ غزالی طوس میں پیدا ہوا اس لیے نسلاً وہ ایرانی تھا۔ تینتیس سال کی عمر میں اس کے علم و دانش کی اتنی دھاک بندھی کہ اس کو بغداد کی نظامیہ یونیورسٹی میں پروفیسری کی کُرسی پیش کی گئی۔ وہ اس یونیورسٹی میں پانچ سال تک تعلیم دیتا رہا۔ مگر پھر اس کی زندگی میں ایک انقلاب آیا جو اس کو ایک قسم کی رہبانیت اور تصوّف کی طرف لے گیا۔ اس کا مذہب اور فلسفہ کا مطالعہ اتنا عمیق تھا کہ اس کو اسلام کا سب سے بڑا مفکّر سمجھا جاتا ہے اور وہ دُنیا کے فلاسفروں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے فلسفہ کی جھلک زمانہ حال کے فلاسفروں کی تصانیف میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس کی تصنیف احیاء العلوم کو قرآن سے دوسرا درجہ دیا جاتا ہے۔ وہ اسلام کا صوفی ہی نہیں تھا بلکہ اُس کو اسلامی عقائد کا عظیم اور باریک بین شارح شمار کیا جاتا ہے۔ مَیں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ اسلام کے مفکّروں میں اللہ کے تصوّر میں تین رجحان پائے جاتے ہیں:-

۱۔ تقلید پسندوں کا نظریہ کہ جو کچھ قرآن، حدیث اور اجماع سے اخذ ہوتا ہے اس کو بے چون و چرا اور بلا کم و کاست تسلیم کیا جائے۔

۲۔ معتزلہ فرقہ کا نظریہ جس میں دلیل اور عقل پر زور دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ حقیقت صرف عقل کے ذریعے دریافت ہو سکتی ہے۔ یہ فرقہ کشف اور مراقبہ سے روحانی روشنی پانے کا قائل نہیں تھا۔

۳۔ تصوّف، یعنی صوفیائے کرام کا نظریہ کہ زہد و تقویٰ مراقبہ اور اللہ کے خیال میں استغراق سے اللہ کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے۔

غزالی نے ان تینوں نظریوں کو مدِّ نظر رکھ کر ان میں امتزاج پیدا کیا اور احیاء العلوم اسی امتزاج

کی پیداوار ہے۔ جس کو اسلام میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور غزالی کو اس کتاب کی وجہ سے حجت الاسلام کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ اگرچہ غزالی کے دماغ میں کچھ شکوک نے جگہ لے لی تھی اور اس کی عقل نے صرف اندھے عقیدے کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے نکتہ رس دماغ نے وحی کی صرف فلسفیانہ تشریح کو بھی کافی نہ سمجھا تاہم آخر کار وہ قدامت پسند طبقہ کا حامی ہو گیا اور اس عقیدہ پر پہنچا کہ اللہ ایک قوت ارادیت ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔ غزالی کا یہ تخیل اس کے کتابچہ رسالت القدسیہ میں ملتا ہے جو بعد میں احیاء کا ایک حصہ بنا۔ غزالی فرقہ معتزلہ اور اس خیال کے خلاف تھا کہ اللہ کی صفات انسان جیسی صفات ہیں۔ اس کے خیال میں ذو معنی یا استعاری الفاظ انسان کو تشبیہہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ اور تنزیہ یعنی قرآن کے لفظی معنی لینا اور ان کو بغیر کسی قسم کی دلیل یا بحث کے قبول کرنا انسان کو الحاد کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کو اس بات سے بھی اختلاف تھا کہ چونکہ اللہ انسان جیسی صفات رکھتا ہے۔ وہ انسان کی شکل رکھتا ہو گا۔ اس کا یہ نظریہ باوجود اس کے تھا کہ قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے اپنی روح انسان میں پھونکی اور حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے انسان کو اپنے عکس میں بنایا۔ اس ساری بحث کے بعد ہم اب اس قابل ہو گئے ہیں کہ اللہ کا تصور اور اس کی صفات کو بیان کر سکیں اور تخلیق کے معمہ پر مزید روشنی ڈال سکیں۔

۱۔ وہ ہر چیز کا خالق اور پرورش کرنے والا ہے اور اس کی خدائی عالمگیر ہے۔ وہ خود کسی قوت یا دیگر ہستی کا پیدا کردہ نہیں ہے۔

۲۔ وہ کوئی مادی جسم نہیں رکھتا اور اس وجہ سے وہ حواس خمسہ سے محسوس نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ کائنات اس کی پیدا کردہ ہے اور اس کا انتظام اس کے اپنے ہاتھ میں ہے اس کی نہ کوئی بیوی ہے نہ اولاد۔ وہ خود بخود قائم ہے۔

۴۔ اس کی تمام صفات اور اسماء کے انکار سے وہ ایک مبہم ہستی بن جاتا ہے جس کو انسانی دماغ نہیں سمجھ سکتا۔

۵۔ اس کی کوئی ذہنی یا بصری تصویر نہیں بن سکتی کیونکہ اگر ایسا ہو سکے تو وہ مادی شئے بن جاتا ہے۔

۶۔ مادہ نہ اس کا ہمعصر ہے اور نہ اس سے پہلے موجود تھا اور کیونکہ وہ خود مادہ پیدا کرنے والا ہے یا تو اس نے مادہ میں ایسی خصوصیات پیدا کر دیں جن کی بدولت مادہ متحرک ہو گیا اور تبدیلیٔ اشکال کی قوت اُس میں پیدا ہو گئی۔ یا وہ اس بات سے باخبر تھا کہ جو مادہ اس نے پیدا کیا وہ کچھ قوانین کے عمل کے ماتحت ہو گا۔

۷۔ جو کچھ کائنات میں موجود ہے وہ اس سے پہلے موجود نہ تھا۔ وہ خود کسی طبیعاتی قانون کے تابع نہیں۔

۸ - وہ ایسی ہستی ہے کہ جس چیز کو چاہے پیدا کر سکتا ہے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ نہ سائنس اور نہ ہی فلسفہ اللہ کی عدم موجودگی کو ثابت کر سکا ہے اور نہ ہی ان علوم کے ماہر تخلیق کے ڈرامے کو سمجھ سکتے ہیں۔ دنیا کے مختلف حصّوں کے نبیوں کے ایک سلسلہ نے اپنے مذہبی تجربہ کی بناء پر اس کے موجود ہونے کی شہادت دی ہے اور جو کائنات میں نظام اور ترتیب نظر آتی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کو ایک ایسے فہیم معمار نے بنایا ہے جو کہ تخلیق کا سبب اوّل ہے۔ اور اگر ایٹم مادہ کی اساس ہے اور وہ ہر وقت اُچھلتا رہتا ہے۔ مگر نہیں بتایا جا سکتا کہ اچھل کر وہ کدھر جائے گا اور کس رفتار سے، تو اس کو صرف منشاء الٰہی ہی اچھال سکتی ہے۔ اور اگر ایٹم تمام مادے کی اساس ہے اور مادے کی تمام اشکال ایٹم سے بنتی ہیں تو اس سے قرآن کی ان آیات کی تائید ہوتی ہے کہ اللہ کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ چیز ہو جاتی ہے۔

تصوّف اور فلاسفر مواحدین

تصوف کا مفہوم یہ ہے کہ انسانی روح میں ایک ایسی قوت موجود ہے جو بذریعہ عبادت، ریاضت، خدا کے خیال میں محویت اور دُنیا کی خواہشات سے آزادی، انسان کو خدا تک پہنچا سکتی ہے یا اس کو پہچاننے کی طاقت پیدا کر سکتی ہے۔ یا انسان اپنے اندر ہی نور محسوس کرتا ہے۔ تصوّف وحدانیت کے تصور کی ٹھوس چٹان پر مبنی ہے۔ اور اللہ کی ہر قسم کی دوئی اور اُس کے اپنی مخلوق کے مشابہ ہونے سے انکار کرتا ہے۔

صوفی اللہ کی صفات کو مانتے ہیں۔ مگر ان کی لفظی معنوں میں ہستی سے انکار اس وجہ سے کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی ہستی میں کسی قسم کے اضافہ کی صورت نہیں رکھتیں۔ بلکہ اللہ کی صفات اللہ کے ہی نام ہیں۔ ان کا یہ خیال بھی ہے کہ جہاں قرآن کی تاویل عقل کے خلاف ہو وہاں استعارہ، کنایہ اور تشبیہ سے کام لیا جا سکتا ہے۔ خدا قادر مطلق ہے مگر کسی حس سے محسوس نہیں ہو سکتا۔ نہ وہ بذریعہ عقل دریافت ہو سکتا ہے اور جو تمام زندہ چیزیں ہیں وہ ناقابل تقسیم ذرّوں سے بنی ہیں۔ اس تمہید کے بعد ہم اللہ کی منشاء کی اہمیت کو سمجھ سکتے ہیں اور ساتھ ہی قرآن کی ان آیات کو (۱۱۷/۲ - ۳۶/۸۲) جن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ہو اور وہ چیز پیدا ہو جاتی ہے" اس طرح یہ آیت تخلیق کی گتھی کو سلجھا دیتی ہیں۔ تصوّف کی جھلک ابتدائے اسلام میں پائی جاتی ہے مگر یہ خالص اسلامی تصوّف ہے نہ کہ عیسائیت، زرتشت، اپنیشد یا یوگا سوترا ہی سے لیا ہوا۔ تصوّف کے دو سو طریقے (خدا کو پہنچنے کا ذریعہ) ہیں اور ان طریقوں کی وجہ سے صوفیوں کے بھی اتنے ہی سلسلے ہیں۔ وحدانیت، وحدانیت سے مواحدین کا سلسلہ اور مواحدین سے تصوف ایک منطقی رجحان ہے۔ پیشتر اس کے کہ

ہم مواحدین کا، جو تصوف کے پیشرو ثابت ہوئے، ذکر کریں۔ چند مسلم فلاسفروں کے فلسفہ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ مگر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگرچہ ان فلاسفروں نے یونانی فلسفیوں کی تصانیف کو پڑھا۔ ان پر غور کیا اور ان کی تشریح کی اور کچھ حد تک اُن سے متاثر ہوئے۔ ان کے اسلامی عقیدہ، عمل اور تخیل میں فرق نہیں آیا۔

جن مسلم فلسفیوں نے یونانی فلسفیوں کا مطالعہ کیا۔ ان میں سب سے اوّل نام الکندی (تاریخ وفات) کا ہے جس کو مغرب میں الکندیس (ALCHENDIUS) کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کے فلسفہ کی شہرت سے اس کو صحرائی فلاسفر کہا جاتا ہے۔ وہ ایک انتھک مترجم تھا جس نے اپنے تراجم کے ذریعے مسلم فلاسفروں کو یونانی فلسفہ سے واقف کرایا۔

دُوسرا نام فارابی کا ہے جس کا مغربی نام الفربیبس (ALFRABIUS) ہے۔ اس کو ارسطوئے ثانی اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اس کو ارسطو کے فلسفہ پر پورا عبور تھا۔ یہ یونانی فلسفہ کا پیرو نہیں کہلایا جا سکتا۔ کیونکہ اس نے کئی ایک مسائل حل کئے جس کو یونانی حل نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا اعتقاد تھا کہ قرآن اور فلسفہ دونوں سچے ہیں اور کیونکہ سچائی ایک ہی ہو سکتی ہے۔ اسواسطے ان دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ یہ فلسفی اسی مکتب خیال کا ہے جس سے ابن سینا (AVICENNA) اور ابن رشد (AVERROES) تعلق رکھتے تھے۔

ابن رشد ایک کامل فلسفی تھا۔ اس کے خیال میں فلسفہ اور مذہب دو مختلف چیزیں ہیں جس میں تصادم کا کوئی امکان نہیں ہو سکتا۔ مگر فلسفہ کی نسبت مذہب کو وہ ایک اونچا مقام دیتا تھا اور وہ تصوف اور غزالی ہر دو کے خلاف تھا۔ مگر مذہب اور فلسفہ کو وہ متصادم نہیں سمجھتا تھا۔ دلیل اس کی یہ تھی کہ فلسفہ اور مذہب میں ایک اتفاق موجود ہے۔ قرآن کی مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ وہ سوچ بچار اور عقل کے ساتھ اردگرد کی اشیاء پر نظر ڈالیں اور عقل سے ان کی ماہیئت دریافت کریں۔ قرآن اس واسطے سچا ہے کہ وہ خدا کی وحی پر مبنی ہے اور فلسفہ اس لیے سچا ہے کہ وہ انسانی عقل کا نتیجہ ہے۔ اس واسطے ان دونوں میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ قرآن لفظی معنی بھی رکھتا ہے مگر اس کو تاویل کی بھی ضرورت ہے۔ علماء کو یہ اختیار نہیں پہنچتا کہ وہ تاویل کا حق صرف اپنے لیے مخصوص کر سکیں۔ فلسفیوں کو آزادیٔ تفسیر کا حق حاصل ہے۔ خواہ سورہ میں اشارے، استعارے اور کنائے استعمال کئے گئے ہوں۔ اس کا اعتقاد تھا کہ اسلام کا سنہری زمانہ جس میں کوئی نزاعات نہ تھے واپس آسکتا ہے۔ اگر فلاسفروں کو ان کے فلسفہ پر چھوڑ دیا جائے اور عام آدمی کو رائج الوقت مذہب کے نظریہ پر۔

فلاسفروں کی اسی جماعت کے بعد مواحدین کا زمانہ آتا ہے جس میں پہلا نام ابن تمارت کا ہے

جس کو بربریوں کا مہدی کہا جاتا ہے۔ اور جس کا علامہ اقبال کے لیکچروں میں خاص طور پر ذکر آتا ہے۔ اُس نے قرآن کا بربری زبان میں ترجمہ کرایا اور اسی زبان میں قرآن کو پڑھنے کی ہدایت کی۔ اُس نے اذان کا بھی اسی طرح ترجمہ کرایا اور مقامی زبان میں ہی اذان دینے کی ہدایت دی۔

ابن تمارت کا اسلام ایک قسم کا قومی اسلام تھا جو صرف ان لوگوں کے لیے تھا جو سو سال تک اس کے زیر حکومت رہے۔ مہدی اس یقین پر قائم تھا کہ خدا تعالےٰ نے اس کو بطور ایک مصلح بھیجا ہے اس لیے وہ آئمہ اربعہ کی تقلید کا قائل نہیں تھا تجسیم کا مسئلہ اُس کے نزدیک اسلام سے انکار کرنے کے مترادف تھا۔ وہ مطلق وحدانیت پر اعتقاد رکھتا تھا اور خدا کے تصور کو مکمل روحانی شکل دیتا تھا۔ وہ ابن حزم کے ساتھ متفق تھا کہ خُدا کی صفات اس کی صفات نہیں بلکہ اس کے نام ہیں۔

مواحدین کا نظریہ تھا کہ انسان کو دُنیا کی ہر ایک چیز چھوڑ دینی چاہیئے۔ خواہ وہ تجارت ہو یا کوئی پیشہ اور صرف توکل پر انحصار رکھنا چاہیئے۔ یہاں تک کہ اس کو خوراک سے بھی بے نیاز ہو جانا چاہیئے اور اس کی ساری توجہ خُدا اور آخرت پر مرتکز ہونی چاہیئے۔

ابن باجہ (AVENPACE) مغرب کا پہلا فلسفہ دان ہے وہ فارابی کا معتقد تھا۔ اور فلسفیوں کو ایک علیحدہ جماعت سمجھتا تھا۔ جن کا کام علیحدگی اختیار کر کے تخیل کی اُونچی سے اُونچی سطح پر پہنچنا تھا اور اپنا تذکیہ کر کے اپنے آپ کو اس قابل بنانا تھا کہ ان کو اصل حقیقت نظر آجائے اور وہ ایسی دوامی زندگی حاصل کر سکیں۔ جہاں افراد کی روح عقل کل میں جذب ہو جاتی ہے (اس کا مقابلہ کیجئے ہیگل کے نظریہ سے) اس کے خیال میں حقیقی مسرت اور سچائی انسان کے تخیّل میں پائی جاتی ہیں۔ نہ کہ صوفیوں کی بے خودی یا احساسات میں۔ وہ عقل و دلیل پر بڑا زور دیتا تھا اور اس کے قول کے مطابق انسان کو اپنے ہر فعل میں عقل پر انحصار کرنا چاہیئے۔

ابن طفیل (سال وفات ۵۸۱) کتب خانوں میں بیٹھ کر مطالعہ اور تخیّل میں مصروف رہتا تھا اس کا فلسفہ ابن باجہ کے فلسفہ سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ عوام فلسفہ کے اعلیٰ تخیّل کو نہیں سمجھ سکتے اور ان کی ہدایت کے لیے ایسے مذہب کی ضرورت ہے جو احساسات پر مبنی ہو۔ اپنے طریقۂ استدلال میں وہ غزالی کا ہم خیال تھا اور اپنے تصوف میں صُوفیوں کے سے طریقہ پر تزکیۂ نفس اور جسم کی تلقین کرتا تھا اور فرد میں وحدانیت کا متلاشی تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو بھول کر دوامی روحِ واحد کے پاس پہنچ جائے۔ اور حالت انبساط میں وہ چیزیں دیکھ سکے جو انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکتی اور وہ آواز سُن سکے۔ جو انسانی کان نہیں سن سکتے اور

اس غایت انبساطی حالت میں وہ عقل کل کو اور اس سلسلۂ علت کو جو انسان تک پہنچتا ہے دیکھ سکے۔ ابن یقظان کی مثال سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ شخص جو مروجہ مذہب کی رسموں پر عمل کرتا ہے اور وہ فلسفی جو تخیل کی انتہا تک پہنچ کر نتائج اخذ کرتا ہے۔ دراصل دونوں برابر ہیں۔ ابن طفیل اور غزالی میں بڑا فرق یہ ہے کہ ابن طفیل تو صرف فلاسفر تھا مگر غزالی صوفی بھی تھا جس نے اپنی غایت انبساطی حالت میں خدا کو تخت پر بیٹھے اور دیگر آسمانی چیزوں کو جن کا قرآن ذکر کرتا ہے دیکھا۔

آخری مواحد (سال وفات ۶۶۷) ابن سبعین تھا جو ابن عربی کی طرح صوفی تھا اور اپنے لیے ایسی ولایت کا دعوے کرتا تھا جو نبوت سے بھی افضل ہے۔ فریڈرک ثانی نے کچھ سوالات عبدالرشید سے، جو مواحد حاکم تھا پوچھے۔ رشید نے یہ سوال جواب دینے کے لیے ابن سبعین کو دے۔ سوال یہ تھے:۔ دُنیا کے دوامی ہونے کے کیا معنی ہیں؟ روح کیا چیز ہے؟ جو جواب ابن سبعین نے دیئے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ارسطو اور افلاطون کے فلسفہ سے جس کی آمیزش اسلامی تخیل سے ہو چکی تھی، پوری طرح واقف تھا۔ جواب یہ تھے کہ:۔ صرف صوفی کے رویا میں تیقن اور ذہنی سکون حاصل ہو سکتا ہے کہ تمام موجودات کی حقیقت صرف خدا ہے۔ ہم زندگی میں آسمانی حقیقتوں کی صرف جھلک دیکھتے ہیں اور انسان صرف موت کے بعد جو حقیقتاً اصلی پیدائش ہے دوام اور عقل کل کو پہنچ سکتا ہے۔ ابن سبعین سے پہلے ایک اور صوفی ال قیشری گزر چکے تھے۔ جو صوفی کے وجدان، ولیوں کے اعجاز نما کارناموں، اور انفرادی روح کا اللہ کے ساتھ ہم کلام ہونے کی تشریح کر چکے تھے۔ اخوان الصفا اور حسن بن صباح کے پیروکار ہر دو صوفی خیالات رکھتے تھے اور تصوّف کو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

صوفیوں کے ایک سلسلہ کا بانی ابن کرم تھا جو ایک قسم کا راہب تھا وہ تجسیم کا قائل تھا: یعنی قرآن کے لفظی معنوں پر انحصار رکھتا تھا۔ مثلاً کہ خدا ایک تخت پر بیٹھتا ہے اور اس کے لیے ایک جگہ ہے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ چل کر جا سکتا ہے۔ وہ ایک جسم رکھتا ہے جس میں خون اور گوشت ہے اور جس سے وہ لوگ جو اپنا تزکیہ کر چکے ہیں۔ بغلگیر ہو سکتے ہیں۔ ابن کرم کے ساتھ اور بہت سے نامور تارک الدنیا اور صوفیوں کے نام آتے ہیں مثلاً احمد بن حنبل، رابعہ راہبہ، جو ہر وقت موت کے بعد آنے والی زندگی کے خیال میں مستغرق رہتی تھی، ایک اور خاتون نفیسہ جو ایک مکمل طور پر تارک الدنیا کی زندگی بسر کرتی تھی اور آخیر میں ابن ادہم، جو فقہا اور عبادت کے بیرونی اظہار کو

نفرت سے دیکھتا تھا۔ وہ خود تارک الدنیا تھا اور عباسیوں کی عشرت اور بد اخلاقیوں سے نفرت کرتا تھا۔

ایک مشہور مسلم صوفی ابن عربی تھا، جو کسی قسم کے علم کو ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ اگر انسان اپنے اندر ربانی روشنی کا احساس رکھتا ہو۔ سب چیزوں کی ہستی اس کے عقیدے کے مطابق اللہ ہے جو ارفع ہستی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ خدا کی وحدانیت سے وہ یہ اصول اخذ کرتا تھا کہ تمام چیزیں مل جل کر آخر ایک واحد چیز ہیں کہ دُنیا کا ہر ایک حصہ ساری دنیا ہے اور کہ انسان کی روح ایک غیر جمالی چیز ہے۔ جو ہر ایک دوامی چیز سے مختلف ہے جو اللہ کی طرف سے آتی ہے اور موت پر اس کی طرف ہی واپس ہو جاتی ہے کہ اسلام بہترین مذہب ہے اور اس کا فلسفہ تصوّف ہے اور انسان اپنے آپ میں خود مختار نہیں۔ وہ اللہ کی رضا کا پابند ہے۔ خُدا کی وحدانیت کے اصول کو اس نے اتنا کھینچا کہ اس نے یہ کہنے میں تامل نہ کیا کہ نیکی بدی دو مختلف چیزیں نہیں ایک ہی ہیں ان کی دوئی اللہ کی وحدانیت کے خلاف ہے۔

ان صوفیاء کے علاوہ جن کا اوپر ذکر آچکا ہے ابن عربی کے بعد صوفیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس میں معروف الکرخی، علی حارث، منصور بن عثمان، مصری ذوالنور اور ابو طالب المکیؒ اور بے شمار اور نام شامل ہیں۔ کچھ شاعر بھی صوفیوں میں شامل ہیں۔ مثلاً رومیؒ، سعدیؒ، حافظؒ، جامیؒ اور عمر خیام۔ اگر ان کی شاعری کو استعاراتی شاعری سمجھا جائے۔ صوفیوں کے نظریئے کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خدا کو محسوس کرنے، دیکھنے اور اس سے ملنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ گویا کہ اللہ کی ہستی کی وہ براہِ راست شہادت دیتے ہیں۔

****

باب ۱۲

سائنس اور تہذیب کے پیشرو

جب یورپ جہالت، تاریکی اور توہم کے عمیق گڑھے میں پڑا تھا، حالانکہ وہ عیسائیت کو اپنا چکا تھا، تو اسلام کے فلسفی، سائنسدان اور دانشور دنیا کو اپنی ایجادات، تخیل، مشاہدات اور تجربوں کے نتیجوں سے روشن کر رہے تھے۔ ابتدا میں کچھ انکار اور بعد میں کچھ اعتراف کے ساتھ اب دیانتدار مغربی دانشور جنہوں نے اسلامی علوم و تہذیب کا بغور مطالعہ کیا ہے، تسلیم کرتے ہیں کہ یورپ کا تجدید علوم اور سائنسی تخیل کا زمانہ مسلمان مفکروں کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ میں رواجی لفظ عرب کی بجائے مسلمان کا لفظ استعمال کر رہا ہوں کیونکہ جس زمانہ کا میں ذکر کرنے والا ہوں عرب مفکروں کے ساتھ دیگر مسلم فلسفی اور سائنسدان، جو عربی النسل نہ تھے، شامل ہو چکے تھے۔ بعض مغربی مفکروں نے اس حقیقت میں اس طرح ترمیم کی ہے۔ کہ در اصل یہ سائنسی تخیل مسلم مفکروں کا اپنا تخیل نہ تھا بلکہ اس کے موجد قدیم یونانی تھے اور عربوں نے اس کو یونانیوں سے لیا۔ اور اس میں کچھ تبدیلی اور اضافہ کرنے کے بعد مغرب میں پہنچا یا۔ بعض نکتہ چینیوں نے تو یہ بھی کہہ دیا ہے کہ عرب سائنسی تخیل کے رضاعی باپ تھے۔ جس کے حقیقی باپ یونانی تھے۔ پیشتر اس کے کہ ہم اس مسئلہ پر بحث کریں دو باتیں سمجھنا ضروری ہیں۔ اوّل۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ عرب سائنس کے موجد تھے تو اس سے کیا مراد لی جاتی ہے؟ دوسرے یہ کہ یونانی اور رومی تخیل نے بنی نوع انسان کی ترقی، ارتقا، تہذیب، تمدن، ثقافت اور طبیعی حقیقتوں کی دریافت میں کیا کردار ادا کیا۔ اس کے بعد صحیح طور پر اندازہ لگایا جا سکے گا کہ یہ الزام کہ جو کچھ مسلمانوں نے سیکھا یونانیوں سے سیکھا اور ان کا اپنا حصّہ علوم سائنس میں صفر کے برابر ہے کہاں تک درست ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم یونانی پہلی قوم تھے جنہوں نے اپنے خیالات اور تصنیفات میں عقل سے کام لیا۔ مگر ان کا غور و فکر علم فلسفہ اور علم مابعد الطبیعات تک محدود تھا انسانی تفکر میں ان کا اصل حصّہ صرف علم سیاسیات میں تھا۔ جس میں ارسطو اور افلاطون نے خاص شہرت حاصل کی۔ مگر نہ ہی یونانیوں نے اور نہ ہی اہل رومہ نے کرۂ ارض، آسمان، اجسام یا مادہ کی ہیئت، خصوصیات، رجحانات اور تبدیلیٔ اشکال کی وجہ بذریعہ مشاہدہ، استدلال، تجربہ اور تصدیق دریافت کرنے میں کوئی

خاص دلچسپی لی۔ اور سیاسی فلسفہ میں بھی اب تک اتنی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ کہ وقت کے گزر جانے اور حالات کی تبدیلی سے ان کا اصل تخیّل بے سُود ہو کر رہ گیا ہے۔ یا مسترد کیا جا چکا ہے۔ ان کے صرف موٹے موٹے اصول کام آسکتے ہیں اور وہ بھی حالات حاضرہ کا مناسب جائزہ لے کر۔

آجکل سائنس نے اتنی مختلف اقسام اختیار کر لی ہیں اور وقت، فاصلہ، ناپ تول، حرارت وغیرہ دریافت کرنے کے ایسے آلات سے کام لیا جاتا ہے کہ سائنس نے ایسی وسعت اختیار کر لی ہے کہ شاید ہی انسان کی کوئی ایسی سرگرمی رہ گئی ہو جو سائنس سے متاثر نہ ہوتی ہو مگر سائنس کے شروع میں دو ہی بنیادی طریقے تھے اور یہ دونوں طریقے مسلمان سائنس دانوں نے اپنی تحقیقات میں استعمال کیے۔ ان میں ایک طریقہ استقرا کا تھا اور دوسرا طریقہ استنباط یا استخراج کا۔

طریقہ استقرا کی خصوصیت یہ ہے کہ کوئی اصول یا قاعدہ قائم نہیں کیا جا سکتا تاوقتیکہ اس کو منفرد مگر متشابہ اشیاء افعال یا واقعات کے مشاہدے سے اخذ نہ کیا گیا ہو اور اس قاعدے کے تحت جو نتائج نکالے جائیں ان کو تجربہ سے نہ پرکھا جائے۔ مسلمان مفکروں نے سائنس میں عام طور پر یہی طریقہ اختیار کیا۔ اس کے برعکس یونانیوں کا طریقہ "دریافت استنباط اور استخراج پر منحصر تھا جس کا یہ مطلب ہے کہ وہ ایک مفروضہ کسی دلیل پر بعد مشاہدہ یا بلا مشاہدہ قائم کرتے تھے اور اس کی صداقت پر انحصار کر کے بذریعہ استدلال تحتی نتائج نکالتے تھے مگر ان کو تجربہ سے پرکھنا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ان کا انحصار زیادہ تر استدلال پر ہوتا تھا۔

قرآن میں صاف ہدایت تھی کہ مسلمان آسمان، زمین، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، پر نظر ڈالیں اور سوچیں کہ ان مظاہرِ قدرت سے انہیں کیا حاصل ہوتا ہے۔ شہرۂ آفاق سائنسدان آئن سٹائن نے ایک دفعہ کہا تھا کہ خدا نے کائنات صرف کھیل کود کے لیے پیدا نہیں کی۔ اس نے غالباً قرآن کی وہ آیت نہیں پڑھی تھی جہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"اور ہم نے زمین اور آسمان اور جو کچھ ان میں ہے کھیل تماشے کے لیے پیدا نہیں کیے"۔

(۲۱/۱۶ - ۴۴/۳۸)

یونانی فلسفی

قدیم یونان کا سب سے اوّل نامور فلسفی سقراط ہے مگر اس کی کوئی تصنیف نہیں نہ وہ کسی خاص فلسفہ کے سسٹم کا موجد ہے اور نہ ہی اس نے کسی خاص تخیّل کے طریقہ کا اجرا کیا۔ اس نے صرف لوگوں کو منصف مزاج اور راست گو ہونے کی تلقین کی اور اسی اصول پر زور دیا کہ حقیقت صرف عقل سے دریافت ہو سکتی ہے اور ایسی دریافت کا حق ہر شخص کو حاصل ہے۔ اس پر یہ الزام لگا کر

وہ سرکاری مذہب کے خلاف باتیں کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے فلسفہ کا بنیادی نظریہ تھا کہ کسی عقیدے کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ عقل کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ کیونکہ یہ بات مروجہ عقیدے اور روایات کے خلاف تھی۔ اس کو بطور سزا زہر کا پیالہ پی کر جان دینی پڑی۔ اس کو موت سے بچانے کی تجویز پیش کی گئی۔ مگر اس نے سچائی اور یقین کو موت پر ترجیح دی۔ مرنے سے پہلے اس نے ایک لمبی گفتگو کے درمیان مرنے کے بعد زندگی کے امکان اور معدوم ہونے سے متعلق اپنے خیالات اور ہر دو صورتوں پر اطمینان کا اظہار کیا۔ مرنے کے بعد زندگی پر اطمینان کا اظہار اس نے یہ کہہ کر کیا کہ وہ بے گناہ تھا اور معدوم ہونے پر اس وجہ سے کہ موت کے بعد اس کو کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا۔ صدیوں بعد عیسائی پادریوں نے مشہور سائنسدان گیلی لیو GALILEO کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا۔ مگر وہ کمزور ثابت ہوا اور ایک صریح سائنسی حقیقت سے تائب ہو گیا۔ حالانکہ اس کے مرنے کے بعد اس کا اصول سائنس کی بنیاد بنا۔ مسلمان دانشوروں نے سقراط سے صرف یہی بات حاصل کی کہ عقل استعمال کرو، انصاف کرو اور سچ بولو۔ مگر انہی باتوں پر تو قرآن بھی زور دیتا ہے اور قرآن تو مسلمانوں نے سقراط سے نہیں سیکھا تھا۔

Aflatoon

افلاطون

افلاطون سقراط کا شاگرد تھا اور اس نے اپنے استاد کی بحثوں اور نظریات پر مکمل تبصرہ کیا جس میں کہیں کہیں اس کے اپنے خیالات کی اس نے اپنی کتاب 'ریپبلک' REPUBLIC میں تشریح کی جس کی اشتراکی اور فاشسٹی دنیا اب تک ممنون ہے۔ انسانی زندگی کے متعلق اس کا یہ فلسفہ تھا کہ موت پر اگرچہ انسانی جسم فنا ہو جاتا ہے۔ روح زندہ رہتی ہے اور فنا ناپذیر ہے۔

ارسطو

ارسطو کو فلسفہ کی روح کا زندہ نمونہ سمجھا گیا اور دورِ حاضرہ کی سائنس سے اس کے فلسفی تصور کی قدر ثابت ہوتی ہے۔ اس کی مشہور تصانیف میں ایک کتاب 'پالٹیکس' POLITICS سیاسیات پر ہے جس کی ایک نقل کسی کباڑ خانہ سے ابن رشد کو ملی۔ ابن رشد نے اس پر تبصرہ لکھا جس کی سارے یورپ میں شہرت ہوئی۔ یہ تبصرہ ارسطو کی کتاب کا صرف ترجمہ ہی نہیں بلکہ اس کو ارسطو کی کتاب سے وہی نسبت ہے جو فٹز جیرلڈ FITZGERALD کو عمر خیام کی رباعیات سے۔ یعنی یہ تبصرہ ابن رشد کے اپنے خیالات سے بھرا ہوا ہے۔ جو کچھ اوپر ذکر ہو چکا ہے اس سے ظاہر ہے کہ اگرچہ قدیم یونانیوں کی تصانیف عقل پر مبنی تخیل سے تعلق رکھتی تھیں ان کا سائنس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مسلم مفکروں نے یہ

تصانیف ضرور پڑھیں۔ مگر سوائے ابن رشد، فارابی اور ابن سینا کے کوئی بھی ایسا مسلم مفکر نہیں گزرا جس نے ان یونانی فلاسفروں کا حوالہ بھی دیا ہو۔ ابن رشد، فارابی اور ابن سینا یونانی فلسفہ سے ضرور متاثر ہوئے کیونکہ یہ فلسفہ عقل و دلائل پر مبنی تھا۔ مگر مسلم فلاسفروں نے، جنہوں نے اس فلسفہ پر غور کیا، اس کو اپنے تخیل سے اتنا بدل دیا۔ کہ یونانی فلسفہ کہلانے کی بجائے اس کا نام نیو پلیٹونزم NEO PLATONISM میں تبدیل ہو گیا۔ یعنی وہ یونانی فلسفہ جو عرب فلاسفروں کے تخیل سے ظہور میں آیا۔ یہ درست ہے کہ قدیم یونانی فلسفیوں نے عقل و دلائل کو استعمال کیا۔ مگر ایسا کرنے کی تو مسلمانوں کو قرآن تاکید کرتا تھا۔

ابتدائے اسلام کے زمانہ میں مسلم فلسفی یونانیوں سے مختلف مباحثوں میں مصروف رہے مثلاً یہ مسئلہ کہ قرآن ازلی ہے یا مخلوق، جبر و اختیار کا مسئلہ، روح کا دوام، موت کے بعد جسمانی یا روحانی طور پر زندہ ہونا، خلافت کا تخیل، خلافت کے عہدے کے لیے ضروری اوصاف وغیرہ۔ اسلام کے سائنسی دانشوروں کا زمانہ بعد میں شروع ہوتا ہے۔ جب انہوں نے اپنے مشاہدے، تجربہ اور دلائل استعمال کر کے سائنس کی بنیاد ڈالی۔ یہ زمانہ ۷۰۰ء اور ۱۱۰۰ء کے درمیان کا ہے۔ اس لیے مسلم فلاسفروں کو یونانیوں کے مقروض صرف اس وجہ سے نہیں کہا جا سکتا۔ کہ انہوں نے بھی عقل و دلائل کو اپنے مشاہدے اور تجربہ سے نتائج اخذ کرنے میں استعمال کیا رسول اللہ کے نبوت کے اعلان کے بعد وہ لوگ جو آپ کی رسالت پر ایمان لائے۔ اور جن کو علم حاصل کرنے اور عقل استعمال کرنے کی ہدایت ہوئی تھی قدرتاً اس بات کے متلاشی تھے کہ فطرت کے راز جو ظاہری سطح کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔ دریافت کیے جائیں اس لیے انہوں نے جب سارے عرب اور دیگر ممالک کا بہت بڑا حصہ، جن میں سب سے طاقتور بازنطینہ اور فارس کی سلطنتیں شامل تھیں، اسلامی حکومت میں شامل کر لیا۔ اور اس کے بعد ان کو جنگوں سے فراغت ملی تو ان کی طبیعتیں تجسس اور تفکر کی طرف مائل ہوئیں۔ اور وہ ہر شے اور واقعہ کو زیادہ غور اور باریک نظر سے دیکھنے لگے۔ اگرچہ تاریخ کا یہ عام قانون ہے۔ کہ علمی ترقی، تہذیب، تمدن اور مادی خوشحالی اس وقت شروع ہوتی ہے جب جنگی کشمکشیں ختم ہو کر امن و امان اور صلح کا دور شروع ہوتا ہے اور انسان کو اپنے ماحول اور اپنے آپ پر نظر ڈالنے کی فرصت ملتی ہے تاریخ اسلام کی روشنی میں دیکھا جائے تو اسلامی دور میں ارتقائی مراحل کو یہ طرۂ امتیاز حاصل رہا ہے۔ کہ اگر مسلمانوں میں خانہ جنگی بھی شروع ہوئی لشکر اسلام ملک سے باہر فتوحات میں مصروف رہا یہ دوران جنگ بھی مسلم دانشور، فلسفی اور سائنسدان جنگ سے بے پروا ہو کر اپنی تحقیقات میں منہمک رہے۔ اس لیے یہ ایک تاریخی عجوبہ ہے۔ کہ ساتویں صدی سے شروع ہو کر بارھویں صدی کے اختتام تک اسلام کی تاریخ میں مفکروں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ جو علم الٰہیات، حدیث اور فقہ کے علاوہ علم کی دوسری شاخوں کے مطالعہ اور تحقیق میں مصروف رہا اور ان کے دائرہ تحقیق

میں مادہ، اس کی مختلف صورتیں اور تبدیلیاں، اصول جن پر یہ تبدیلیاں مبنی تھیں، نباتات، جمادات، حیوانات اور خود انسان آ گئے۔ غرضیکہ جاندار اور بیجان اجسام، اجسام فلکی، ان کی حرکت اور تبدیلی اجسام سب ان کے مطالعہ میں شامل تھے۔ ان کو سائنس کا موجد ان کے طریقہ تحقیق اور اس سے نتائج اخذ کرنے کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ ان سے قبل سائنسی طریقہ عام طور پر پرانی تہذیبوں میں رائج نہیں تھا۔ ان کے تخیل و وسعتِ علم کا یہ عالم تھا۔ کہ سوائے اس شغل میں انہماک کے ان کی اور کسی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی تھی۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا۔ کہ علم کی ہر شاخ اور مضمون پر انہوں نے کتابوں کے انبار لگا دیئے۔ جن کا بڑا حصہ عربی سے یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور ان کی تصانیف یورپ میں سولھویں صدی تک یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل رہیں اور یورپ میں مزید حصول علم کے لیے وہ نقطۂ آغاز بنیں۔ ان مقامات پر جہاں پہلے چند مذہبی مکتب تھے بڑی بڑی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ مثلاً بغداد، کوفہ، بصرہ، تخت کسرائے، قاہرہ، اور قرطبہ میں۔ ان یونیورسٹیوں کی اطراف عالم میں یہاں تک دھوم مچی کہ دنیا کے تمام حصوں سے علم کی تلاش میں طلباء جوق در جوق ان میں داخل ہونے لگے۔ کیونکہ سوائے عیسائی گرجاؤں اور خانقاؤں کے جہاں صرف پریشان کن اور پیچ در پیچ مافوق الفطرت مذہبی عقیدوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یورپ میں دنیوی امور کے مطالعہ کی چند فرسودہ درسگاہیں تھیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تمام اسلامی دنیا میں تعلیمی ادارے، یونیورسٹیاں اور جوامع جگہ جگہ قائم ہو گئے۔ بڑے بڑے پبلک اور نجی کتب خانے قائم ہوئے جن میں لکھو کھا کتابیں تھیں۔ مناسب جگہوں پر رصدگاہیں نصب ہوئیں، جو خالص اسلامی ایجاد تھیں اور ان میں صحیح سائنسی آلات رکھے گئے۔ یہ اخلاقی، روحانی، دنیوی، سائنسی اور فلسفی علوم ہسپانیہ سے پیرس، آکسفورڈ اور شمالی اٹلی کی یونیورسٹیوں میں پہنچے اور عام طور پر مغربی تخیل کا جزو بن گئے۔ مسلم مفکروں اور محققوں کے بہت سے نام اتنی بلندی پر پہنچ گئے۔ کہ ان کی تصنیفات کی اہمیت اور خصوصیت کی وجہ سے اور یورپ میں ان کے وسیع مطالعہ سے ان کو یورپی شکل کے نام دے دیئے گئے۔

علم طب

ان محققوں میں ایک علم طب کے ماہر کا نام فخرالدین رازی ہے۔ جس کے متعلق مولانا روم نے فرمایا ہے۔ گر بہ استدلال کارے دیں بدے۔ فخر رازی راز دارِ دیں بدے، علم دین کے ماہر ہونے کے علاوہ وہ علم طب میں ید طولے رکھتے تھے۔ انہوں نے علم ادویات اور طریقۂ علاج کا ایک بڑا مجموعہ تیار کیا جو دس جلدوں پر مشتمل تھا اور جس کی نویں جلد یورپ کی یونیورسٹیوں میں سولھویں صدی

تک پروفیسروں کے لیکچروں کی بنیاد رہی ۔ انہوں نے ۲۰۰ مختلف مضامین پر کتابیں لکھی ہیں اور ان کی ایک تصنیف (الحاوی)، جو بیس جلدوں پر مشتمل ہے علم علاج میں ایک شاہکار ہے ان کی تشخیص اور طریقۂ علاج میں امراض چیچک، خسرہ اور گردے اور مثانہ کی پتھری شامل ہیں اور یہ طریقۂ علاج انیسویں صدی تک یورپ میں جاری رہا ۔ رازی سے بھی بڑا نام طریقہ علاج میں ابی سینا (AVICENNA) کا ہے ۔ ابن سینا کثیر التعداد کتب کے مصنف ہیں اور یہ تصانیف مختلف مضامین پر ہیں کیونکہ ان کو علم ادویہ میں خاص مہارت تھی اس لیے ان کو معالجوں کا شہزادہ سمجھا جاتا تھا ۔ ان کا طریقۂ علاج اب بھی چند مرضوں میں استعمال کیا جاتا ہے ان کی کتاب، اصول علاج، (CANONS OF MEDICINE) یورپ کی یونیورسٹیوں میں دیر تک پڑھائی جاتی رہی ۔ ان کی تصانیف میں ایک اور مشہور کتاب شامل ہے ۔ جس میں ادویہ، تشخیص، علاج، بیماری میں اعضاء کی حالت (PATHOLOGY) کا مفصل تذکرہ ہے ۔ انہوں نے ادویات کی ایک ڈکشنری بھی لکھی جو یونانی طریقۂ علاج میں موجودہ میٹریا میڈیکا MATERIA MEDICA کی ہم پلہ سمجھی جاتی ہے ۔ ابی سینا کیونکہ ادویات کے ماہر تھے اس لیے ان کو معدنیات کی تحقیق کی طرف بھی رغبت تھی اور یہ رغبت ان کو مطالعۂ ارض کی طرف لے گئی ۔

مسلمان حکماء نے انسانی جسم کے اعضاء (PHYSIOLOGY) اور حفظانِ صحت (HYGEINE) کے مطالعہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا ۔ ان کو مختلف قسم کے شربت، عرق، عطر اور جوہر تیار کرنے کا بہت شوق تھا ۔ ان میں سے بہت سے عرق، شربت اور جوہر اب بھی یونانی حکما استعمال کرتے ہیں ۔ انسانی جسم کو بے حس کر دینے کا طریقہ بھی وہ جانتے تھے ۔ اس لیے وہ نہایت مشکل اپریشن بھی کر سکتے تھے ۔ عبدالقاسم (ABDULCASIS) کا نام اب تک ان ناموں میں شامل ہے ۔ جن کا یورپی سرجری میں نمایاں حصہ ہے ۔ علی کے بیس لیکچروں اور تقریروں میں علم الابدان اور جراحی پر ایک مکمل بحث ہے حالانکہ مردوں کو چیرنے پھاڑنے کا کام اسلام میں معیوب سمجھا جاتا ہے حکماء کی فہرست میں کئی نام ہسپانیہ اور شمالی افریقہ کے بھی آتے ہیں ۔ علی بغدادی اور موصل کے اماں نے آشوب چشم کی مفصل تشریح کی ہے اور اس مضمون پر ان کی کتابیں لاطینی زبان میں ترجمہ ہو کر اٹھارویں صدی کے وسط تک یورپی یونیورسٹیوں میں بطور نصاب پڑھائی جاتی رہیں ۔

عباسیوں کے زوال کے بعد سائنسی تحقیقات میں قدرتی طور پر کمی ہو جانا چاہیئے تھی ۔ اس کے برعکس عباسیہ عہد کے بعد تجرباتی علاج (EMPIRIC) میں شاندار اضافہ ہوا ۔ ابن بیطر نے ۱۴۰۰ جڑی بوٹیاں اکٹھی کیں جو مختلف امراض میں مفید ثابت ہوئیں اور زین الدین کا ذخیرہ، جو دس جلدوں پر مشتمل ہے صرف ابن سینا کے (اصول علاج، سے دوسرے درجہ پر ہے ۔ ان تصانیف سے صاف ظاہر ہوتا ہے ۔ کہ

مسلمانوں کے پاس طریقۂ علاج کی اصل سائنس موجود تھی (جس پر تین سو مصنفوں نے چار سو کتابیں لکھیں) جبکہ یورپ میں حکماء کی بجائے پادری مذہبی منتروں سے علاج کرتے تھے۔

علم حیوانات

علم حیوانات پر رسول اللہ کے ایک ہمنام اور ابن جاحظ نے مختلف حیوانات کی عادات، ان کی رہائش گاہوں، نقل مکانی اور زندگی پر مفصل تبصرہ کیا۔ اور ان تبدیلیوں کے جو حیوانات میں نقل مکانی اور ماحول سے واقع ہوتی ہیں، اسباب کی تشریح کی۔

یونانی اطبا

مسلم حکما کے مقابلہ میں قدیم یونانیوں کے حکما کے دو نام نمایاں ہیں۔ ان میں ایک تو بقراط (HIPPOCRATES) کا نام ہے۔ جس کو طب کا باوا آدم کہا جاتا ہے اور بعض ڈاکٹر نسخہ لکھنے سے پہلے جس کی روح کو پکارتے ہیں۔ یہ حکیم مرض کی تشخیص علاماتِ مرض سے کرتا تھا اور تشخیص میں مشاہدہ، مس، سمع، ذائقہ اور بو کو بنیاد بناتا تھا۔ اس کی صرف سات تصانیف ہیں۔ وہ اعصابی امراض، پھیپھڑوں تپ دق اور ملیریا کے علاج میں ماہر بیان کیا جاتا ہے۔ مگر اس کا یہ نظریہ غلط ثابت ہو چکا ہے کہ انسانی جسم کا سیال مادہ یعنی خون، بلغم اور زرد اور سیاہ صفرا چار عناصر یعنی حرارت، سردی، خشکی اور نمی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ ماہر طب تعویذ گنڈے اور ٹونے ٹوٹکے سے علاج کرنے کے خلاف تھا اور اس کو توہم سمجھتا تھا۔ دوسرے یونانی حکیم کا نام جالینوس (GALEN) تھا۔ یہ علم ابدان اور جسم کے اعضاء کے فعل کا ماہر تھا۔ اس کی کئی تصانیف ہیں۔ کیونکہ علم ابدان (ANATOMY) اس نے انسانی جسم کے چیرنے پھاڑنے سے نہیں سیکھا تھا بلکہ اس غرض کے لیے اس نے بندر استعمال کیے تھے۔ اس لیے اس کے نتائج میں کئی ایک نقائص ہیں۔

قارئین کرام اب خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ ان دو قدیمی یونانی حکما اور اس لمبی فہرست کے مشاہیر میں جو مسلمان حکما کی اوپر دی جا چکی ہے۔ کوئی مقابلہ یا موازنہ نہ ہو سکتا ہے۔ کہاں دو نام اور کہاں چار سو تصانیف تین سو مختلف مضامین پر!

تاریخ

تاریخ مسلمانوں کا بچہ ہے اور سفر ان کے لیے ایک قسم کا جذبہ تھا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اسلام کے پہلے ایک ہزار سال میں تاریخ پر سفرناموں کے علاوہ تیرہ سو کتابیں لکھی گئیں۔ اسلامی مورخوں میں اول نام طبری کا ہے جس کی بارہ جلدی کتاب ایک طویل عرصہ کی داستان ہے جو ابتدائی رہنمایاں

قبائل سے شروع ہو کر ۹۱۵ء تک، جو سال خلفائے عباسیہ کے عہد کا ہے، پہنچتی ہے۔ طبری کثیر التعداد کتابوں کا مصنف ہے مگر تاریخ پر جو اس کی تصنیفات ہیں وہ اپنی زباندانی، عبارت کی روانی اور تفصیلات کی وجہ سے زمانہ قبل از تاریخ اور بعد کے زمانہ کی تاریخوں میں بے مثل ہیں۔ طبری ایک قابل اعتبار مورخ سمجھا جاتا ہے اور اس کو بھی تاریخ کا باوا آدم اسی طرح کہتے ہیں جیسے بقراط کو طب کا باوا آدم۔ دوسرے مسلم مورخ مسعودی کو عربوں کا پلائنی (PLINY) کہا جاتا ہے۔ اپنی تاریخ میں وہ تخلیق سے شروع ہو کر ۹۴۷ء کے واقعات تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح ابن اثیر کی تاریخ ۱۲۲۱ء تک دنیا کی تاریخ ہے۔ مسعودی نے اصول حکومت اور اخلاقیات پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور ان دونوں مضامین پر ابن مسکاویہ نے بھی (MASKAWAIH) بحث کی ہے۔ ابن خلدون اسلام کا پہلا معاشی اور اقتصادی حالات اور سیاسیات کا مورخ ہے۔ علاوہ تاریخ دان ہونے کے وہ سیاسیات کا بھی عالم تھا۔ حاکمیت (SOVEREIGNTY) سے متعلق اس نے عوامی مزاج سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ایک خاندان کی موروثی حکومت سے جس کی عادتاً اطاعت ہوتی ہے اور ایک حاکم کی اطاعت سے گروہی امتیاز کھو دیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ آسٹن (AUSTIN) کے نظریہ حاکمیت کے مشابہ ہے۔ ابن خلدون کو بطور مورخ بہت اہمیت حاصل ہے۔ انسائکلوپیڈیا برٹینیکا (ENCYCLOPEDIABRITTANICA) کے ایڈیٹر ابن خلدون کے متعلق لکھتے ہیں۔ وہ ایک سماجی مؤرخ تھا جس کی دھاک انیسویں صدی تک بندھی رہی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ انیسویں صدی تک وہ سب سے بڑا مؤرخ تھا۔ وہ اسلامی تہذیب کا سب سے ممتاز مؤرخ ہے اس سے پہلے کسی نے علم تاریخ کا بطور ایک خاص سائنس، جس میں انسانی زندگی کی ساری سرگرمیوں کی تاریخ ہو، تصوّر نہیں کیا تھا، بعد کے مؤرخوں میں سے فرشتہ کی تاریخ، جس کا موضوع مسلمانوں کی طاقت کا عروج ہے، ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے اس تاریخ کے لکھنے میں اس نے بیس سال صرف کیے اور یہ تاریخ ان واقعات کے متعلق اب بھی سند سمجھی جاتی ہے جو اس میں درج ہیں۔ البیرونی کئی ایک علوم کا ماہر تھا۔ کیونکہ اس نے طبیعات، ریاضی، جغرافیہ اور علم افلاک سے متعلق بھی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ وہ مؤرخ ہونے کے علاوہ ایک سیاح بھی تھا۔ ہندوستان میں آکر وہ بہت عرصہ اس ملک میں سکونت پذیر رہا اور اہل ہند کے حالات اس نے ان سے سنسکرت سیکھ کر بڑی تحقیق کے بعد لکھے ہیں۔ ہندوستان میں وہ پنڈتوں سے ملا اور ہندو رواج، ذات پات اور ان کے مذہب کے متعلق البیرونی کی تصنیف ایک نادر کتاب ہے۔ کیونکہ اس نے کسی قسم کے تعصب کو پاس نہیں پھٹکنے دیا جو کچھ اس نے دیکھا یا سیکھا بلارو رعایت بیان کر دیا۔ اپنی تاریخ میں اس نے قوموں کے رسم و رواج کے بتدریج بدلنے کے اسباب بھی بتائے ہیں۔ سائبیریا اور شمالی یورپ کا پہلا جغرافیہ البیرونی سے منسوب ہے۔ البیرونی نے پچیس بیش قیمت جواہر اور دھاتوں کا وزن مخصوص بھی دریافت کیا۔ اسی طرح خازانی نے بھی دھاتوں کے ملاپ کا مخصوص وزن اور پانی کی کثافت

دریافت کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔

مسلم مؤرخین کے سلسلہ کے مقابلہ میں قدیم یونان کے مؤرخوں میں صرف دو نام ابھرتے ہیں۔ ہومر نے قدیم الایام قصوں کو جو اس کے وقت رائج تھے نظم کیا۔ مگر اس کی شاعری سے کوئی تاریخی واقعہ اخذ کرنا ناممکن ہے۔ البتہ اس کی شاعری بے مثل ہے کچھ حد تک یہی بات پلوٹارک (PLUTARCH) کے متعلق کہی جاسکتی ہے جو ایک جغرافیہ دان ہونے کے علاوہ بہت سی سوانح عمریاں ماضی کے نامور اشخاص کی بیان کرتا ہے جن سے قدیم تاریخ کے کچھ واقعات اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ مگر یہ سب اس دور کے رائج قصوں کہانیوں پر مبنی ہیں۔ یہ ہر دو شاعر حقیقی معنوں میں مؤرخ نہیں کہلائے جاسکتے۔ یونانی مؤرخوں میں جو دو نام خاص طور پر مشہور ہیں ان میں سے ایک (THUCYDIDES) ہے جس کی تصنیف صرف ایک لڑائی کے اکیس سال کے حالات بیان کرتی ہے۔ اگرچہ یہ جنگ جو ایک قسم کی خانہ جنگی تھی، ستائیس سال جاری رہی۔ اس کے سوا تاریخ پر اس کی اور کوئی کتاب نہیں۔ دوسرے مشہور مؤرخ کا نام ہیرو ڈوٹس (HERODOTUS) ہے جس کو تاریخ نویسوں کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ اس نے صرف ایک کتاب، اگرچہ اس کی نو جلدیں ہیں، فارس اور یونان کی لڑائی کے متعلق لکھی ہے جس کو اکثر مؤرخ قابل اعتبار نہیں سمجھتے باقی مؤرخ بازنطینی زمانے کے ہیں اور قدیم یونان سے تعلق نہیں رکھتے۔

حکومت اور سیاست و اخلاق

اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ مسعودی اور ابن مسکاویہ نے اصول حکومت یعنی سیاسیات اور علم الاخلاق پر بھی بحث کی ہے۔ مشہور شخصیت نظام الملک کا سیاست نامہ ایران میں مسلم طرز حکومت پر ایک تبصرہ ہے۔ طوسی کی اخلاق ناصری اور جلال الدین کی اخلاق جلالی اخلاقیات اور اصول سیاست پر ایک مفصل بحث ہے۔

مسئلہ ارتقاء

یہ حیران کن بات ہے کہ ابن مسکاویہ نے ارتقاء انسان پر ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جو موجودہ مسئلہ ارتقاء سے بہت حد تک ملتے جلتے ہیں اس نظریے کے مطابق تخلیق کی ابتدائی منزلوں میں پودوں کو بیج کی ضرورت نہیں تھی اور پودوں اور کیمیاوی اجزا میں کوئی قوت ارادہ نہ تھی۔ پودوں میں قوت حرکت پیدا ہونے سے وہ کئی قسموں میں تقسیم ہو گئے اور ان میں بیج پیدا ہو گیا جس سے انگور کی بیل اور کھجور کے درخت پیدا ہوئے جو ایک طرح سے حیوانی زندگی کی دہلیز تھے۔ اسی مرحلہ پر جنسی امتیاز کا آغاز ہوا۔ حیوانی زندگی میں سب سے پہلا قدم زمین میں جڑ رکھنے سے آزادی تھی اس طرح حشرات الارض، کیڑے، چیونٹیاں،

شہد کی مکھیاں پیدا ہوئیں پھر حرکت کرنے والے اجسام میں قوت احساس پیدا ہوئی۔ جس نے ارادتاً حرکت کرنے کی طاقت پیدا کی مثلاً گھوڑے اور شاہین۔ انسانی زندگی کا آغاز آخر کار بندر سے ہوا۔ گویا بندر انسانی زندگی کی دہلیز ہے یہ نظریہ ایک محقق کا ذاتی نظریہ ہے جو موجودہ نظریے سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ قرآنی مسئلہ تخلیق سے یہ نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے یا نہیں۔ مجھ جیسے کم علم آدمی کے لیے اس کا جواب دینا مشکل ہے۔ جواب قرآن کی متعلقہ آیات کی تعبیر پر منحصر ہے کیونکہ ابن مسکاویہ قرآن کے صریحاً خلاف نہیں جا سکتا تھا۔

یہ بتانا ضروری ہے۔ کہ یہ نظریۂ ارتقاء جس کی تشریح ابن مسکاویہ نے اپنی تصنیف الفوض الاصغر، میں کی ہے۔ مولانا روم کے خیال سے کچھ مطابق رکھتا ہے۔ جو انہوں نے اس طرح پر ظاہر کیا ہے، پہلے انسان بیجان چیزوں میں ظاہر ہوا۔ پھر اس نے پودوں کی شکل اختیار کر لی۔ بہت مدت تک وہ اس نباتاتی حالت میں رہا مگر اس بات سے بے خبر رہا کہ وہ کسی وقت بیجان چیزوں کی صورت میں بھی رہا ہے۔ پھر وہ نباتاتی حالت سے حیوانی حالت میں تبدیل ہوا مگر اپنی سابقہ نباتاتی حالت سے بے خبر رہا سوائے اس کے کہ اس کو خوبصورت پھولوں سے محبت رہی اس کے بعد خالق نے حیوانی حالت سے نکال کر اس کو انسانی صورت میں تبدیل کر دیا اس کو اپنی سابقہ حالتوں سے کوئی آگاہی نہیں اور اس کو اپنی موجودہ روح سے مزید تبدیلی اختیار کرنی پڑے گی۔ (RECONSTRUCTTON

اس سلسلے میں دو قرآنی آیات کا ترجمہ بھی قابل غور ہے ۵۶/۶۰-۶۱۔ ہم نے تم سب کے لیے موت مقرر کی ہے اور ہمیں کوئی ممانعت نہیں کہ ہم تمہاری جگہ تم جیسے اور انسان لے آئیں یا تم کو ہی ایسی شکل میں لے جائیں جس کا تم اس وقت تصور نہیں کر سکتے ۸۴/۱۹۔ اور تم یقیناً ایک منزل سے دوسری منزل تک لیے جاؤ گے آیا یہ آیات کسی ارتقائی عمل کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور ابن مسکویہ اور مولانا روم کے خیال کی تائید کرتی ہیں قاری کی سمجھ پر منحصر ہے۔

جغرافیہ

قدیم یونانیوں کا خیال تھا کہ زمین چپٹی ہے مگر مسلم جغرافیہ دانوں نے خلیفہ مامون کے عہد میں اس کے محیط (گھراؤ) کو سات حصوں میں تقسیم کر کے ناپا اور ادریسی نے تو زمین کا ایک گلوب (کرہ) بھی تیار کیا۔ انگریزی کا لفظ ارتھ (EARTH) عربی کے لفظ ارض سے ہی نکلا ہے۔ جغرافیہ کی سب سے بڑی کتاب نویں صدی کے ایک ایرانی مسلمان ابن خردابہ کی تصنیف ہے اور جغرافیہ کی پہلی ڈکشنری، چھ جلدی مجمع البلدان، ایک مسلم یاقوت بن عبداللہ کی تالیف ہے۔ نصف النہار قائم کرنے کا قاعدہ ابن سعید نے مقرر کیا۔ اس نے مساحت پر بھی ایک کتاب لکھی ہے۔

علم کیمیا

علم کیمیا (CHEMISTRY) کا آغاز مسلمانوں سے ہوتا ہے۔ اس مضمون پر تحقیق کے میدان میں سب سے بڑا نام ابن جابر (TEBR) کا ہے جس نے اس مضمون پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اس نے دو مشہور تیزاب گندھک اور شورہ کے دریافت کیے، سیسے سے ملا ہوا کاربونک ایسڈ کا نمک تیار کیا اور سرمہ اور سنکھیا کو گندھک سے الگ کیا۔ اس کی تصانیف کئی زبانوں میں ترجمہ ہوئیں۔ کھار (ALKALI) چاندی اور شورے سے سنگ جہنم (SILVER NITRATE) تیار کرنا بھی مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ لفظ الکحل تو لفظ ہی عربی ہے اور اس کی کشید کا طریقہ علم کیمیا کو عربوں ہی کا عطیہ ہے۔

علم طبیعیات، ریاضی اور ہیئت

طبیعیات میں شاقول (PENDULUM) مسلمانوں نے ایجاد کیا اور انہوں نے علم بصارت پر بھی مقالے لکھے۔ ابن ہیثم ث گولائی رکھنے والے اور قریب البیضوی آئینہ پر تحقیق کرنے کے لیے مشہور ہے اس کے اخذ کیے ہوئے نتائج راجر بیکن (ROGER BACON) کے ذریعہ مغربی دانشوروں تک پہنچے جنہوں نے ان کو مرکز اشعاع قائم کرنے کے لیے استعمال کیا۔ علم البصارت (OPTICS) پر اس کی کتاب کو کیپلر (KEPLER) نے اپنی تحقیقات میں بطور رہنما استعمال کیا۔ لفظ الجبرا بھی عربی لفظ ہے اور علم الجبر اعرابوں کی ایجاد ہے اسی طرح صفر اور عشاریہ کی علامات کے ذریعہ تعداد کو ظاہر کرنا مسلمانوں کی جدت طبع کا نتیجہ ہے۔ چپٹی اور دائرہ دار اشیاء، مثلث اور مخروطی اجسام کی تراش سے جو شکلیں پیدا ہوتی ہیں مسلمانوں کی تحقیق میں شامل ہیں اور ان کو ظاہر کرنے کے لیے نہایت مشکل اصطلاحی الفاظ تلاش کرنے پڑے مثلاً خط قاطع، قاطع التمام، جیب الزاویہ، جیب التمام خوارزمی نے مثلث کو تین حصوں میں کاٹا اور کرہ دار اور گول اجسام کے ناپنے کا طریقہ بتایا۔ الکندی نے شمسی اور قمری گرہنوں کی تشریح کی ابراہیم، ابوالوفا اور محمد مخروطی اشکال کے علم کے ماہر تھے۔ یونان کے مشہور جغرافیہ اور علم ہیئت کے ماہرین کا خیال تھا کہ کائنات کا مرکز کرۂ ارض ہے جس کے گرد سورج، چاند اور سب ستارے اور سیارے گھومتے ہیں مگر اس مفروضہ کو کوپرنیکس نے غلط ثابت کر دیا۔ طالمی (PTOLEMY) نے لوگارتم (LOGARITHM) کی تختیاں تیار کی تھیں مگر عبداللہ خوارزمی نے محنت شاقہ کے بعد ان کی تصحیح کی۔ مشہور شاعر عمر خیام بھی علم ریاضی میں دسترس رکھتا تھا۔ اس نے جلالی قلندرہ تیار کیا جس کی صحت پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کو علم الجبرا اور مساحت پر بھی عبور تھا اس نے مکعبی مساوات کی تیرہ شکلیں قائم کیں۔ جوتش نہ کوئی سائنس ہے اور نہ کوئی فن۔ یہ خالصتاً توہم ہے یا مجنونہ قیاس آرائی اگرچہ رسول اللہ نے

اپنے بیٹے ابراہیم کی وفات پر، جو اس وقت واقع ہوئی جب سورج گرہن ہیں تھا فرمایا تھا کہ سورج اور چاند اللہ کی دو نشانیاں ہیں اور وہ کسی کی موت پر نہیں گہناتے اور نہ ہی کسی انسان کی موت ان پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ پھر بھی قبل از اسلام نجومیوں کے سلسلہ کو کچھ لوگوں نے جو ایمان بھی لے آئے تھے، جاری رکھا مگر انہوں نے اس علم یا وہم میں کوئی نئی بات ایزاد نہیں کی۔ وجہ یہ تھی کہ سائنس جوتش کی بنیاد نہیں تھی مگر اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ علم جوتش سے مسلمانوں کی توجہ اجسام فلکی اور علم ہیئت کے مطالعہ کی طرف رجوع ہوئی اصطرلاب کا آلہ جو ہر قسم کی بلندی ناپ سکتا ہے یہاں تک کہ اجسام فلکی کی بلندی بھی اس سے معلوم ہو سکتی ہے، ابراہیم الفظری کی ایجاد ہے اس آلہ کے اصول کی مزید تشریح اور کچھ ترمیم علی بن عیسیٰ نیریزی اور یحییٰ نے کی۔ اسلام کا سب سے بڑا ماہر فلکیات، البطنی (ALBETEGNUS) تھا اس کی تصانیف یورپ میں ترجمہ ہو کر بہت مقبول ہوئیں۔ اسی طرح خوارزمی کی علم ہیئت کی ثلاثی الزاویہ تختیاں بھی لاطینی زبان میں ترجمہ ہوئیں اور ان تختیوں میں پہلی دفعہ خط مملس (TANGENT) کا لفظ استعمال ہوا۔ حباش کا نام سورج گرہن کا سبب دریافت کرنے، سورج کی بلندی سے وقت کا اندازہ لگانے اور سایہ سے خطِ مملس مقرر کرنے کی وجہ سے مشہور ہے۔ مامون کے عہد کا علم ہیئت کا سب سے بڑا ماہر الفرغانی (ALFRAGAMUS) تھا اس کی کتاب "علم ہیئت کے عناصر" لاطینی زبان میں ترجمہ ہوئی وہ حرکت تقویمیہ کے اصول کا قائل تھا جو اس کے خیال کے مطابق نہ صرف ستاروں بلکہ سیاروں پر بھی حاوی ہے۔

جعفر کا بھی یورپی مصنف اکثر حوالہ دیتے ہیں اس نے سمندر کے جوار بھاٹا کی تشریح کی۔ ال فجندی نے اجسام فلکی کے مشاہدے کے بعد گرہن کے ترچھاپن کا سبب معلوم کیا اور گول مثلثوں کے پانچ اصول وضع کیے۔ ال قبیصی (ALCABITIYS) اگرچہ نجومی تھا اس نے علم ہیئت پر بھی ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام ستاروں کے مطالعہ کا مقدمہ ہے اور جس کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا۔ زرق علی نے جو قرطبہ کا سب سے ماہر ہیئت دان تھا ستاروں کی حرکت کے حوالہ سے اس بات کی وجہ بتائی کہ کب اور کیوں سورج زمین سے زیادہ سے زیادہ دور رہتا ہے۔ مسلمانوں نے علم ریاضی میں اہل یونان سے سوائے اقلیدس اور فیثا غورث کے کچھ حاصل نہیں کیا۔ باقی تمام علم ریاضی، جس میں الجبرا، مثلث اور مخروطی اشکال کا علم شامل ہے، ان کی اپنی تحقیقات پر مبنی ہے۔ جس میں یونانی یا رومی غیر اہل کتاب اور بت پرستوں کے علم کی ذرا بھی ملاوٹ نہیں۔ اس لیے یہ ایک قسم کی ناشکر گزاری ہے جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تمام علمی ایجادات مسلمانوں نے یونانی ملحدوں سے حاصل کیں اور ان علوم کا حاصل کرنا عربوں کے مشاہدے قیاس اور تجربہ سے تصدیق یا تحقیق کا نتیجہ نہیں تھا چند سائنسوں میں غلط نتیجہ کا امکان ہی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً طبیعیات، علم کیمیا، ریاضی اور علم ہیئت میں ان میں سے

کسی کا بھی مذہب کے ساتھ تصادم نہیں ہو سکتا کیونکہ سائنس کا میدان علیحدہ ہے اور مذہب کا علیحدہ
مذکورہ بالا سائنسوں کے نتائج اس قدر صحیح ہوتے ہیں کہ مادی دنیا میں آنے والے واقعات کے متعلق
ایسی صحیح پیش گوئی ہو سکتی ہے کہ اس میں ایک منٹ کا بھی فرق نہیں پڑ سکتا۔ ان سائنسوں کے متعلق
امام غزالی صحیح طور پر فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ بات سمجھتے ہوئے بھی کہ جو صداقت بذریعہ وحی حاصل ہوتی
ہے اس میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی جو سائنس کے خلاف ہو یا اس کی تصدیق کرتی ہو، خیال کرتا ہے
کہ اس کے نظریے کا تحفظ ریاضی یا سائنس کے انکار سے ہی ہو سکتا ہے، وہ ایک بڑے جرم کا مرتکب
ہوتا ہے ان سائنسوں میں کوئی ایسی بات نہیں جو مذہب کی تکذیب کرتی ہو۔ اگر پڑھا لکھا غیر مسلم یہ
یقین رکھتا ہے کہ اسلام جہالت پر مبنی ہے تو اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ ایسے یقین کے اظہار سے
اس کے اپنے فلسفہ کی قدر بڑھے اور اسلام سے نفرت (THEFAITHAND PRACTICE OF
AL GHAZALI, 1953 Pages 34-35)

نباتات

قرطبہ، فیض، قاہرہ اور بغداد علم نباتات کے مرکز تھے جہاں طالب علموں نے بہت سی جڑی
بوٹیاں اکٹھی کیں جو بعض امراض کے علاج میں استعمال ہوتی تھیں۔ البیرونی ہندوستان چالیس برس رہا اور
اس عرصہ میں علاوہ دیگر علوم کے اس نے علم نباتات اور کیمیا کا مطالعہ کیا۔ ابن بیطر مسلمانوں میں سب
سے ممتاز اور قابل علم نباتات کا ماہر تھا۔

قدرتی قوتوں کا استعمال

مسلمانوں نے قدرتی قوتوں سے کام لے کر بہت سی صنعتیں ایجاد کیں۔ کپڑا بننے کا فن اور کاغذ کی
ساخت (کاغذ پر سب سے پرانی کتاب عربی میں ہے)، عربوں ہی کا کارنامہ ہے۔ انہوں نے گھنٹے،
گھڑیال، پن چکیاں اور ہوا چکیاں ایجاد کیں۔ دیگر آلات کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

تجارت اور جہاز رانی

عربوں کا ایک محبوب مشغلہ اور روزی کمانے کا ذریعہ تجارت اور صنعت تھی اور چند مذہبی
احکام کے تابع دیانتداری سے تجارت میں مصروف ہونا ان میں ایک قابلِ عزت پیشہ سمجھا جاتا تھا۔
خود نبی اکرم ایک دولتمند تاجرہ کے منتظم رہے تھے۔ بہت سے صحابہ تجارت کرتے تھے۔ ابتدائے
اسلام سے مسلم عربوں کا دور دراز ملکوں سے تجارتی تعلق تھا۔ اس تجارت سے فن جہاز رانی میں

ترقی ہوئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں وہ بحیرہ روم و بحر احمر کے بندرگاہوں کے، جو انہوں نے خود تعمیر کیے تھے، مالک اور قابض بن گئے۔ عرب جہازران بحر ہند، بحر الکاہل اور بحر ظلمات تک جہاز لے جاتے تھے۔ موجودہ انگریزی لفظ ایڈمیرل عربی کے لفظ امیر البحر سے ہی نکلا ہے۔ ان مقامات کی فتح جو بحر احمر اور بحیرہ روم کے ساحلوں پر واقع تھے مسلم بیڑوں کی ہی کارکردگی تھی۔ معاویہ کا بیڑا اتنا مضبوط تھا کہ اس نے ۶۵۵ء میں بازنطینی بیڑے کو شکست دی اور باربروسا کے اٹلی کے ساحلوں پر کارہائے نمایاں سے تاریخ کا ہر ایک طالب علم واقف ہے۔ ترکی کا بیڑہ اپنے وقت میں سب سے طاقتور بیڑہ تھا جو فتح قسطنطنیہ کا باعث بنا۔

صنعت زراعت اور باغبانی

عرب رنگوں، دھاتوں اور چمڑہ کے استعمال سے بخوبی واقف تھے۔ گنے سے وہ شکر نکالتے تھے اور اس کو صاف کرنے کا طریقہ بھی وہ جانتے تھے وہ کھیتی باڑی اور باغبانی کے بھی ماہر تھے۔ یورپ میں بہت سے پھول پودے انہوں نے ہی درآمد کیے۔

ایٹم

یہ خیال غلط ہے کہ ایٹم کی دریافت حال ہی میں ہوئی ہے۔ عرب ایٹم کا ایک صاف تصور رکھتے تھے۔ انسائکلوپیڈیا برٹینیکا (ENCYCLOPEDIABRITTANICA) کے مطابق مکتب العشریہ کا ایٹم کا تصور موجودہ تصور سے ملتا جلتا تھا۔ اس مکتب کا خیال تھا کہ ایٹم مادہ کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ ہے جو اتنا ٹھوس ہے کہ اس میں سے کوئی شے نہیں گزر سکتی۔ اس کی نہ کوئی شکل ہے اور نہ کوئی جسامت البتہ اس کا محل یا وقوع ضرور ہے۔ العشری کے اور موجودہ نظریہ میں فرق صرف اتنا ہے کہ حالیہ تحقیقات کے مطابق ایٹم ناقابل گزر نہیں وہ ایک مرکب شے ہے جس کے اجزا منتشر کیے جا سکتے ہیں۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اس سے مسلمانان ازمنہ وسطےٰ کے خیالات اور مضامین کی وسعت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے مختلف علوم خاص طور پر علم سائنس میں کتنی ترقی کی تھی۔ مغرب کے دانشور اس ترقی سے بخوبی واقف ہیں اور اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ ایک بین الاقوامی مباحثہ میں بنیج ایں فارس جارج سٹرٹن کی تصنیف (THE TIMESOF ALMASUDI) سے مندرجہ ذیل اقتباس دیتے ہیں۔

بنی نوع انسان کا کار عظیم مسلمانوں نے مکمل کیا۔ عظیم فلسفی الفارابی، ابو کامل، ابراہیم ابن سینا مسلم تھے۔ سب سے بڑا جغرافیہ دان مجمع العلوم کا مصنف مسعودی مسلم تھا۔ سب سے بڑا مورخ الطبری مسلم تھا اور پروفیسر شستری اپنی کتاب (OUTLINESOFISLAMICCULTURE) میں پندرہ صفحوں پر

مسلمانوں کے علم تاریخ، علم جغرافیہ، سائنس، علم طب، علم ادویہ، علم ہیئت اور علم ریاضی کا تعریف کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ ہسٹوریز ہسٹری آف دی ورلڈ (HISTORIANS HISTORY OF THE WORLD) تاریخ کی ایک شہرۂ آفاق کتاب ہے۔ دیکھیے مسلمانوں کے متعلق یہ کتاب کیا کہتی ہے۔ موجودہ کتاب کے لکھنے میں میرا ایک مرکزی نقطۂ نظر ہے اور وہ نقطہ تاریخ کی اس کتاب میں ایک فقرہ میں ادا کر دیا گیا ہے اور وہ فقرہ یہ ہے "اگر عربوں کو تاریخ عالم سے حذف کر دیا جائے تو یورپ میں احیائے علوم کا زمانہ صدیوں پیچھے پڑ جاتا ہے" اگر یورپ کے احیاء العلوم کے زمانہ اور زمانہ حال (MODERN AGE) میں کوئی تعلق ہے تو صاف ظاہر ہے کہ زمانہ حال کی تہذیب علمی ترقی اور سائنس کی مدد سے ایجادات اور صنعتیات کا دور مسلمانوں کے تخیل کا سلسلہ ہے۔ اس بحث کو طول دینا غیر ضروری ہے۔ کیونکہ تسلیم شدہ امر کو بار بار دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس مضمون کا مطالعہ ایک حساس مسلمان کے لیے، جب وہ مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھتا ہے، باعث افسوس ہوتا ہے آج کل کا مسلمان اتنا سست، کاہل اور بے پروا ہے اور اتنی مشکلات میں گھرا ہوا ہے کہ وہ اس کہانی کے سرے کو جو مسلمانوں نے قرون وسطیٰ میں چھوڑا دوبارہ پکڑنے کے قابل نہیں تاکہ وہ اس کہانی کو آگے لے جا سکے مگر افسوس سے ماننا پڑتا ہے کہ گذشتہ آٹھ سو سالوں میں کسی ایسے رجحان کے آثار نہیں پائے جاتے جو مسلمانوں کو دوسری ترقی یافتہ قوموں کے شانہ بشانہ کھڑا کر سکے۔

اس بات کے مطالعہ سے دو نتائج صریحاً نکلتے ہیں اول کہ عرب سائنس کے موجد تھے اور انہوں نے قدیم یونانیوں کے علوم سے کچھ حاصل نہیں کیا۔ کیونکہ یونانی تخیل میں سائنس شامل نہیں تھی اگرچہ ارسطو سے علم منطق کا آغاز ضرور ہوتا ہے دوم کہ یورپ کی موجودہ ترقی سائنس پر منحصر ہے اور سائنسی طریقہ یورپ نے مسلمانوں سے حاصل کیا۔ دنیا کے مشہور مؤرخین کی کتاب سے ابھی حوالہ دیا جا چکا ہے کہ اگر عربوں کو دنیا کی تاریخ سے حذف .. .. کر دیا جائے تو تجدید علوم (RENASSANCE) کا زمانہ صدیوں تک رک جاتا ہے اور اگر تجدید علوم کا زمانہ عربوں کی سائنسدانی کا نتیجہ ہے تو اس زمانے کے التوا سے مغربی تہذیب کا آغاز بھی صدیوں سے ملتوی ہو جاتا ہے اس بات کا ثبوت ایک اور مغربی مؤرخ بری فالٹ (BRIFFAULT) کی تصنیف (THE MAKING OF HISTORY) سے بھی ملتا ہے۔ اس کتاب کا متعلقہ حصہ اختصار کے ساتھ ذیل میں دیا جاتا ہے۔ راجر بیکن کے نام کے ساتھ (جس نے سپین کی ایک یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور بعد میں اکسفورڈ یونیورسٹی میں) تجرباتی طریقہ سائنس منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ بیکن ان شخصوں میں سے تھا جن کو مسلم سائنس کے قاصد کہا جا سکتا ہے اس حقیقت پر شک کرنا کہ اصل سائنس کی ابتدا اُن سے ہوئی یورپی تہذیب کے ماخذ کے متعلق ایک گمراہ کن بات ہے عربوں کا سائنس کے نتائج تجربہ سے حاصل کرنا اور اس طریقہ دریافت کو اختیار کرنا

یورپ میں بیکن کے وقت ایک مسلمہ حقیقت تھی۔ سائنس عرب کی تہذیب کا دور حاضرہ کو ایک اہم عطیہ ہے۔ مغربی تہذیب کی نشو ونما کا کوئی پہلو نہیں ہے جس پر اسلامی تہذیب کا فیصلہ کن اثر نہیں پڑا موجودہ سائنس عرب تہذیب کی بہت ممنون ہے۔ کیونکہ سائنس اسی تہذیب کی پیداوار ہے۔ یورپ میں سائنس کے اجزاء نئے طریقہ تحقیق، مشاہدے، ناپنے اور ریاضی کی ایسے طریقہ پر ترقی، جس سے یونانی ناواقف تھے، مسلمانوں کی وجہ سے ہوئی۔ یہ طریقہ یورپی دنیا میں عربوں نے پہنچایا،" اور یونانی طریقہ سے بالکل مختلف تھا اس سلسلہ میں ایک اور بات یاد رکھنی ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ یورپ میں احیاء علوم (RENASSANCE) کا زمانہ چودھویں صدی کے وسط سے شروع ہو کر ستارہویں صدی تک چلتا ہے۔ قسطنطنیہ محمد ثانی نے ۱۴۵۳ء میں فتح کیا اور یونانی علم و دانش کا یورپ پر اثر اس وقت پڑنا شروع ہوا۔ جب فتح قسطنطنیہ کے بعد یونانی دانشور وہاں سے بھاگ کر یورپ کے دوسرے حصوں میں آباد ہوئے مگر احیائے علوم کا زمانہ تو یورپ سے چودہویں صدی کے وسط سے شروع ہو چکا تھا جب یورپ میں یونانی دانشوروں کا وجود تک نہیں تھا اور تمام علوم پر مسلمانوں کا غلبہ تھا۔ اس واسطے ہسٹوریننز ہسٹری آف دی ورلڈ (HISTORIANSHISTORYOFTHE WORLD) کا یہ نظریہ بالکل درست ہے کہ یورپ کے احیائے علوم کے زمانہ کے اجرا کا باعث مسلمانوں کے علوم تھے۔ یورپ کے احیا علوم کی تاریخ میں اہل رومہ کا بھی ذکر آتا ہے مگر اہل رومہ روحانی لوگ نہیں تھے بلکہ ایک عملی قوم تھے۔ کیونکہ اہل رومہ جنگوں میں مصروف رہے جن میں خانہ جنگی بھی شامل ہے اس لیے ان میں ہمیشہ سائنسدانوں، فلسفیوں اور علم کی دوسری شاخوں کا فقدان رہا۔ نتیجتاً اسلام نے رومیوں سے کچھ بھی ادھار نہیں لیا۔ رومی فن تعمیر کے ماہر تھے مگر مسلمانوں کا فن تعمیر ان سے بالکل مختلف رہا۔ مختصراً یہ کہنا کافی ہوگا کہ یورپ نے بھی اہل رومہ سے سوائے سڑکوں، عمارتوں، لاطینی زبان اور ان کے مخصوص قانون کے کچھ حاصل نہیں کیا۔ غرضیکہ کوئی مؤرخ دیانتداری سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ مسلمانوں نے قدیم یونانیوں یا اہل رومہ سے سائنس یا فلسفہ میں کچھ سیکھا یا کہ دور حاضرہ کا سائنسی علم، یونانیوں یا اہل رومہ کے علم پر مبنی ہے اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ یورپ میں موجودہ سائنسی دور کا آغاز مسلمانوں کے سائنسی طریقۂ دریافت سے ہوا جس میں قدیم یونان کا کوئی حصہ نہیں بلکہ انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا کے ایڈیٹر تو یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے یونانی فلسفہ پر غلبہ پا کر اسے مسترد کر دیا۔

مسلمانوں کے سائنس کے مؤجد ہونے سے دو نتیجے نکلے ہیں۔ اوّل کہ یہ علم سائنس یورپ میں ستارہویں صدی تک جاری رہا اور روم کہ عربوں کے علوم سے ازمنۂ وسطےٰ کا اندھیرا چھٹ گیا اور یورپ میں احیائے علوم کا زمانہ شروع ہوا جو کہ عیسائیت کی مذہبی اصلاحات کا باعث بنا اس طرح

یورپ کے دورِ حاضرہ کی ترقیات کا مسلمانوں کے علم سائنس سے بلاواسطہ تعلق ہے۔

یہ باب اسلام کے دو مشہور فلسفیوں کے ذکر کے بغیر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے پہلا فلاسفر الغزالی (ALGAZAL) ہے جس کا کسی پچھلے باب میں مفصّل ذکر کیا جا چکا ہے۔ الغزالی مختلف مضامین پر کثیر التعداد کتابوں کا مصنف ہے اور اس کے تخیل کا اثر یورپ پر ماضی میں ہی نہیں رہا اب بھی ہے۔ یورپ میں یہ اثر رومن مارٹر کے ذریعہ آہستہ آہستہ ظاہر ہونا شروع ہوا اور مغرب میں اس کو سب سے پہلے طامس اکیوناس (THOMASAUINAS) نے قبول کیا اور بعد میں پاسکل (PASCAL) نے غزالی سائنس اور مذہب میں کوئی مخالفت نہیں پاتا تھا۔ بلکہ اس کا قول تھا کہ وہ شخص مجرم ہے۔ جو سائنس اور مذہب میں تصادم پیدا کرتا ہے جبکہ قرآن میں کوئی ایسی بات نہیں جو سائنس کے خلاف ہو۔ اسلام کے دوسرے فلاسفر کا نام، جس نے یورپ کو غزالی سے بھی زیادہ متاثر کیا ابن رشد (AVERROES) ہے ابن رشد ہسپانیہ میں پیدا ہوا۔ اس کی مشہور تصنیف ارسطو پر تبصرہ ہے۔ جو ارسطو کی تصنیف کا ترجمہ ہی نہیں بلکہ اس کے نظریے پر نکتہ چینی بھی ہے۔ اس کے فلسفہ کی تعلیم کو پہلے پیرس میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ بعد میں دوسری یونیورسٹیوں میں اس کے نام کی شہرت ہوئی وہ سائنس کو مذہب سے علیحدہ رکھنا چاہتا تھا۔ اور دونوں میں کوئی تصادم نہیں پاتا تھا۔ بلکہ اس نے مذہب کو سائنس سے اونچے درجہ پر رکھا ہر دو کا دائرہ مقرر کیا۔ تاکہ ان میں تصادم کا امکان ہی نہ رہے۔ یہ ایک آزاد خیال مفکر تھا اور ۱۱۹۸ء میں اس کی وفات کے بعد اسلام میں آزادئ خیال اور دانشوروں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ غزالی اور ابن رشد کے پایہ کا مفکر ان کی وفات کے بعد اب تک اسلام میں پیدا نہیں ہوا۔ مفکروں کی جگہ تقلید پسندوں اور صوفیوں نے لے لی۔

ہسپانیہ میں مسلمانوں کے داخل ہونے اور اس کے فتح کرنے کے بعد مسلمانوں کی تاریخ یورپ کی تاریخ سے مل جاتی ہے۔ ابن رشد کے بعد سائنسی تخیل میں تعطل کے اور بھی اسباب ہیں۔ موجودہ عیسائی عقیدوں کی بنیاد حضرت عیسیٰ کی وفات کے بیس سال بعد سینٹ پال نے ڈالی جس نے حضرت عیسےٰ کو اپنی زندگی میں دیکھا بھی نہ تھا۔ صلیبی جنگیں گیارہویں صدی میں شروع ہو کر تیرہویں صدی تک جاری رہیں۔ اور اس دو سو سال کے عرصہ میں انسانی دماغ کو عیسائیت نے مفلوج بنائے رکھا۔ تجدید علوم کا زمانہ یورپ میں پندرہویں صدی میں شروع ہوا جب مسلمان دانشوروں کی تصانیف یورپ میں عام لوگ بھی پڑھتے تھے اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی وہ شامل تھیں۔ سولہویں صدی میں عیسائیوں میں فرقہ بندی شروع ہو گئی کیونکہ عیسائی عقائد کو جو معجزانہ اور فوق الفطرت پہلو رکھتے تھے شک کی نظر سے دیکھا جانے لگا اور لوتھر (LUTHER) اور وکلف (WYCLIFFE) نے پروٹسٹنٹ فرقہ کی بنیاد رکھی اس سے پہلے پاپائے روم عیسائی عقیدے کا محافظ خیال کیا جاتا تھا اور اس کی عیسائیت نے یورپ کی سیاست کو لونڈی سمجھ رکھا

تھا۔ پروٹسٹنٹ فرقہ نے پوپ سے بغاوت کی اور مذہبی اصلاحات کا دور شروع ہوا۔ مگر پاپائے روم نے اپنے خلاف بغاوت کو عیسائیت کے خلاف بغاوت سمجھا اس لیے ایک جور وستم کا دور شروع ہوا۔ پاپائے روم نے مذہبی عدالتیں قائم کیں اور جو لوگ نئے فرقے میں شامل ہو گئے تھے یا دلیلوں کے ذریعے پاپائے روم کے عقیدے کو غلط سمجھتے تھے یا اپنی سائنسی تحقیق سے عیسائیت یا بائبل کے کسی مسئلہ پر شک رکھتے تھے تختہ دار پر چڑھنے لگے یا زندہ جلا دیئے جانے لگے۔ اس طرح عیسائیت یسوع ناصری کی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات کو نظر انداز کر کے پادریوں کے پیچ در پیچ مسئلوں کی گتھی بن گئی جس کا انسانی عمل سے کوئی تعلق نہ تھا اور مذہبی رسوم و رواج نے اخلاقی اقدار، عمل اور تعقل کو ایک عرصہ تک دبائے رکھا۔ بالآخر ترقی پذیر طبقوں اور پوپ کی عیسائیت میں دشمنی ہو گئی جس کا انسانی دماغ پر یہ اثر پڑا کہ توہم کی بیڑیوں سے آزاد ہو کر آزاد خیال طبقے نے ایک معقول المعنی عیسائیت کی تلاش شروع کی اور یہ تلاش آخر کار خونریزی پر منتج ہوئی۔
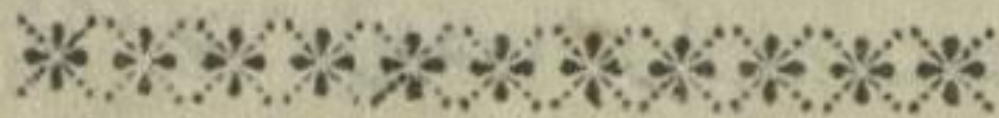
باب ۱۳

دورِ حاضرہ اور اسلام

جن مفکروں نے نظرِ عمیق سے اسلام کا بطور مذہبی اور دنیوی طرزِ زندگی کا مطالعہ کیا ہے اور دورِ حاضرہ کی تہذیب کی تاریخ اور تعمیر اور اس کے رجحانات کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا ہے ان کے دلوں میں ایک سوال جو گذشتہ تین ربع صدی سے بار بار اٹھتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آیا اسلام موجودہ معاشرے کی تمام برائیوں اور بداعمالیوں کا واحد علاج ہے یا کہ اسلام جس طرح کہ آج کل سمجھا جاتا ہے اور اس کے احکام کی جس طرح پیروی کی جاتی ہے یا ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے ایک بے اثر نظام ہو کر رہ گیا ہے اور زمانہ حاضرہ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ بلکہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے سدِ راہ ہے۔ اس لئے حالات زمانہ کے مطابق مگر اسلام کے بنیادی اصولوں کے اندر رہ کر اس پر بذریعہ اجتہاد نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ یہ سوال اسلام کے لیے نہایت اہم ہی نہیں بلکہ ایک ادق اور پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے۔ اور دوسرے سوالوں کے ساتھ جو اتنے ہی ادق ہیں ملا جلا ہوا ہے۔

اس سوال کا جواب اسی صورت میں دیا جا سکتا ہے کہ اسلام کی ایک واضح تعریف کی جائے اسی بحث میں فلسفہ کے بہت سے اصلاحی الفاظ آتے ہیں جس کی تشریح مناسب موقع پر کی جائے گی۔ اسلام کے عام معنی امن، صلح، اور خدا کی مرضی کے سامنے بے چون وچراں جھکنا ہے۔ مگر اصلاحی معنوں میں خدا کی واحدنیت اور جو پیغامات خدا نے رسول مقبولؐ کو یکے بعد دیگرے پہنچائے، جس کا مجموعہ قرآن ہے پر ایمان لانا ہے۔

اسلام میں شروع ہی سے مسلم کی تعریف پر اختلاف رہا ہے اور یہی اختلاف مختلف فرقوں کا باعث بنا مگر موجودہ بحث کے لئے اور ناگوار بحث سے بچنے کے لئے میں اسلام کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہوں جو برِ صغیر کی تقسیم سے پہلے عدالت ہائے عالیہ بار بار دہراتی رہی ہیں اور وہ یہ ہے کہ مسلمان وہ شخص ہے جو اللہ کی واحدنیت اور حضرت محمدؐ کو اللہ کا رسول سمجھنے کا اقرار کرتا ہے۔

دورِ حاضرہ کا تجزیہ انسانی معاشرے کی یہ صورت پیش کرتا ہے کہ دو بڑے ملک چین اور روس

اور یورپ کے چند جنوب مشرقی ملک، جن کی مجموعی آبادی دنیا کا نصف حصّہ بنتی ہے، یا تو دہریت کے قائل ہیں یا لاادریت تخیّل رکھتے ہیں اور باقی دنیا سوائے ایک دو چھوٹے ممالک کے غیر دینی نظام کی قائل ہے۔ ان ملکوں میں قومی نظریہ کا ایک شدید احساس ہے۔ سائنس اور صنعت و حرفت کے علم نے اتنی تیزی سے ترقی کی ہے کہ کیپلر (KEPLER) سے شروع ہو کر جس نے راجر بیکن جو خود ابن حزم کا معتقد تھا، کے ذریعہ اس کی تحقیقات کے نتیجہ کو اپنا کر مزید تحقیقات جاری رکھیں اور تحقیقات کا یہ سلسلہ کوپرنیکس (COPERNICUS) گیلیلیو (GALILEO) نیوٹن (NEWTON) ڈارون (DARWIN) اور آئن سٹین وغیرہ کے ذریعہ اتنے عروج پر پہنچ چکا ہے کہ انسان نے چاند پر قدم رکھے مشتری اور اس کے عقب کی خلا کا مطالعہ کیا اور حیرت میں ڈالنے والا ایسا اسلحہ تیار کر لیا ہے جس سے دنیا کی تمام نسلِ انسانی چند گھنٹوں میں تباہ کی جا سکتی ہے۔ اور علمی طور پر انسان آج اس قابل ہے کہ تمام دنیا کو ریزہ ریزہ کر کے کسی خاک یا بادل یا صرف برقی لہروں میں تبدیل کر سکے۔ مگر کوئی سائنسدان یا کوئی فلسفی اس بات کے متعلق کوئی بوجھ بھی پیش نہیں کر سکتا کہ یہ وسیع کائنات کیسے ظہور میں آئی۔ اس کی وسعت کتنی ہے؟ یہ محدود ہے یا لامحدود! اور اس کا آغاز کیسے ہوا اور انجام کیا ہے اور آیا اس سارے عالم اور جو اس میں مخلوق ہے کا کیا مقصد ہے؟ کوئی مقصد ہے بھی یا نہیں۔ وقت اور خلا کی کوئی ابتدا یا انتہا ہے بھی یا نہیں۔ سائنسدانوں کی اس سے کیا مراد ہے کہ کائنات ایک معیّن شے ہے مگر ہے لامحدود۔ (BOUNDLESS)

اخلاقی اقدار میں بھی جو وقت گزرنے کے باوجود اب تک چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم تھیں، تبدیلی کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ اور یہ ایک قدرتی امر ہے کیونکہ عالم میں ہر شے ہر وقت اپنی ہیئت میں کچھ نہ کچھ تبدیلی لاتی ہے اور کوئی بھی شے ساکن نہیں ع "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں" (اقبالؒ) اخلاقی اقدار کی کوئی تعداد مقرر نہیں۔ کون و زمان اور انسانی سرگرمیوں میں اضافے کی بدولت ان اقدار میں اضافہ بھی ہوتا ہے، ترمیم اور کمی بھی، اور بعض اقدار اقتصادی تقاضوں سے متاثر ہو کر بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں جن کی خلاف ورزی یا ان سے چشم پوشی اعلانیہ کی جاتی ہے۔

خود انسانی زندگی کے مقصد کی مختلف اور اعلانیہ تعبیریں ہو رہی ہیں

اسی طرح تاریخ کے موجودہ دور میں اسلام اور دیگر مذاہب ظاہرہ طور پر بے محل نظر آتے ہیں۔ کیونکہ اسلام کا بنیادی اصول توحید اور وحی ہے مگر موجودہ دنیا جس میں سارے ترقی یافتہ ممالک شامل ہیں ایسے سارے معاملات اور سرگرمیوں میں اپنی عقل و دماغ کے تابع رہ کر مشغول ہیں اور کسی وحی یا رفیع ہستی کے خیال کو اپنے ذہن میں جگہ نہیں دیتے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سارے ممالک ایک غیر دینی نظام کے قائل

لہ حال ہی میں سائنسدانوں نے اکیس کروڑ میل دور مریخ پر ایک ایسا آلہ اتارا ہے جو متواتر زمین پر اس سرخ سیارے کی تصویریں بھیج رہا ہے۔ تاکہ سائنسدان ان کی مدد سے معمۂ خلق و کائنات کا حل تلاش کر سکیں۔

ہیں۔ اس بحث میں انگریزی کا ایک لفظ سیکولر (SECULAR) بار بار استعمال ہوتا ہے مگر اس کے غلط معنی لئے جاتے ہیں۔ سیکولر نظام سے مراد یہ نہیں کہ ملک کے تمام باشندے کوئی مذہب نہیں رکھتے یا مذہب کے خلاف یعنی لادین ہیں۔ سیکولر نظام میں ایک مذہبی ریاست کے باشندوں سے زیادہ مذہبی اعتقاد اور رسوم کے پابند لوگ پائے جاتے ہیں اس لئے سیکولر کا لادینی ترجمہ غلط ہے۔ اس انگریزی لفظ کا مفہوم صرف یہ ہے کہ خواہ کوئی نظام حکومت ہو یا کوئی دستور، یا کوئی اقتصادی یا سماجی معاملہ اس میں کسی انسانی سوچ سے بالا طاقت یا ہستی کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔

عیسائیت کی گرفت مغربی ملکوں کے شہریوں پر اب تک مضبوط ہے، ریاست متحدہ امریکہ کے فیاض اور انسان دوست اپنے مذہب سے متاثر ہو کر زر کثیر کے فنڈ خیراتی کاموں، تعلیم اور علاج کے مرکزوں، ہسپتالوں اور غریبوں کی امداد کے لئے مختص کرتے ہیں اور ان فنڈوں کا مجموعہ ان سب فنڈوں سے زیادہ ہے جو کہ تمام مسلم ممالک مجموعی طور پر ان اغراض کے لیے وقف کرتے ہیں۔

مغربی دنیا کی دولت اور فارغ البالی کا سب سے بڑا سبب اس کے قدرتی ذرائع اور اس کے صنعتی و حرفتی علم اور اس کی حکومتوں اور اس کی رعایا کے فرض کے احساس پر مبنی ہے۔

تاریخ کا یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جب مغرب عیسائیت کے قبول کرنے کے بعد بھی تاریکی اور جہالت میں ڈوبا ہوا تھا یعنی اس زمانہ میں جو کہ ۴۷۶ عیسوی میں سلطنت رومہ کے زوال سے شروع ہو کر پندرھویں صدی تک جاری رہا۔ خلفائے عباسیہ کے زمانہ اور سپین کے دانشور مسلمان علم کی شمع سے ایک عالم کو معمور کر رہے تھے۔ اس تاریخی حیثیت پر بحث بے سود ہے صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ مسلمانوں نے قدیم مصریوں کے پیپرس کے بعد ...... کاغذ کی ایجاد کر کے اس عرصہ میں ان گنت کتابوں کا سیلاب بہا دیا۔ جو ہر ایک مضمون کے متعلق تھیں جو دین کے کسی پہلو سے تعلق رکھتا تھا۔ اور تمام اہم شہروں میں کتب خانے اور دنیا میں مناسب جگہوں پر رصدگاہیں تعمیر کروائیں۔

ہم میں ایک مکتب خیال ہے جس کو تقلید یا قدامت پسند کہا جاتا ہے جو مسلمانوں کے ان تمام کارہائے نمایاں کی تضحیک کرتا ہے۔ ان کو قابل قدر نہیں سمجھتا۔ اور اسلام کے درجہ اول کے فلسفیوں مثلاً الکندی الفارابی، ابن سینا اور ابن رشد کو فرقہ معتزلہ کا ہم خیال سمجھتا ہے۔ اور الزام لگاتا ہے کہ مسلمان محققین نے یہ سب علم ملحد یونانیوں کے فلسفہ سے حاصل کیا۔ یہ الزام بالکل بے بنیاد ہے۔

کسی گذشتہ باب میں دو تین باتیں تاریخی حوالوں اور مغرب کے دانشوروں کی تصنیفات سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ موجودہ باب کے مضمون کی اغراض و مقاصد کے لئے ان کو مختصراً دہرانا ضروری ہے۔ وہ مسلمہ باتیں یہ ہیں کہ:

۱۔ موجودہ مغرب کی تہذیب، خوشحالی اور سیاسی غلبہ اس کی صنعتوں پر منحصر ہے۔

۲ ۔ یہ صنعتیات سائنس کے ذریعہ قدرتی طاقتوں سے مفید مطلب لینے پر منحصر ہیں ۔

۳ ۔ سائنس کے پہلے موجد عرب تھے نہ کہ یونانی ۔

۴ ۔ تاریخ یورپ میں مسلمانوں کا ایجاد کردہ سائنسی طریقہ پندرہویں صدی عیسوی تک جاری رہا اور یورپ کا دورِ جدید جس کو احیا العلوم وفن کا زمانہ کہتے ہیں سائنسی تحقیقات کے نتیجے کی وجہ سے شروع ہوا ۔

۵ ۔ دورِ حاضرہ جس کو ماڈرن ایج (MODERN AGE) کہا جاتا ہے احیائے علوم وفن کے زمانہ کا استمرار ہے ۔

۶ ۔ مسلمان دانشوروں کا زمانہ ابن رشید کے ساتھ ختم ہو گیا اور گذشتہ آٹھ سو سال میں کوئی نامور مسلمان سائنسدان یا فلسفی یا کوئی ایسا موجد جس نے زمانہ حاضرہ میں ناموری حاصل کی ہو پیدا نہیں ہوا ۔

اس سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ سائنس قرونِ وسطےٰ کے مسلمانوں کی بلاشرکتِ غیرے ایجاد ہے ۔

اگرچہ مسلمان جب ان علمی مشاغل میں مصروف تھے انہوں نے کوئی ڈرامائی انداز کی ایجاد نہیں کی ۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ سائنس کی ابتدا مسلمانوں سے ہوئی ۔ اندرونی اور خارجی حالات نے اس علمی زمانہ کو بارہویں صدی میں ہی ختم کر دیا مگر یورپ میں احیائے علوم وفن (RENASSANCE) کے زمانہ کا آغاز مسلمانوں کا مرہونِ منت ہے کیونکہ سائنس جب ان بیڑیوں سے آزاد ہوئی جس کے ساتھ عیسائیت نے ان کے دماغ کو جکڑ رکھا تھا تو وہ ایسے زور دار اور عالمگیر قوت سے ابھری کہ صرف دو صدیوں کے عرصہ میں اس نے دنیا کا رخ بدل ڈالا ۔ ایجاد کے بعد ایجاد اور دریافت کے بعد دریافت نے مغربی دنیا کو ایسے مقام پر لا کھڑا کیا کہ انسان چاند پر چل پھر کر واپس آ سکتا ہے ۔ مریخ اور مشتری کی سطح کی تصویریں ان دونوں سیاروں کے نزدیک پہنچ کر زمین پر بھیج سکتا ہے ۔ دنیا کے ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک گھنٹوں میں پہنچ سکتا ہے ۔ گھر بیٹھ کر دیکھ اور سن سکتا ہے کہ دنیا کے دوسری طرف کیا ہو رہا ہے ۔ اور ایسی قوت پیدا کر سکتا ہے جو انسان کو اس دنیا کو جس میں وہ رہتا ہے اور اس کی ساری تہذیب وتمدن کو چند لمحوں کے اندر تباہ کر سکتا ہے مگر افسوس کا باعث یہ ہے کہ ان سراغوں سے مدد لے کر جو اسلام کے مفکروں نے دنیا کو مہیا کئے تھے ۔ مغرب تو اس نہج پر پہنچ گیا مگر مسلمان وہیں رہ گئے، جہاں انہوں نے اپنی تحقیقات کو چھوڑا تھا ۔ ان کی حیثیت آج کل صرف دنیا کی ترقی کے اس دور میں تماشائیوں کی سی ہے جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس پر حیران ہوتے ہیں مگر ترقی کی ان سرگرمیوں میں کوئی حصہ نہیں لیتے ۔ بلکہ اس کے برعکس مغرب کو مغربیت، مادیت ۔ الحاد جدیدیت اور اخلاقی تنزل کا طعنہ دیتے ہیں گویا کہ ان کا اپنا خلق مغرب کے خلق سے بہت اعلیٰ ہے اور جو رحمتیں خدا ان پر نازل کرے گا مغرب ان سے محروم

رہے گا۔ اگر یہ بات درست ہے کہ ہم اس ترقی کو جو مغرب نے کی ہے حقارت سے دیکھتے ہیں اور ہمارے لئے وہ قابلِ قبول نہیں تو پھر ہم اپنے آپ ترقی کرنے سے تو رہے، شاید کوئی اور ہستی ہم کو بغیر ہماری مدد کے مغرب سے زیادہ اونچے مقام پر پہنچا دے گویا ہم قیامت کے منتظر ہیں۔ لے دے کر جس بات پر ہمیں ناز ہے وہ روحانیت ہے گویا کہ روحانیت دنیوی ترقی کی ضد ہے اور کیا کسی بے عمل اور بداخلاق قوم کے لئے روحانیت اس قوم کی بداعمالی اور بداخلاقی سے کوئی تعلق نہیں رکھتی؟

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ابن رشد نے بھی ارسطو پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور یہ ابن رشد کا تخیّل ہے جس نے مغرب کو متاثر کیا اور آج بھی کر رہا ہے۔ کسی مسلم فلسفی نے جس نے یونانی فلسفہ کا مطالعہ کیا ہو، خواہ وہ الکندی ہو، یا فارابی یا ابن سینا یا ابنِ رشد، الحادن کے فلسفہ کو اپنے فلسفہ کی بنیاد نہیں بنایا۔

اہل یونان کے فلسفہ کا جو اپنے خیالات میں تعلی کی وجہ سے مادی دنیا سے بہت اونچا رہا مسلمان فلاسفروں نے قرآن سے اس غرض سے مقابلہ کیا کہ کیا اس فلسفہ میں کوئی بات اسلام کے خلاف ہے اس لئے مسلمان فلسفیوں کی تصانیف میں یونانی فلسفہ کی جھلک ضرور ہے اور اسی وجہ سے اس فلسفہ کو نیو پلیٹونزم (NEOPLATONISM) کہا جاتا ہے۔ مگر ان کی تصانیف سے یہ ہرگز ظاہر نہیں ہوتا کہ ان کے تخیّل میں اور قرآن میں کوئی تضاد ہے۔ ابنِ رشد کو اس بات کا احساس تھا کہ کہیں فلسفہ مذہب کے ساتھ ٹکرا نہ جائے۔ اس لئے اس نے مذہب کو وہ مقام دیا کہ اس کا سائنس کے ساتھ تصادم ہو ہی نہ سکے۔ اور ہر دو اپنی اپنی جگہ مطالعہ کیے جا سکیں۔

فرقہ معتزلہ جن کو عاقلان اسلام کہا جاتا ہے کچھ عرصہ خاص طور پر خلیفہ مامون کے عہد میں مقبول رہا مگر آخر کار جب عشری اور رازی نے اس کی مخالفت کی تو اس کی مقبولیت کم واقع ہونے لگی۔ اور آہستہ آہستہ اس کی اہمیت ہی جاتی رہی۔ عشری اور رازی دونوں تقلید پسند یا قدامت پسند مگر صاحبِ اثر تھے اس سے پہلے غزالی نے بھی اس فرقہ کے متعلق ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا مگر آخر کار اسے کہنا پڑا کہ اس فرقہ کے فلسفیوں اور ان کے خیالات کی مذلت ملّت کے خلاف ایک جرم ہے کیونکہ کسی سائنسی مسئلہ پر قرآن میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے اس کا اثبات یا نفی میں جواب مل سکے اس واسطے اس فرقہ کے فلسفہ پر الحاد کا الزام لگا کر اس کی مذمت صرف اس وجہ سے نہیں کی جا سکتی کہ وہ عقل اور دلیل پر زور دیتا تھا۔ تاوقتیکہ اس کے عقائد اور وحی میں کوئی تصادم نہ ہو۔

ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنت رومہ کا زوال ۴۷۶ عیسوی سے شروع ہوا۔ پرنٹنگ پریس کی ایجاد، امریکہ کی دریافت اور پندرھویں صدی کے احیاء العلوم و فن کی تحریک جس وجہ سے عیسائیت میں تجدید مذہب کا رجحان پیدا ہوا ازمنۂ وسطیٰ کے اختتام اور دور حاضرہ کے آغاز کے باعث بنے۔

تاریخ کے ان واقعات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب ہم اس سوال کا جواب ڈھونڈ سکتے ہیں کہ دور حاضرہ میں مسلمان کوئی قابل ذکر کردار کیوں ادا نہیں کر سکے اور ان کی دماغی سرگرمیاں جو قرون وسطےٰ میں اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھیں دفعتاً ان کی سیاسی برتری کے زوال پر کیوں ختم ہو گئیں۔ میری ناقص رائے میں اس اختتام کے کئی اسباب تھے جن میں کچھ داخلی اور کچھ خارجی تھے۔

بغداد کو جو مملکت اسلامیہ کا دارالخلافہ تھا ہلاکو خان نے ۱۲۵۸ میں تاخت و تاراج کیا جس کے بعد خلافت جو اسلام کا مرکز تھی ختم ہو گئی۔ خلافت کے ایک حقدار نے مصر میں پناہ لی۔ اور اپنی برائے نام خلافت کو ایک ترک سلطان کے پاس فروخت کر دیا۔

گیارہویں صدی کے اختتام کے قریب سلجوق ترکوں نے اسلام کو موثر بنانے کی کوشش کی تھی مگر ان کی کامیابی عارضی ثابت ہوئی۔ سلجوق خاندان کے بعد عثمانی ترکوں کا دور شروع ہوا اور ترک ایک فاتح قوم ثابت ہوئے۔

۱۴۵۳ میں سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ کو، جو مشرقی سلطنت رومہ کا پایہ تخت تھا اور بازنطینیہ بھی کہلاتا تھا، فتح کیا۔ اس شہر کے فتح کرنے میں جس شجاعت اور عقلمندی کا مظاہرہ ترکی بیڑے نے کیا اس کی تفصیل پہلے آ چکی ہے۔ اس فتح کے بعد ترک یورپ کے اندر تک گھس گئے اور شہر وائنا کے دروازوں پر دستک دینے لگے مگر وہ اس شہر کو فتح نہ کر سکے۔ اور ان کو واپس لوٹنا پڑا، اب خلافت کی حکمرانی آہستہ آہستہ کم ہونے لگی حتیٰ کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد اتاترک کے پاس یورپ کا چھوٹا سا حصہ رہ گیا۔ قسطنطنیہ اگرچہ عیسائیت کا مرکز تھا یہ عیش و عشرت کا گڑھ بھی تھا۔ جو خواجہ سراؤں، غلاموں، داشتاؤں اور کنیزوں کے ایک لشکر سے بھرا ہوا تھا۔ بغداد کی تباہی سے پہلے اور بعد میں مسلمان صلیبی جنگوں میں دو سو سال تک مصروف رہے اس عرصہ میں ان کو منگول قوم کے حملہ آور گروہوں کے ہی آڑے نہیں آنا پڑا بلکہ انہوں نے یورپی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا اور اگرچہ خلیفہ سلیمان ذی شان کی حکومت بغداد سے ہنگری تک پہنچ گئی تھی مسلمانوں میں سیاسی انحطاط اور دانشوری کا زوال شروع ہو چکا تھا۔

مسلمانوں کے قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد وہ دانشور جنہوں نے قدیم یونانی تخیل کو زندہ رکھا ہوا تھا قسطنطنیہ سے بھاگ کر دوسرے یورپی حصوں میں چلے گئے اور انہوں نے تجدید علوم (ERNASSANCE) کے زمانہ کی، جو بہت پہلے شروع ہو چکا تھا رفتار کو زیادہ تیز کر دیا۔

تاریخ میں کسی علاقہ کو صرف فتح کرنا بڑی بات نہیں کہا جا سکتا۔ اب تک مسلمان ایک فاتح قوم تھی مگر ان سے پہلے بھی بڑے بڑے فاتح گذر چکے تھے یعنی سویڈن کے بحری لٹیرے، رومہ، اہلِ فارس و یونانی سکندر اعظم اور منگول قوم کے رہنما اور ان میں بعض فاتح سردار جس میں ہمارے بابر اور نادر شاہ بھی شامل ہیں مفتوحہ باشندوں کی کھوپڑیوں کے برج تیار کرنے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ جس زمانے کا ہم ذکر

کر رہے ہیں۔ ملک فتح کرنے کی غرض میں لوٹ اور خراج گیری کا لالچ ایک ضروری عنصر تھا۔ مگر اسلام کی اشاعت کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ اس وقت کے رواج کے مطابق مالِ غنیمت جائز سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے غنیمت اور غلامی کے سلسلہ کو بہت حد تک نرم کردیا تھا۔ اور علاقہ فتح کرنے کا مدعا دراصل تبلیغ اسلام رہ گیا تھا۔ جس میں جبراً تبدیلیٔ مذہب کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اور رسول اللہؐ کی زندگی اور خلافت راشدہ کے دَور میں ملک بھی وہ فتح کئے جاتے تھے۔ جن سے یا تو حملہ کا ڈر ہو۔ یا جن کا ارادہ اسلام کو ذک پہنچانا یا کمزور کرنے کا ہو۔ صدق دل سے مذہب تبدیل کرنے والے کو کوئی لالچ یا حرص یا خود غرضی نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ ایسی تبدیلی اگر کسی دنیوی غرض سے ہو تو وہ اس وجہ سے جبراً نہیں کہلائی جاسکتی کہ حرص و لالچ اس کو تبدیلیٔ مذہب پر مائل کرتے ہیں۔ نہ کہ کسی قسم کا جبر۔ اور جبراً تبدیلی کبھی قرین مصلحت ثابت نہیں ہوسکتی کیونکہ جس شخص کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جائے وہ کبھی خیر خواہ ملک یا حکومت نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس سے ملک و ملت کے بدخواہوں اور دشمنوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ بات مدینہ کے یہودیوں کے طرزِ عمل سے عیاں ہوجاتی ہے۔ یہود مدینہ میں ایک وقت اُمت کا جزو سمجھے جاتے تھے۔ مگر باوجود اس رعایت کے وہ ہمیشہ اسلام کے دشمن رہے۔ حتیٰ کہ ان کی سازشوں کی وجہ سے ان کو مدینہ چھوڑنا پڑا۔ حالانکہ اس اخراج پر بھی ان کو مجبور نہیں کیا گیا تھا۔ ان کی بے وفائی ان کے سینوں اور ضمیروں میں تھی۔ اور مدینہ میں رہنا وہ اپنے لئے خطرے کا باعث سمجھتے تھے۔

سنتہ' حدیث' اجتہاد اور اجماع کا پہلے مفصل ذکر آچکا ہے۔ قرآن' سنتہ' کا وہ حصہ جو صحابہ کرام نے بعد میں آنے والی نسلوں کو پہنچایا۔ اور جو دینی یا دنیوی قواعد سے تعلق رکھتا ہے۔ شریعت کہلاتا ہے۔ قرآن اور سنتہ کے مطالعہ کی دو شاخیں ہیں۔ علم تفسیر اور علم حدیث۔

قرآن' سنتہ اور اجماع کے احکام اور قواعد کے مطالعہ کو خواہ وہ ایمان اور عبادات سے تعلق رکھتے ہوں۔ یا دنیوی افعال سے' علم فقہ کہا جاتا ہے۔ شریعت کے مجموعات کے مرتب ہونے اور دَور حاضر میں قریبًا دس صدیاں حائل ہیں۔ اور اسی عرصہ کے اندر اسلام عرب ممالک تک ہی محدود نہیں رہا۔ بلکہ روئے عالم پر پھیل گیا۔ اور انسانی معاشرے میں بہت اہم تبدیلیاں واقع ہوچکی ہیں۔ نئی خواہشات و ضروریات اور سرگرمیاں معرض وجود میں آچکی ہیں۔ اس لئے مروجہ اسلامی نظام میں کچھ تبدیلیوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔ یہ سوال اسلام کے لئے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اور بعض لوگوں کے خیال میں اسلام کی بنیاد تک پہنچتا ہے۔ اور کئی لوگ یہ سوال پوچھنے میں تامل نہیں کرتے کہ آخر اسلام کا جوہر کیا ہے۔ اور کیا تمام احکاماتِ شریعت ازلی اور ابدی ہیں۔ یا ان میں تبدیلی کا کوئی اسلام کے اندر رہتے ہوئے امکان ہے۔ اور اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو تبدیلی کی گنجائش کہاں تک ہے۔ اور یہ تبدیلی کس طرح کی جاسکتی ہے۔ اسی قسم کے سوالات ہر ایک مسلمان مفکر کے ذہن میں اٹھتے ہیں۔ مگر ان سوالوں کا جواب متفقہ طور پر نہیں دیا جاسکتا۔ ہر ایک مفکر اپنا اپنا زاویہ نظر

رکھتا ہے۔ قرآن مذہبی اختلافات کو پسند نہیں کرتا۔

"اور جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو فرقے پیدا کرتے ہیں آپ کا (رسول اللہ) کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کا معاملہ اللہ کے پاس جائے گا۔ اور وہ ان کو بتائے گا کہ وہ کیا کچھ کرتے رہے ہیں"۔

مگر باوجود اس ارشاد کے مسلمانوں میں کبھی پورا اتفاق رائے نہیں ہوا۔ مگر بعض لوگ اپنے آپ کو اجتہاد مطلق کا پابند خیال نہیں کرتے۔ اس خیال کے لوگوں میں ایک شخص ابن دقیق العید ہے اور دوسرا سیوطی جس نے خود اجتہاد کرنے کے حق کا دعویٰ کیا۔ اَل جوینی بھی سیوطی کے خیال سے متفق تھا۔ اہل تشیع اور صوفیا کرام نے کبھی اپنے آپ کو اس اجتہاد کا پابند نہیں سمجھا۔ مگر باوجود اس مخالفت کے تقلید کا اصول جاری ہی نہیں رہا بلکہ صدیوں کی پابندی اور عمل نے شریعت کے ارد گرد ایک ایسی دبیز تہ جمائی دی ہے کہ اس تہ کو چھیل کر قرآن اور سنت کا مغز ننگا نہیں کیا جا سکتا۔ شریعت کے اس انجماد اور حالاتِ حاضرہ کے فرق نے، خاص طور پر اس بات نے کہ قانون اراضی، قانون جائداد، قانون تجارت، بین الاقوامی قانون، قانون شہادت، قانون بیع اور تعزیری قوانین کو اپنی اصلی شرعی صورت میں نافذ العمل نہیں سمجھا گیا۔ مسئلہ کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا ہے اور مفکرین کے دلوں میں ایک بے اطمینانی پیدا کردی ہے رسول اللہ کی وفات کے دو سو سال کے اندر چار مختلف الخیال جماعتیں، چار مختلف اماموں کے اجتہاد کی بدولت پیدا ہوئیں۔ جنہوں نے قرآن کی تفسیر اور احادیث کی مدد سے مجموعات قانون مرتب کیے۔ آئمہ اربعہ کے اس اجتہاد کو اجتہاد مطلق سمجھا جاتا ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ ان چاروں مجتہدین کی رائے صحت مطلق رکھتی ہے۔ اور اس کو بذریعہ مکرر اجتہاد نہیں بدلا جا سکتا۔ چاروں آئمہ عام طور پر متفق ہیں۔ مگر کہیں کہیں ان میں اختلاف بھی ہے۔ اور امام یوسف اور امام محمد جو امام حنیفہ کے شاگرد ہیں۔ کہیں کہیں ایک دوسرے سے اور اپنے اُستاد سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اسی طرح سے اسلام میں چار جماعتیں بن گئیں۔ ایک حدیث جو معتبر سمجھی جاتی ہے کہتی ہے کہ اسلام میں تہتّر فرقے ہوں گے جن میں سے صرف ایک فرقہ بہشت میں جائے گا۔ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام کو بہت کم لوگوں نے صحیح طور پر سمجھا ہے۔ مگر یہ امر غیر متعلقہ ہے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ شریعت کو آئمہ اربعہ یعنی امام مالک، امام حنبل، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی اور بعد کے چند فقہا نے جن کو اماموں میں شامل کیا جاتا ہے۔ مرتب کی ان چہار مکاتیب فکر کے پیرؤوں کو تقلید پسند یا قدامت پسند یا مقلد کہا جاتا ہے۔ ہر سُنّی المذہب ان چاروں اماموں میں سے کسی ایک کا پیرو ہو سکتا ہے۔ اور وہ اپنے امام کے نام سے حنفی یا شافعی، مالکی، حنبلی کہلائے گا۔ اس اجتہاد مطلق کے مسئلے نے مسلم مفکرین کے دلوں میں ایک بے اطمینانی پیدا کردی ہے جس کا اظہار وقتاً فوقتاً مفکرین اور مصلحین اسلام کرتے آئے ہیں۔ اسلام میں تخیل کے منجمد ہو جانے کی اصل وجہ یہ ہے کہ آئمہ اربعہ کے مجموعات کو حرف آخر سمجھا گیا ہے اور ان کو اجماع کی صورت دے کر مقدس اور قطعی قرار دے دیا گیا ہے۔ اور مزید اجتہاد کا راستہ بند کر دیا گیا ہے۔ بعد کے فقہا نے اس اجتہاد مطلق کے اصول کو مزید قوت دے کر جمود کے عنصر کو اور بھی سخت کر دیا ہے۔

رسول اللہ اور خلفاء راشدہ کی زندگی میں قانون کی تاویل اور اس کا نفاذ ایک ہی ہاتھ میں تھا۔ اگرچہ خلافت کے عہد میں بعض موقعوں پر قاضی سے مدد لی جاتی تھی۔ مگر بنو امیہ کے عہد میں اور اس کے بعد بھی فقہاء کو نفاذ قانون میں شامل کرنا لازمی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس سے وہ اپنا سارا وقت اور دماغ قانون کی مزید تشریح میں صرف کرتے تھے۔ اور ایک قسم کی خلا میں زندگی کی حقیقتوں سے دور رہ کر کام کرتے تھے۔ کیونکہ قانونی نظام انتظامیہ کے ہاتھ میں آچکا تھا۔ یہی حالت عباسیوں کے عہد میں رہی۔ چند عدالتیں جو خلفاء نے قائم کیں۔ مثلاً ناظر المظالمین اور محتسب کے عہدے، قاضی کے عہدے کے علاوہ قائم کئے گئے تھے۔ ناظر المظالمین کے دائرہ اختیار میں وہ جرائم تھے جن کو کم کرنے یا روکنے کے لئے قاضی کے پاس کوئی ذرائع نہ تھے اور محتسب کو صرف ایک قسم کی پولیس کورٹ یا مجسٹریٹ کہا جاسکتا ہے۔

اس طرح خلافت راشدہ کے بعد نظام اسلام میں ایک قسم کی دو عملی پیدا ہو گئی تھی۔ جو دنیوی اور مذہبی امور کے علیحدہ علیحدہ انتظام پر مبنی تھی۔ فوجداری، تجارتی، اور اراضی کے متعلق قوانین آہستہ آہستہ انتظامیہ کے سپرد ہو گئے۔ اسلامی دستور قانون حرب اور بین الاقوامی قوانین کا شریعت سے تعلق جاتا رہا۔ اور قاضی کے پاس صرف عبادت کا طریقہ اور خالص مذہبی فرائض یعنی شادی اور طلاق کا قانون، عائلی قوانین، قانون ورثہ اور کچھ حد تک اوقاف کا قانون رہ گیا۔ یہ میدان وہ تھا۔ جو کہ عوام کے نزدیک مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ اور جس پر شریعت حاوی تھی۔ عہد عثمانیہ کے خوشحال زمانہ میں یعنی سولہویں اور سترھویں صدی میں متقی خلفاء کے زیر سایہ شریعت کا اطلاق پھر اپنے اوج پر پہنچ گیا۔ اور عدالتوں کے اختیار سماعت میں یکجہتی پیدا ہو کر دو عملی ختم ہو گئی۔ قاضیوں کا نظام ان کے درجہ کے مطابق قائم ہوا۔ مفتی اعظم اور شیخ الاسلام کو شریعت کی پابندی کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سپرد ہوئی۔ مگر اس وقت بھی فوجداری قانون، قانون مال قانون اراضی، دنیوی معاملات میں قانون سازی بذریعہ قانون نامجات انتظامیہ کے ہاتھ میں رہے۔ اور یہ قانون نامے عین شریعت کے مطابق نہ تھے۔

اسلام اور دورِ حاضرہ کے مفکرین

دورِ حاضرہ کا ایک نمایاں پہلو قومیت اور وطنیت کا احساس ہے۔ قومیت، جو وطنیت پر مبنی ہو۔ اور اسلام کے مابین تصادم پر علامہ اقبال ان اشعار میں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے　　جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے　　غارت گر کاشانہ دین نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے　　اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے　　اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے
گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے　　ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے !

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ قرآن کس غرض سے وطن یا زبان اور نسل کو تسلیم کرتا ہے۔ اور ان عناصر کو بالکل نظر انداز نہیں کرتا۔

مجموعات آئمہ اربعہ کی سنۃ اور اجتہادِ مطلق کے مسئلے پر سب سے پہلے ابن وقیق السعید اور ابن تیمیہ نے اعتراض کیا، سیوطی، صوفی اور چند مفکرین بھی ان کے ہم خیال تھے۔ ابن تیمیہ ۱۲۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ جنبلی قانون کے وہ پروفیسر رہے اور اپنے آپ کو مجتہد فی المذہب کا درجہ دیتے تھے۔ وہ تقلید اور اجماع کے قائل نہیں تھے۔ اور اور بزرگوں کے مقبروں پر عرس منانے منتیں ماننے اور نذر و نیاز چڑھانے کے خلاف تھے۔ اور کہیں کہیں خلفاءِ راشدہ کی بھی نکتہ چینی کر جاتے تھے۔ جدید خیال کے نزدیک کے مفکروں میں سب سے بڑا نام محمد بن عبدالوہاب کا ہے جو ۱۶۹۱ء میں نجد میں پیدا ہوئے۔ اپنے جنبلی مکتب خیال میں عبداللہ ابن ابراہیم سے تعلیم پائی۔ اور جب ان کی اپنے علاقے میں مخالفت بڑھی تو انہوں نے محمد ابن مسعود کے پناہ لی۔ جس نے عبدالوہاب کی لڑکی کے ساتھ عقد کر لیا۔ جس کے بطن سے وہابی قائد عبدالعزیز پیدا ہوئے۔ وہابی فرقے نے جلد مقبولیت حاصل کر لی۔ جس وجہ سے ان کا اتنا سیاسی رسوخ اور حربی طاقت بڑھی کہ مکّہ اور مدینہ پر بھی وہابیوں نے قبضہ کر لیا۔ اور عرب میں وہ ایک بڑی طاقت بن گئے۔

وہابی سخت درجے کے مواحد ہیں۔ اور ہر ایک قسم کی رسم و رواج کے خلاف ہیں۔ جس سے اللہ کی توحید پر اثر پڑتا ہو۔ وہابیوں، جن کو اہل حدیث بھی کہا جاتا ہے، کے نزدیک اسلام کی اصل صورت قرآن اور ان احادیث میں پائی جاتی ہے۔ جن کو صحابہ کرام رض نے خود رسول اللہ سے سُنا ہو۔ اس لئے صحابہ کرام رض کی وفات کے بعد کی احادیث کو وہ کوئی وقعت نہیں دیتے۔ اور اسی طرح بعد کے اجماع کے بھی وہ قائل نہیں۔ کیونکہ وہ سخت درجے کے مواحد ہیں۔ وہ پیر پرستی، مقبروں پر روشنی کرنا، نذر چڑھانا، یا جو بزرگ ان میں مدفون ہیں، ان سے دعا کرنا مزاروں سے مدد مانگنا خلافِ اسلام سمجھتے ہیں اور ایسے لوگوں کو مشرک خیال کرتے ہیں۔ وہ اجتہاد مطلق کے قائل نہیں۔ اسی لئے وہ ہر شخص کو جو اس کا اہل ہو۔ قرآن اور حدیث کی اپنی تعبیر کرنے کا حق دیتے ہیں۔ مزاروں کے وہ اتنے سخت خلاف ہیں کہ انہوں نے حضرت امام حسین رض کے روضہ کے سنہری گنبد کو بھی گرا دیا۔ اور جو بزرگوں کے مقبروں پر مینار تھے ان کو بھی توڑ ڈالا۔

وہابیت کی تحریک نے ہندوستان کے علماء پر بھی اثر کیا۔ اور سیّد احمد بریلوی ایک گرم جوش وہابی بن گئے۔ جنہوں نے اور جن کے بیٹے محمد اسمٰعیل شہید نے تحریک کو ایک سیاسی رنگ دے دیا۔ وہابی تسبیح کا استعمال نہیں کرتے۔ اس کی جگہ اللہ کی ۹۹ صفات کو انگلیوں پر گنتے ہیں۔

وہ مولود کی رسم کو بھی غلط سمجھتے ہیں۔ قرآن میں اللہ کے ہاتھ، اللہ کے چہرے اور اللہ کے تخت پر جو بیٹھنے کا ذکر ہے یہ فرقہ اس کو حقیقت سمجھتا ہے۔ مگر یہ ماننے سے گریز کرتا ہے کہ اللہ کا ہاتھ اور چہرہ انسان کے ہاتھ اور چہرے کی طرح ہے یا اللہ انسان کی طرح تخت پر بیٹھتا ہے۔

عرب کے شاہ خالد اسی مکتبِ خیال سے تعلق رکھتے ہیں۔ شرک کے خلاف ان کا اتنا شدید احساس تھا کہ انہوں نے اپنے وقت کے عثمانی خلیفہ سلیم کو کہلا بھیجا کہ دمشق اور قاہرہ سے جو محمل کعبہ کے لئے غلاف لے کر ڈھول ڈھمکے کے ساتھ آتے ہیں ان کو بند کر دیا جائے۔

سر سید احمد خان جدید خیالات کے مفکروں میں صفِ اوّل میں ہیں۔ تقلید پسندوں کی مخالفت کے باوجود انہوں نے علی گڑھ میں مسلمانوں کے لئے ایک مغربی طرز کا کالج قائم کیا جس نے مسلمانوں کی ایک نئی نسل کو جنم دیا جو اسلام پر بھی یقین رکھتی تھی۔ اور دَورِ حاضرہ کے تقاضوں کو بھی سمجھتی تھی۔ رسالہ تہذیب النسواں میں بذریعہ مضامین اور پبلک تقریروں میں انہوں نے ایک سے زیادہ شادی کرنے کی مخالفت کی۔ متعلقہ قانون کی ترمیم تجویز کی۔ اور رجم اور قطع یَدیں سزاؤں کی مخالفت کی۔

سر سید احمد خان برِصغیر ہند کے مسلمانوں کی تاریخ میں ایک نازک مرحلے پر پیدا ہوئے۔ غدر یا جنگِ آزادی کے وقت وہ بجنور میں سب جج تھے۔ شاہ اسماعیل شہید کے زیرِ اثر وہ وہابی خیالات سے متاثر ہو چکے تھے۔ انیسویں صدی میں یورپ میں سائنس اور مذہب میں ایک کشمکش جاری تھی۔ سائنس ہر طرف سے مذہب پر حملے کر رہی تھی۔ اور مذہب صرف اپنی محافظت ہی نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ سائنس پر جوابی حملے کر رہا تھا۔ ہندوستان میں مذہبی مباحثے زوروں پر تھے۔ عیسائی اور آریہ سماجی اسلام پر حملے کر رہے تھے اور مسلمان علماء جن میں مرزا غلام احمد شامل تھے ان حملوں کا جواب دے رہے تھے۔ مباحثوں نے کئی دفعہ مباہلہ کی صورت بھی اختیار کر لی تھی۔ سر ولیم میور کی رسول پاک کی زندگی پر کتاب نے مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ اس کتاب کا جواب لکھنے کے لئے سر سید احمد خان نے صرف یورپ کی لائبریریوں سے نہیں۔ بلکہ تمام اسلامی ممالک سے کتابیں اکٹھی کیں۔ اور اپنی کتاب خطبات تصنیف کی۔ جس میں سر ولیم میور کے اعتراضات کا جواب دیا اور رسول اکرمؐ کی زندگی کے صحیح حالات بیان کیے۔ بعد میں انہوں نے قرآن کی تفسیر لکھنی شروع کی۔ مگر اس کے ختم ہونے سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ اس سارے کام کے عوض ان کو قدامت پسندوں نے کافر ٹھہرایا۔ اور ان کے نام کے ساتھ لفظ نیچری کا بھی اضافہ کر دیا۔ جگہ جگہ پھرنے والے مصنف جمال الدین افغانی نے جو سیاستدان زیادہ تھے اور عالم دین کم ان کی سخت مخالفت کی۔ اسلام کے متعلق ان کا نظریہ خطبات، نامکمل تفسیر اور تہذیب الاخلاق کے مضامین سے اخذ کیا جا سکتا ہے مختصراً وہ نظریہ یہ تھا۔

۱۔ اسلام کی اصل صورت قرآن میں ہے۔ جو الہامی اور دلیل و عمل پر مبنی کتاب ہے۔ اور اسلام ایک معقول المعنی مذہب ہے۔ حدیث، اجماع، قیاس اور فقہ اسلام کے جزو نہیں۔ وہ ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

۲۔ کہ قرآن کا نہ ہی فطرت سے تصادم ہے اور نہ ہی سائنس سے۔

۳۔ کہ قوانین قدرت کے خلاف کوئی واقع ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے معجزات جو عام مسلمانوں میں حقیقت سمجھے جاتے ہیں۔ وہ واقع نہیں ہو سکتے تھے۔ معراج بھی جسمانی واقعہ نہ تھا۔ یہ ایک روحانی تجربہ تھا۔ حضرت مریم کے بطن سے حضرت عیسیٰ کی خلاف فطرت پیدائش کے وہ قائل نہ تھے۔

۴۔ کہ جن اور فرشتے جسمانی ہستیاں نہیں بلکہ قدرتی طاقتوں کی علامات ہیں۔

۵۔ کہ قرآن میں جن مافوق الفطرت واقعات کا ذکر ہے۔ وہ استعاری معنی رکھتے ہیں۔ جن کی معقول تاویل ہو سکتی ہے۔

۶۔ کہ اسلام ایک فطرتی مذہب ہے جو معاشرے کے ہر پہلو اور منزل سے مطابقت رکھتا ہے۔

مولانا آزاد

مولانا آزاد انسانی زندگی میں مذہب کے مقام اور اپنے ذاتی تجربہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ایک مکتوب (غبار خاطر۔ مکتوب ۸) میں لکھتے ہیں۔

"بلاشبہ مذہب کی وہ پرانی دنیا جس کی مافوق الفطرت کارفرمائیوں کا یقین، ہمارے دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔ اب ہمارے لئے باقی نہیں رہی۔ اب مذہب بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ تو عقلیت اور منطق کی ایک سادہ اور بے رنگ چادر اوڑھ کر آتا ہے۔ اور ہمارے دلوں سے زیادہ ہمارے دماغوں کو مخاطب کرنا چاہتا ہے۔ تاہم اب بھی تسکین اور یقین کا سہارا مل سکتا ہے۔ تو اسی سے مل سکتا ہے۔ فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا۔ اور پھر اسے بند نہیں کر سکے گا۔ سائنس ثبوت دے دے گا مگر عقیدہ نہیں دے سکے گا۔ لیکن مذہب ہمیں عقیدہ دے دیتا ہے۔ اگرچہ ثبوت نہیں دیتا۔ اور یہاں زندگی بسر کرنے کے لئے صرف ثابت شدہ حقیقتوں ہی کی ضرورت نہیں بلکہ عقیدہ کی بھی ضرورت ہے۔ ہم صرف انہی باتوں پر قناعت نہیں کر سکتے، جنہیں ثابت نہیں کر سکتے لیکن مان لینا پڑتا ہے۔"

"عام حالات میں مذہب انسان کو اس کے خاندانی ورثہ کے ساتھ ملتا ہے۔ اور مجھے بھی ملا۔ لیکن میں موروثی عقائد پر قائم نہ رہ سکا۔ میری پیاس اس سے زیادہ نکلی۔ جتنی سیرابی وہ دے سکتے تھے، مجھے پرانی راہوں سے نکل کر خود اپنی نئی راہیں ڈھونڈنی پڑیں۔ زندگی کے ابھی پندرہ برس بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ طبیعت نئی خلشوں اور نئی جستجوؤں سے آشنا ہو گئی تھی۔ اور موروثی عقائد جس تشکل و صورت میں سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔ ان پر مطمئن ہونے سے انکار کرنے لگی تھی۔ پہلے اسلام کے اندرونی مذاہب کے اختلافات سامنے آئے اور ان کے متعارض دعوؤں اور متصادم فیصلوں نے حیران و سرگشتہ کر دیا۔ پھر جب کچھ قدم آگے بڑھے تو خود

نفسِ مذہب کی عالمگیر نزاعیں سامنے آگئیں۔ اور انہوں نے حیرانگی کو شک تک اور شک کو انکار تک پہنچا دیا۔ پھر اس کے بعد علم اور مذہب کی باہمی آویزشوں کا میدان نمودار ہُوا۔ اور اس نے رہا سہا اعتقاد بھی کھودیا۔ زندگی کے وہ بنیادی سوال جو عام حالات میں بہت کم ہمیں یاد آتے ہیں۔ ایک ایک کرکے اُبھرے اور دل ودماغ پر چھاگئے۔ حقیقت کیا ہے اور کہاں ہے۔ اور ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے اور ایک ہی ہے۔ کیونکہ ایک سے زیادہ حقیقتیں ہو نہیں سکتیں۔ تو پھر راستے کیوں مختلف ہُوئے۔ کیوں صرف مختلف ہی نہیں ہوئے بلکہ باہم متعارض اور متصادم ہوئے۔ پھر یہ کیا ہے کہ خلاف ونزاع کی ان تمام لڑتی ہوئی راہوں کے سامنے علم اپنے بے لچک فیصلوں اور ٹھوس حقیقتوں کا چراغ ہاتھ میں لئے کھڑا ہے۔ اور اس کی بے رحم روشنی میں قدامت وروائیت وہ تمام پراسرار تاریکیاں جنہیں نوعِ انسانی عظمت وتقدیس کی نگاہ سے دیکھنے کی خوگر ہوگئی تھی۔ ایک ایک کرکے نابود ہورہی ہیں؟ یہ راہ ہمیشہ شک سے شروع ہوتی ہے اور انکار پر ختم ہوتی ہے۔ اور اگر قدم اس پر رُک جائیں تو پھر مایوسی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ مجھے بھی ان منزلوں سے گذرنا پڑا۔ مگر میں رُکا نہیں۔ میری پیاس مایوسی پر قائم نہیں ہونا چاہتی تھی۔ بالآخر حیرانگیوں اور سرگشتیوں کے بہت سے مرحلے طے کرنے کے بعد جو مقام نمودار ہُوا۔ اس نے ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیا۔ معلوم ہُوا کہ اختلاف ونزاع کی اپنی متعارض راہوں اور اوہام وخیالات کی اپنی تاریکیوں کے اندر ایک روشن اور قطعی راہ بھی موجود ہے۔ جو یقین اور اعتقاد کی منزلِ مقصود تک چلی گئی ہے۔ اور اگر سکون وطمانیت کے سرچشمے کا سراغ مل سکتا ہے۔ تو وہیں مل سکتا ہے۔ میں نے جو اعتقاد حقیقت کی جستجو میں کھودیا تھا وہ اسی جستجو کے ہاتھوں پھر واپس مل گیا۔ میری بیماری کی جو علت تھی وہی بالآخر داروئے شفا بھی ثابت ہوئی۔"

"جب تک موروثی عقائد کے جمود اور تقلیدی ایمان کی چشم بندیوں کی پٹیاں ہماری آنکھوں پر بندھی رہتی ہیں۔ ہم اس راہ کا سراغ نہیں پاسکتے۔ لیکن جونہی یہ پٹیاں کھلنے لگتی ہیں۔ صاف دکھائی دینے لگتا ہے کہ راہ نہ تو دُور تھی۔ اور نہ کھوئی ہوئی تھی۔ یہ ہماری خود چشم بندی تھی۔ جس نے عین روشنی میں گم کردیا تھا۔ اب معلوم ہُوا کہ آج تک جسے مذہب سمجھتے آئے تھے وہ مذہب کہاں تھا۔ وہ تو خود ہماری ہی وہم پرستیوں اور غلط اندیشیوں کی ایک صورت گری تھی۔"

"موروثی، جغرافیائی اور رسمی مذہب کا ذکر کرنے کے بعد آپ حقیقی مذہب تک پہنچتے ہیں۔ مگر اس کی تعریف یا تشریح نہیں کرتے اور اسی سلسلہ میں خیال کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں۔"

"اس مقام پر پہنچ کر یہ حقیقت بھی بے نقاب ہوئی کہ علم اور مذہب کی جتنی نزاع ہے۔ فی الحقیقت علم اور مذہب کی نہیں۔ مدعیانِ علم کی خامکاریوں اور مدعیانِ مذہب کی ظاہر پرستیوں اور قواعد سازیوں کی ہے حقیقی علم اور حقیقی مذہب اگرچہ چلتے ہیں۔ الگ الگ راستوں سے مگر بالآخر پہنچ جاتے ہیں۔ ایک ہی منزل پر۔"

مولانا آزاد کے خیالات سے قارئین بخوبی اندازہ لگاسکتے ہیں۔ کہ کس طرح مولانا مذہبی طمانیت

سے شروع ہوکر فلسفہ کی گہرائیوں میں سے گذرتے ہوئے دلی تسکین پر ہی واپس آجاتے ہیں۔ اگرچہ اس مقام پر پہنچنے کے لئے وہ ایک دوسرا روشن راستہ دیکھتے ہیں۔ مگر موروثی عقائد کے جمود اور تقلیدی ایمان کو وہ چشم بندی کی پٹی قرار دیتے ہیں۔ مگر روشن راستے کی نشاندہی نہیں کرتے۔

اسلام میں اصلاح کرنے کا دعویٰ رکھنے والا ایک اور ہندوستانی بھی تھا جس کا نام فیضی تھا۔ یہ شخص اعلےٰ تعلیم یافتہ اور ایک گہرا مفکر تھا۔ اس نے مولانا آزاد کی سورۂ الفاتحہ کی تفسیر سے اتفاق کیا کہ سارے مذاہب یکساں سچے ہیں۔ اگرچہ مذہبی رسوم کے ادا کرنے میں ان میں اختلاف ہے۔ اس کے مطابق ایمان کا سب سے ضروری جز و خدمتِ خلق ہے۔ اس نے مذہب کو قانون سے میز کر کے ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ رکھنے کا پرچار کیا۔ اور دلیل یہ دی کہ مذہب اور مذہبی قانون کی اطاعت ابتدائی معاشرے میں سزا کے خوف اور جزا کی اُمید پر منحصر تھی۔ اور انسان کا بنایا ہُوا قانون ایک پختہ اور ترقی یافتہ تہذیب کی شہادت ہے۔ اس کے خیال میں ساکن یا منجمد قانون ترقی پذیر معاشرے کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا شریعت پر رائے ظاہر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ شریعت کے گرد ایک گرد کا انبار اکٹھا ہو گیا ہے۔ جو صدیوں کے گذرنے سے سخت سے سخت ہوتا گیا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کا فرض ہے۔ کہ اس انبار کو کھرچ کو علیحدہ کر دیں۔ تاکہ حقیقی مذہب کا عکس نظر آسکے۔ اس کا ایک نظریہ یہ بھی تھا کہ دنیا میں کوئی بھی شے ساکن نہیں۔ سوائے اس شے کے جو مر چکی ہو۔ یا شروع ہی سے بے جان ہو۔ کیونکہ اسلام ایک زندہ اور رو بہ ترقی مذہب ہے۔ مسلمانوں کو اس انجماد کے خلاف بغاوت کرنی چاہیئے۔

فیضی نے مذہبی احکام کو دو حصّوں میں تقسیم کیا۔ ایک وہ جن میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور دوسرے وہ جو عالمگیر تبدیلی اور ارتقاء کی وجہ سے قائم نہیں رہ سکتے۔ وہ مکمل آزادی مذہب کا قائل تھا۔ اور قرآن کی اس آیت پر انحصار کرتا تھا۔

"تمہارا دین تمہارے لئے اور میرا دین میرے لئے"۔

مصر کا ایک حالیہ مفکر "شیخ خلیل محمد اپنی کتاب "ہم یہاں سے شروع ہوئے ہیں" (FROM HERE WE START) کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی اور علمائے اظہر نے اس کو ملحدانہ تصنیف قرار دیا۔ مگر حکومتِ مصر نے اس فتوے سے اتفاق نہ کیا۔ شیخ خلیل کا بنیادی خیال یہ تھا کہ اس کے ملک کی حقیقی ضرورت مغربی خطوط پر مادی ترقی ہے۔ کیونکہ اخلاق اور روحانیت مادی ترقی کے بغیر بے معنی الفاظ ہیں۔ اس کا مادی ترقی پر زور دینا ایک طرح سے اشتراکیت کے نظریہ "مادی جدلیات" کے مشابہ تھا۔

اس نے دو تجاویز پر خاص طور پر زور دیا۔

۱۔ ضبط تولید۔

۲۔ عورتوں کے حقوق کی بحالی اور معاشرے میں انہیں جائز مقام دینا۔

انیسویں صدی کی تحریک تجدید کا بہترین نمائندہ عبدہٗ تھا۔ جو جمال الدین افغانی کا دوست اور شریک کار تھا۔ اگرچہ ان ہر دو میں بنیادی اختلافات بھی تھے۔

شیخ خلیل کی طرح عبدہٗ بھی یورپ کی تہذیب آزادئ خیال اور ترقی سے بہت متاثر تھا۔ اس کا مدعا سارے ملک میں آزادئ خیال کے تصور کو پھیلانا تھا۔ جامع ازہر اس کے خیال میں ایک بے جان قدیم پتھر کی طرح ساکن ادارہ ہو چکا تھا۔ اور وہ اس جامع ازہر کو زمانۂ حال کی ایک اوّل درجہ کی یونیورسٹی میں تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ اس کا اثر سارے ملک پر پڑے۔ قدامت پسندوں نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ مگر اس کا یہ خواب اس کے مرنے کے بعد ایک حقیقت بن گیا۔ جب قاہرہ میں ایک زمانۂ حال کے مطابق کی یونیورسٹی قائم ہوئی۔ اور ناصر نے ایک مذہبی ادارے کو ایک بڑے غیر دینی ادارے میں بدل دیا۔

عبدہٗ پرانے طریقہ تعلیم، شیوخ اور علماء کا، جو زمانہ کے رجحانات سے قطعی طور پر ناواقف تھے مخالف تھا۔ جب اس کو مفتی مقرر کیا گیا۔ تو اس نے دو اہم فتوے دیئے۔

۱۔ مصوّری اور زندہ لوگوں کی مجسمہ سازی بشرطیکہ وہ بُت پرستی کی طرف نہ لے جاتی ہو جائز ہے۔

۲۔ بنکوں میں سُود پر روپیہ جمع کرنا ناجائز نہیں اس کا اعتقاد تھا کہ اسلام ایک معقول المعنی مذہب بن سکتا ہے اگر اس کی قدیم تشریح کو زمانۂ حال کے لیئے پابندی مطلق نہ سمجھا جائے اور مذہب کی تشریح زمانہ کے تقاضوں کے مطابق معقول اور مؤثر طریقہ سے کی جائے۔ اس کے خیال میں ڈارون کے نظریہ کا قرآن کے ساتھ کہیں تضاد نہیں پایا جاتا۔ قرآن اور سائنس دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔

مصر کے ایک اور مفکر ڈاکٹر طٰحٰہ حسین تھے جو ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کو مصر کے دانشوروں کا مثالی نمونہ کہا جاتا ہے۔ ان کی تصنیف (PRE ISLAMIC POETRY) "قبل از اسلام کی شاعری" نے سارے ملک میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ کیونکہ انہوں نے قرآن اور حدیث کی حقیقت پر ہی شبہ کا برملا اظہار کر دیا۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے خانہ کعبہ کو تعمیر کرنے کو اس نے ایک افسانے سے زیادہ وقعت نہ دی۔ قدرتاً اس مبصر پر سخت نکتہ چینی ہوئی۔

عرب قومیت

عرب قومیت کا مطلب مذہب کو سیاست سے علیحدہ رکھنا ہے یہ نظریہ اس اصول پر مبنی بیان کیا جاتا ہے کہ مذہب غدار کے لئے اور ملک لوگوں کے لئے ہے۔ اسی نظریے کے مطابق تمام عرب حکومتیں ایک لحاظ سے غیر دینی حکومتیں ہیں۔ اگرچہ ذاتی شخصی اور فوجداری اسلامی قانون کئی عرب ملکوں میں لاگو ہے۔ حقیقی اسلامی حکومت کسی بھی عرب ملک میں نہیں۔ سعودی عرب اور لیبیا بھی جو ظاہرہ طور پر مسلم قوانین کے اطلاق کے حامی ہیں۔ مذہبی حکومت نہیں کہلائے جا سکتے۔ تمام عرب ممالک میں سوائے سعودی عرب، کے قومیت کو مذہب پر فوقیت دی جاتی ہے۔ وجہ اس کی یہ بیان کی

جاتی ہے کہ عرب حضرت موسیٰ اور رسول اللہ سے پہلے بھی عرب تھے۔ مگر وہ اس بات کو نظر انداز کرتے ہیں۔ کہ اگر وہ اب ایک قوم یا ایک قوم کے مختلف گروہ ہونے پر فخر کرتے ہیں تو یہ اسلام کا مشترکہ عنصر ہی تھا جس نے مختلف قبائل کو ایک قوم میں متحد کر کے ان کو روم کی غلامی سے آزاد کرایا۔ عربوں نے قومیت کا نظریہ دراصل یورپ سے لیا ہے۔ جو اٹلی کے اتحاد کے بعد یورپ میں ایک عام نظریہ بن گیا تھا۔ عربوں کا اسلام کی قدر مشترک پر قومیت کو ترجیح دینا ان کو اسلام کے ایک بنیادی اصول سے متصادم کرتا ہے۔ کیونکہ اسلام مذہب کے بندھن کو زیادہ اور قومیت، نسل، زبان، اور علاقہ رہائش کو ثانوی حیثیت دیتا ہے۔ اگر ان عناصر کو اسلام تسلیم بھی کرتا ہے۔ تو کسی اور غرض سے جو قرآن نے خود بیان کر دی ہے۔ یعنی مسلم ممالک کے مختلف طبقوں کے لئے وطن و زبان اور نسل ایک ذریعہ شناخت ہیں۔ مگر ان عناصر کو وہ اسلامی اخوت کے بنیادی اصول سے متضاد ہرگز نہیں سمجھتا۔ موجودہ عرب حکومتیں مغربی حکومتوں کی پیداوار ہیں۔ کیونکہ ان طاقتوں نے عربوں کو اپنے مسلم حاکموں یعنی ترکوں کے خلاف بغاوت کرنے اور ان سے جنگ کرنے کے عوض ان کی محافظت کا وعدہ کیا۔ اور ان کو دو چھوٹی ریاستیں بھی عطا کر دیں۔ ترکی سے اس بے وفائی کا سرکردہ شریف حسین حجازی تھا جس کے ایک بیٹے کو عراق اور دوسرے کو یردن کی بادشاہت ملی۔

ترکیہ | ترکیہ میں مذہبی انقلاب برپا کرنے کی شہرت یا بدنامی کا ذمہ دار ایک شخص ضیا گوکلپ (۱۹۲۴-۱۸۷۶ء) ہے جس نے اپنی تصنیف (TURKISH NATIONALISM ANDWESTERN CIVILISTION) "ترکی قومیت اور مغربی تہذیب" میں ترکیہ میں قومیت کے مغربی تصور کو داخل کیا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ مغربی تہذیب دراصل بحیرہ روم کی قدیم تہذیب کی شاخ ہے۔ جس کے بانی اہل سمیر، فونیشن سیتھین اور ہکسو ترک تھے۔ اس لئے وہ کلی طور پر مغربی تہذیب کو اپنانے اور ترکیہ کو یورپ کا حصہ بنانے کے حق میں تھا۔ ملت کی فوقیت اور انسان کی عالمی اخوت کے نظریہ کو وہ مسترد کرتا تھا۔ اس کا قول تھا کہ قوم کی وفاداری کو مذہب اور کنبہ کی وفاداری پر ترجیح حاصل ہے۔ اور اس نے اپنے وقت کی سیاسی اور مذہبی صورت کو ترک کر دینے کا پرچار کیا۔ اور ترکی کو دور حاضرہ کی یورپی طرز کی غیر دینی حکومت میں تبدیل کرنے کی تبلیغ کی۔ جس سے علماء اور مذہب کے رسوخ کو قطعی طور پر خارج کر دیا جائے۔ اس کے نزدیک مذہب ایک انفرادی معاملہ ہے اس نے پُرزور طریقہ سے یہ سوال اٹھایا "کیا ہم مغربی تہذیب اختیار کر کے ترک اور مسلمان نہیں رہ سکتے"، اس نے بہت سے مذہبی اداروں پر نکتہ چینی کی۔ اور ان کو ترک کر دینے کا مشورہ دیا۔ تاکہ اسلام زمانہ حال کا ایک سائنسی مذہب بن جائے۔ اسلام میں عورتوں کا درجہ، قانون وراثت، عربی زبان میں نماز پڑھنا، نماز کا طریقہ، سب اس کے حملے کا ہدف بنے۔ اپنی ایک تحریر میں اس نے کہا کہ تنظیمات کے سرکردہ لوگوں کی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے مشرق اور مغرب کے اختلاط سے ایک ذہنی آمیزش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس بات کو انہوں نے نہیں سوچا کہ دو متضاد اصولوں کی آمیزش ناممکن ہے۔ ہماری سیاسی

ساخت میں دورنگی، دو طرح کی عدالتوں کا سلسلہ، دو مختلف قسم کی درس گاہیں، ٹیکس کے دو علیحدہ محکمے، دو بجٹ، دو قسم کے قانون یہ سب اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہیں۔ مشرق اور مغرب کے ملاپ کی کوشش کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ ازمنۂ وسطیٰ کے حالات کو دورِ حاضرہ میں جاری کیا جائے۔ اور ایک فرسودہ نظام میں جان ڈالنے کی بے سود کوشش کی جائے۔ یہ ایسی ہی کوشش ہے۔ جیسے کہ جنا سریوں اور موجودہ زمانہ کی فوج کو یکجا کر کے ایک لشکر تیار کیا جائے۔ یا قدیم طریقۂ علاج اور موجودہ سائنسی طریقہ علاج کو ملا دیا جائے۔ یا قدیم اور فرسودہ قانون اور زمانۂ حال کے قانون کو اکٹھا کر دیا جائے۔ یہ تینوں صورتیں ناممکن ہیں۔

کمال اتاترک

ضیاء کے خیالات سے متاثر اور سیاسی حالات سے مجبور ہو کر اتاترک نے ترکیہ کو ایک غیر دینی حکومت کی شکل دے دی۔ اور مغربی تہذیب کو کلی طور پہ اپنا لیا۔ ان سیاسی حالات کا جو ترکیہ میں انقلاب کا باعث بنے۔ مختصر ذکر پہلے آچکا ہے۔ یہاں یہ کہ دنیا کافی ہو گا۔ کہ سیاسی حالات حکومت میں دوانگی ورشوت خوری جس نے تمام نظام حکومت میں گھر کر لیا تھا۔ اختیاراتِ مطلق جو سلطان ترکی کے ہاتھ میں تھے، مسلم عرب ممالک کا پہلی جنگِ عظیم میں ترکی کے خلاف رویہ، اقلیتوں کا مسئلہ، ملک کی عام پسماندگی اور مسائل جو ضیا گوکلپ نے اٹھائے تھے؛ ان سب نے اتاترک کو مجبور کر دیا کہ موجودہ نظام کو ختم کر دیا جائے۔ ویسے بھی اتاترک ضیاء کا ہم خیال تھا۔ اتاترک نے سلطان اور خلیفہ کے دونوں عہدوں کو ختم کر کے ترکیہ کو موجودہ زمانہ کی غیر دینی جمہوریہ میں تبدیل کر دیا، جس میں پارلیمنٹ بذریعہ انتخاب چنی جاتی تھی۔ اس نے مذہبی رجحانات میں کئی تبدیلیاں نافذ کیں۔ جن میں مذہبیت کی ظاہری علامات مثلاً طربوش اور پگڑی کے پہننے کی ممانعت، جمعہ کی بجائے اتوار کی چھٹی، لوگوں کو خاندانی نام اختیار کرنے کی ہدایت، رومی ابجد کا اجراء اور نماز کا عربی کی بجائے ترکی زبان میں ادا کرنا۔ شامل ہیں۔

علامہ اقبال نے ترکیہ کے اس انقلاب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور اس کے مذہبی پہلو پہ بہت سوچ بچار کی۔ آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ترکیہ میں قومی اسمبلی کا بذریعہ انتخاب قیام اور خلافت کی بجائے جمہوری طرزِ حکومت اختیار کرنے کو اجتہاد ترکیہ کہا جا سکتا ہے۔ اور اس تبدیلی پر کوئی مذہبی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

علامہ ضیاء کے اس خیال کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔ جو اس نے مندرجہ ذیل الفاظ میں ظاہر کیا تھا۔

"انسان کے روحانی پیشوا کون تھے! بلاشبہ رسول اکرم اور زاہد، اور متقی لوگ، ہر زمانہ میں مذہب نے فلسفہ پہ سبقت رکھی ہے اور صرف اسی وجہ سے علوم و اخلاق اور فنون روشنی پاتے ہیں۔ مگر پھر مذہب کمزور ہو جاتا ہے۔ اور اپنا اصلی جوش کھو بیٹھتا ہے۔ متقی لوگ کم ہو جاتے ہیں۔ اور روحانی پیشوائی برائے نام فقہا کی وراثت بن کر رہ جاتی ہے۔ فقہا کے ہادی حدیث اور روایت ہیں۔ فقہا مذہب کو اپنے راستہ پر چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر فلسفہ کہتا ہے۔ میرے ہادی عقل و دلیل ہیں۔ آپ دائیں طرف جائیں میں بائیں طرف جاؤں گا۔ مذہب اور فلسفہ

ہر دو انسانی روح پر حق جتاتے ہیں۔ اور اپنی اپنی طرف اس کو کھینچتے ہیں۔ جب تک یہ کشمکش جاری رہتی ہے۔ ثمر آور تجربہ سائنس کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔ اور نوجوان مفکر کہنے لگتا ہے۔ حدیث تاریخ ہے اور عقل تاریخ کا طریقہ، تشریح کے ذریعہ ہر دو ایک ہی ناقابلِ تعریف نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ مگر یہ ناقابلِ تعریف کیا چیز ہے؟ یہ روح سے متاثر شدہ دل ہے۔ اگر یہ بات درست ہے۔ تو میری آخری بات سنیئے۔ مذہب ایک اثباتی سائنس ہے جس کا مدعا انسان کے دل کو روح سے کلی طور پر متاثر کرتا ہے۔"

اسی اقتباس پر علامہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

دان سطور سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر نے کس خوبصورتی سے کامتے (COMTE) (فرانسیسی فلسفی) کے اس خیال کی ترجمانی کی ہے کہ انسان کی دماغی ترقی کی تین منزلیں ہیں۔

۱۔ مذہب۔

۲۔ فوق الفطرت طبعیات۔

۳۔ سائنس۔

اور اسی خیال کو جو ان سطور میں پیش کیا گیا۔ شاعر نے کس خوبصورتی سے اسلام کے نظریے سے ملایا ہے ترکیہ کے سلسلہ تعلیم میں عربی کے مقام کو ظاہر کرتے ہوئے ضیا آگے چل کر کہتا ہے۔

"وہ سرزمین جہاں قرآن ترکی زبان میں سمجھا جاتا ہے۔ جہاں ہر شخص خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا خدا کے حکم کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ او ترکی کے فرزند وہ تیرا وطن ہے۔"

شاعر کے اس خیال کی بابت جو اس نے عورتوں کے متعلق ظاہر کیا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ آج کل کی مسلمان قوموں میں صرف ترک قوم ہے۔ جو اپنے غیر استدلالی نظریہ سے بیدار ہو کر اپنی حیثیت سے آگاہ ہوئی۔ اور اس نے آزاد خیالی کا حق حاصل کیا۔ اور صرف یہی قوم ہے جو تخیل سے حقیقت تک پہنچی ہے۔ اور یہ ایسی تبدیلی ہے۔ جس میں نازک خیالی، صلاحیت اور اخلاقی کشمکش پنہاں ہیں۔

اتحاد المسلمین

اتحاد المسلمین کا تصور وطنیت کا کلی طور پر مخالف نہیں۔ بلکہ کچھ حد تک اس کو سیاسی اور مذہبی لحاظ سے تسلیم کرتا ہے۔ اس تصور کے بانی جمال الدین افغانی تھے۔ اس نظریہ کا لب لباب یہ ہے کہ مسلمان قوم کے لئے، جو مختلف ممالک میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور مقامی حالات کے زیر اثر اپنی حکومت رکھتی ہے۔ مگر ایک مشترکہ سلسلہ اسلام میں بندھی ہوئی ہے۔ صحیح راستہ یہ ہے کہ جو مسلم ممالک غیر اسلامی حکومت کی رعایا ہیں ان کو چاہیئے کہ وہ آزادی کے لئے جدوجہد کر کے خود مختاری حاصل کریں۔ اور جو خود مختار اسلامی ممالک ہیں وہ ایک قسم کے وفاقی سلسلہ میں منسلک ہو جائیں۔ اگر سیاسی معنوں میں وفاق ناممکن العمل بھی ہو تب بھی بہت سے ایسے امور ہیں۔ جن میں ایک دوسرے کے ساتھ مفاہمت اور تعاون کے ذریعہ ترجیحی تعلقات قائم ہو سکتے

ہیں۔ مگر اصل مدعا سیاسی وفاق ہی ہونا چاہیئے۔ اس طرح سے مسلم ممالک ایک نظام میں جس کو لیگ آف مسلم نیشنز (مسلمان قوموں کا اتحاد) کا نام دیکھا جا سکتا ہے۔ منسلک ہو سکتے ہیں۔ اتحاد المسلمین کا خیال ایک عرصہ سے مسلمانوں کے دلوں میں اُبھر رہا ہے۔ اور اس سلسلے میں کچھ ابتدائی اقدام بھی لیئے جا چکے ہیں۔ مگر ایسا وفاق شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے یا نہیں ایک ایسا سوال ہے۔ جس کا سردست ٹھیک طور پر اثبات میں جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اسی لیئے بعض مفکرین کا خیال ہے کہ دنیا کی موجودہ صورت میں، اور ان مشکلوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے جو کہ ہر حکومت کی خارجہ پالیسی، بین الاقوامی اہمیت اور جغرافیائی جائے وقوع، اور ہر حکومت کے اپنے اپنے نظریہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ مجوزہ وفاق کو نہ ہی عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس خیال کو ایک مفید ادارے کی شکل دی جا سکتی ہے۔

اگرچہ حکومتوں میں تجارت کے معاملہ میں ترجیحی سلوک، باہمی معاونت اور ایک مشترکہ تہذیب کے امکان موجود ہیں۔ اسلام کی ابتدائی تہذیب پر اس وفاق کا کیا اثر پڑے گا۔ اس کے متعلق قیاس آرائی تو ہو سکتی ہے مگر اس کا صحیح جواب ڈھونڈنا مشکل ہے۔ ان حکومتوں کے دیگر ممالک کے ساتھ معاہدات، ان کی آپس میں اقابت بلکہ دشمنی جو لڑائی تک لے جا سکتی ہے، ان کی آئندہ ترقی کے امکانات، نسل و زبان اور علاقائی تفرقات بڑھتا ہُوا قومیت کا جذبہ مزید ایسے وجوہ ہیں۔ کہ جن سے شک پیدا ہوتا ہے۔ کہ آیا سب اسلامی ممالک اس وفاق کو قبول بھی کریں گے یا نہیں۔ اگر ان ممالک میں آئمہ اربعہ کی فقہہ کو قبول کرنا بھی شامل ہو۔ تو سوال اور بھی ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ اور یہ امر بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ بڑی بڑی طاقتیں اس قسم کے اتحاد کو بے پروائی اور بے نیازی سے نہیں دیکھ سکیں گی۔ ان طاقتوں کے اپنے مفاد چند اسلامی ممالک کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور دنیائے اسلام ان طاقتوں کے ارادوں اور پالیسیوں سے بے خبر نہیں رہ سکتی۔

حال ہی میں جدہ کانفرنس میں جو دو فیصلے ہوئے ہیں۔ یعنی بے گھر فلسطینیوں کی امداد اور ان کا وطن ان کو واپس دلانا۔ اور مسلمان ممالک کو ان کی فلاح اور بہبود کی غرض سے بھاری رقم دینا حوصلہ افزا اقدام ہیں۔ اور مزید اتحاد کے لئے اور بھی اقدام کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً مستحق مسلم ممالک کو ایک مشترک سرمایہ سے قرض دینا اور بھاری اسلحہ تیار کرنا۔ صنعتی مشینیں اور موٹر، ٹریکٹر اور مصنوعی کھاد کے کارخانے لگانا۔ یہاں تک کہ علامہ اقبال کا لیگ آف مسلم نیشنز کا خواب ایک حقیقت بن جائے۔

میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ کہ شریعت، قرآن، حدیث اور اجماع کا نتیجہ ہے۔ اور مسلمانوں کی اکثریت اسی نتیجہ کو جو عقیدہ، قانون، مذہبی رسوم اور عمل کے متعلق ہے کو صرف آخر سمجھتی ہے۔ اس لیئے شریعت کے قواعد جو آئمہ اربعہ کے مجموعات میں جمع کیے گئے ہیں، ایک ساکنیت اختیار کر چکے ہیں۔ مگر کائنات اور جو کچھ اس میں ہے متحرک شے ہے۔ اور کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا کہ کائنات کی ہر شے میں کچھ تبدیلی واقع نہ ہوتی ہو۔ ان چار فرقوں کی بنیاد پڑنے کے بعد کئی اور جماعتیں بھی پیدا ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ اسلام کی دوسری صدی کے

شروع ہونے تک فرقوں کی تعداد بڑھ کر ۱۹ تک پہنچ گئی۔ غور طلب یہ بات ہے کہ اگر دنیا میں کوئی چیز بھی ساکن نہیں۔ کیونکہ ہر چیز، خواہ وہ جان دار ہو یا بے جان یا کسی دوسرے وجود کے ساتھ حرکت کرتی ہے اسی طرح دنیا اپنے خیالات، علم، عمل، اور طرز زندگی کو تبدیل کرتی رہتی ہے۔ اور انسانی سرگرمیاں بھی ہمیشہ اسی قانون تبدیلی کے تحت اپنی وسعت اور نوعیت بدلتی رہتی ہے جس وجہ سے اس قانون میں جوان سرگرمیوں کو اپنے تابع رکھتا ہے۔ انسان کو تبدیلیاں کرنی پڑتی ہیں۔ ہم میں اکثریت اس مکتب خیال سے تعلق رکھتی ہے۔ جس کا اعتقاد ہے۔ کہ آئمہ اربعہ اور ان کے شاگردوں نے جو مجموعات مرتب کیے ہیں۔ وہ اجتہاد مطلق کا نتیجہ ہیں۔ اور حرفِ آخر کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں نہ کسی تبدیلی اور نہ کسی اضافہ کی گنجائش ہے اور اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیئے بند ہو چکا ہے۔ اس مکتبِ خیال کے علما، جن فقہا یا آئمہ کی پیروی کرتے ہیں ان کے نتائج پر نظر ثانی کی اجازت نہیں دیتے۔ اور ان کے نتائج اور جس مواد یا دلیل پر وہ مبنی ہیں۔ کو حرف آخر سمجھتے ہوئے خارج از بحث قرار دیتے ہیں۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کے مدِ نظر کیا مجموعات شریعت میں کسی تبدیلی کی اجازت ہے اور اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو وہ کونسا طریقہ ہے جو مطلوبہ تبدیلی یا ترمیم اس میں کر سکتا ہے۔ یہ سوال اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر زمانہ کے حالات، کوئی نئی دریافت، انسان کا ضمیر اور قومی مفاد کسی تبدیلی کے متقاضی ہوں۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ آئمہ اربعہ جو شریعت کے مولف ہیں۔ ایسے سربرآوردہ اشخاص تھے۔ جو اپنی دماغی قابلیت اور جذبہ اشتیاق کی وجہ سے ساری ملت میں ایک اونچا مقام حاصل کر چکے تھے اور انہوں نے اور ان کے جانشینوں نے متواتر محنت، سرواری اور عرق ریزی سے اپنے لئے آنے والی نسلوں کے لئے ایک ایسا مجموعہ مرتب کیا کہ دنیا میں کوئی ایسا مکمل مجموعہ موجود نہیں۔ اور نہ کبھی ہوا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ دنیا میں کوئی ایسی مثال موجود نہیں کہ صرف چار نسلوں کے قلیل عرصہ میں جو کچھ کیا گیا یا کہا گیا پر مبنی اتنا جامع اور وسیع مجموعہ تیار کیا گیا ہو۔ کہ اس زمانہ کی شاید ہی کوئی ایسی بات ہو جو اس مجموعہ کے احاطہ میں نہ آگئی ہو۔ شیعہ قانون کی ترتیب کا کام دو اور صدیوں کے گذرنے کے بعد مرتب ہوا۔ مگر بات پھر بھی باقی ہی ہے اگرچہ بعد میں وقتاً فوقتاً کئی مجتہدین پیدا ہوئے مثلاً ابن دقیق العید، ابن تیمیہ، سیوطی، ابن حزم اور عبدالوہاب سُنّی شریعت ایک مضبوط چٹان کی طرح وہیں کھڑی ہے۔ جہاں اس کو تقریباً ایک ہزار سال پہلے کھڑا کیا گیا۔ جس میں تبدیلی کا امکان نہیں۔ اور جو اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتی۔ اور نہ کوئی اس کو ہلا سکتا ہے۔ اور شریعت کے اس جمود اور قطعیت نے اسلام کے مستقبل کے لئے ان لوگوں کے دلوں میں ایک تشویش پیدا کر دی ہے جن کی اسلامیت ہر قسم کے شبہ سے بالاتر ہے۔ اور جن کا مدعا صرف یہ ہے۔ کہ اسلام کو زندہ اور مردہ خیالات کے اختلاط سے محفوظ رکھا جائے۔ تاکہ اس کے مستقبل پر کوئی مضر اثر نہ پڑے۔ اور مسلمان ترقی یافتہ ملکوں کے شہریوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہو سکیں۔ آئمہ اربعہ اور ان کے شاگردوں کے اجتہاد کے نتائج کی تقلید

کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان اہم شخصیتوں نے اپنی دماغ سوزی، تعقل، قوت استخراج اور اپنی مثالی زندگی سے بعد کی نسلوں کے دلوں میں ایسا احترام اور مقام پیدا کر دیا تھا کہ ان کے خیالات کے خلاف کوئی بات کہنا ایک قسم کی بدعت سمجھا جانے لگا۔ آخر میں علامہ اقبال ایک بنیادی سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا قانون اسلام ترقی پذیر ہو سکتا ہے اسی سلسلہ میں وہ اسلامی قانون کے ماخذ پر بحث کرتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ قرآن چند عام اصول اور قواعد قانونی نوعیت کے وضع کرتا ہے۔ اور کچھ قانونی ادارے قائم کرتا ہے۔ آخر الذکر کو وہ اسلام کا جزو لاینفک سمجھتے ہیں، جن کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ مگر جہاں تک قانونی اصولوں کا تعلق ہے۔ وہ اس رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ کہ زمانۂ حاضرہ کے مسلمان آزاد خیال طبقہ کا دعویٰ کہ بنیادی اصولوں کی اپنے تجربہ اور موجودہ طرز زندگی کی روشنی میں نئی تشریح کی جا سکتی ہے۔ درست ہے قرآن کی اس تعلیم سے کہ زندگی ایک ترقی پذیر عمل کا نام ہے۔ یہ ضرورت پیدا ہوتی ہے کہ ہر ایک پشت اپنے متقدمین سے راہنمائی حاصل کر کے مگر ان کے خیالات سے مقید نہ ہو کر اپنے معاملات خود حل کرے۔

علامہ ان حدیثوں میں جن کی صرف قانونی حیثیت ہے اور دوسری حدیثوں میں جو یہ خصوصیت نہیں رکھتیں، ایک فرق بیان کرتے ہیں۔ پہلی قسم کی احادیث کے متعلق ان کا نظریہ یہ ہے۔ کہ یہ بات غور سے دیکھی جائے کہ ان میں کس حد تک رسول اللہ نے قبل از اسلام کے رواج کو صریح طور پر تسلیم کیا ہے یا کہ ان کا اطلاق عالمگیر ہے۔

آپ شاہ ولی اللہ سے ایک اقتباس دے کر ان سے اتفاق کرتے ہیں۔ جہاں انہوں نے فرمایا ہے کہ نبی ایک ضابطہ قواعد امت کو دیتا ہے جس پر امت کو عمل کرنا پڑتا ہے مگر اس ضابطہ اصول کے مرتب کرنے میں وہ ان قواعد پر عمل کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی عادات اور رسم و رواج کو ملحوظ رکھتے ہیں جو اسلام قبول کرنے سے پہلے رائج تھے اور پھر آگے چل کر شاہ موصوف اس رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ کہ ان قواعد سے جو احکام اخذ کئے جاتے ہیں۔ مثلاً جرائم کی سزا وہ انہی لوگوں کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ جن میں وہ قبل از اسلام رائج تھے۔ اور کیونکہ ان قواعد پر عمل کرنا بذات خود ایک مدعا نہیں۔ ان کا اطلاق آنے والی نسلوں پر سختی سے نہیں ہو سکتا۔ علامہ آگے چل کر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ کہ امام ابو حنیفہ کا ان احادیث کے متعلق نظریہ جو خالص قانونی حیثیت رکھتی ہیں۔ کہ ان پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ بالکل درست ہے۔ اور اگر زمانۂ حال کے آزاد خیال لوگ ایسی حدیثوں کا بطور ماخذ قانون عام استعمال مناسب نہیں سمجھتے تو وہ اسلام کے ایک بڑے شارح (امام ابو حنیفہ) کی پیروی کرتے ہیں۔

بعد میں آنے والی نسلوں کو وہ صحابہ کرام کے قانونی فیصلوں کا پابند نہیں سمجھتے اور کرخی کے خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ یہ نسلیں قانون کی سابقہ روایات کی پابند نہیں۔

علامہ اسی مسئلہ پر بھی بحث کرتے ہیں۔ کہ کیا بذریعہ اجماع قرآن کی کوئی آیت منسوخ کی جا سکتی ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ لفظ اجماع جب صحابہ کے اجماع کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ تو قانون کی تعبیر کرنے کے

اختیار مطلق کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مگر یہ اختیار صرف قرآن کی کسی آیت کو وسیع یا محدود کرنے کے لئے استعمال ہو سکتا ہے۔ اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ آیت متنازع کو منسوخ سمجھا جائے۔ اور اس کی جگہ کسی اور قاعدہ قانون کو جگہ دے دی جائے۔

اسلام کا مختصر انسائیکلو پیڈیا (SHORTERENCYCLO PEDIA OF TSLAM کے ایڈیٹر صفحہ ۱۵۷ تا ۱۵۸ پر اجماع کے متعلق اس طرح اظہار رائے کرتے ہیں کہ عملاً اجماع کے اصول کو بہت وسیع کر دیا گیا ہے۔ رسول اللہ کی بنیادی حدیث ابن ماجہ (باب ۸۔ فتاں) اس طرح ہے۔

"میری اُمت کسی غلط بات پر کبھی متفق نہیں ہو گی"

اور قرآن میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے۔ جو ایسا راستہ اختیار کریں جو مومنوں کا نہیں (۴/۱۱۵) نتیجتاً اُمت کے تخیل اور عمل میں ایک ایسی طاقت موجود ہے جو نئے اصول اور قانون پیدا کر سکتی ہے۔ بجائے اس کے کہ جو کچھ ماضی میں کہا گیا اس پر تصدیق کی مہر لگا دی جائے۔ اجماع کے ذریعہ جو کام یا فعل پہلے بدعت اور خلاف اسلام سمجھا جاتا تھا جائز بن جاتا ہے اور سابقہ سنۃ پر اس کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے اجماع کو بہت لوگ خواہ وہ اسلام کے اندر ہوں یا باہر، اصلاح کا ایک طاقتور ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اجماع کو کسی کسی جگہ قرآن کی آیات پر بھی فوقیت دی گئی ہے۔ اجماع نے نئے قاعدے ہی وضع نہیں کئے۔ بلکہ تصفیہ شدہ مسائل کو بھی بدل ڈالا ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے (اگرچہ اس میں اتفاق رائے نہیں) کہ مسلمان اسلام کو حسب چاہیں اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتے ہیں۔ اسی اصول کی تائید مسئلہ نسخ و تنسیخ سے بھی ہوتی ہے۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ کس طرح اور کیوں حضرت عمر نے قرآنی آیات کے اصول کو دریافت کر کے رائج الوقت عمل کو تبدیل کیا۔

انسائیکلو پیڈیا کے ایڈیٹر کی یہ رائے کہ اسلام کو مسلمان جیسا چاہیں بنا سکتے ہیں۔ کلی طور پہ صحیح نہیں کیونکہ اسلام وحی اور سنت پر مبنی ہے۔ اسلام کی ساخت اور اس کے عقائد میں چند ابدی اصول ہیں جو کبھی طرح بھی نہیں بدلے جا سکتے۔ ناسخ و منسوخ کے مسئلہ پر بھی علماء میں کلی طور پر اتفاق نہیں۔ البتہ یہ درست ہے۔ کہ قدامت پسند یا تقلید پسند حلقہ مسئلہ ناسخ و منسوخ پر متفق ہے ناسخ و منسوخ کا مسئلہ یہ ہے کہ تبدیلیٔ حالات کی وجہ سے قرآن کی ایک آیت کو بعد کی آیت منسوخ کر سکتی ہے۔ بعض لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا نے کوئی وحی ایسی نازل نہیں کی جس کو بعد میں بدلنے کی ضرورت پڑے۔ اسلام کے عام مفہوم کے ساتھ کئی ایک دعوے اور مطالبے شامل ہو چکے ہیں۔ جن کا ہمارے علماء اور واعظ پلیٹ فارم یا مسجد کے منبر سے روزانہ اعادہ کرتے ہیں۔ ہمیں ان دعوؤں کی نوعیت پہ اور جو نتائج ان سے پیدا ہوتے ہیں پر ایک نظر ڈالنی چاہیئے۔

پہلا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ جس میں کسی ترمیم یا اضافہ کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ ضابطہ دوامی ہے۔

دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ مذہب اور سیاست یا ریاست (STATE) میں کوئی فرق نہیں اور اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو یہ خصوصیت رکھتا ہے۔

تیسرا دعویٰ (قدامت یا تقلید پسندوں کا) یہ ہے کہ جو تشریح آئمہ اربعہ نے یعنی امام ابوحنیفہ، مالک شافعیؒ، احمد بن حنبل اور امام ابوحنیفہ کے شاگردوں امام محمد اور ابویوسف نے کی ہے اور اس کی بناء پر جو مجموعے تیار کئے ہیں۔ ان پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اور ان کو حرفِ آخر کا درجہ حاصل ہے۔ ان مجموعوں میں اسلام کی آخری شکل ہے۔ اور آنے والی نسلوں کے لئے کسی مزید تحقیق و تفکر کی ضرورت نہیں بلکہ ایسا کرنا ممنوع ہے۔ ان تصانیف میں درج عقائد اور قواعد و ضوابط سے نہ ہم باہر جا سکتے ہیں۔ اور نہ ان میں کوئی اضافہ کر سکتے ہیں۔

چوتھا دعویٰ ہے کہ اگر کوئی نیا مسئلہ پیدا ہو تو اس کو شریعت کے ماہر علماء ہی حل کر سکتے ہیں۔ ان سب دعووٗں میں مسئلہ اجتہاد کو بالکل فراموش کر دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقلید پسند لوگوں کے مطابق آئمہ اربعہ نے بذریعہ اجتہاد جو قواعد مرتب کئے۔ وہ اجتہاد مطلق کا نتیجہ تھے اور آئندہ کے لئے اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ اگر جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ درست ہے۔ تو اس سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں۔

۱۔ کہ اسلام میں مزید قانون سازی کی ضرورت نہیں۔ صرف شریعت کی تشریح کا حق باقی رہ جاتا ہے جو شریعت صدیوں پہلے مرتب ہوئی۔ جبکہ معاشرہ کی صورت بالکل مختلف تھی۔ مگر تاریخ اور تجربہ شاہد ہیں۔ کہ ہر ایک اسلامی ملک کے قانون میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض ممالک میں یہ شرط عائد ہو پائی جائے کہ نیا قانون قرآن اور سنّہ سے متصادم نہ ہو۔

ذیل میں چند مثالیں سوالات کی شکل میں دی جاتی ہیں۔ جن کا صحیح جواب بوجہ تبدیلی مکان و زمان اور ترقی سائنس مزید اجتہاد کئے بغیر نہیں دیا جا سکتا۔

۲۔ ایک شخص مر جاتا ہے۔ اور ایک یتیم بچہ چھوڑ جاتا ہے۔ اس کے بعد اس شخص کا باپ بہت سی جائداد چھوڑ جاتا ہے۔ کیا یہ بچہ اپنے دادا کی جائداد میں کوئی ورثہ کا حق رکھتا ہے۔ یا اس کا چچا اس کو ورثہ سے قطعاً محروم کر دے گا۔ اس سوال کا جواب عائلی قوانین کے آرڈی ننس کی مدد سے نہ دیا جائے کیونکہ تقلید پسند علماء اس آرڈی ننس کو خلاف اسلام قرار دیتے ہیں۔

۳۔ ایک نوجوان عورت کو اس کا شوہر طلاق دیتا ہے۔ عدت کی میعاد گذرنے کے بعد شوہر اپنی مطلقہ بیوی کو پھر نکاح میں لینا چاہتا ہے۔ (یہاں بھی عائلی قوانین کے آرڈی ننس کو چھوڑ دیجئے) کیا یہ

نکاح جو دوبارہ، پڑھا گیا جائز ہوگا۔ اگر مطلقہ نے کسی اور کے ساتھ شادی کر کے طلاق حاصل نہیں کی اور اس نے دوسرے خاوند کے ساتھ مباشرت بھی نہیں کی۔

۳۔ ایک عورت کو طلاق دی جاتی ہے۔ عدت کی میعاد گذرنے کے بعد مگر طلاق سے اٹھارہ مہینے بعد اس عورت کے ایک صحت مند بچہ پیدا ہوتا ہے۔ کیا اس بچہ کو طلاق دینے والے شوہر کا جائز بچہ قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کی کفالت کی کس پر ذمہ داری ہوگی۔

۴۔ ایک زنا بالجبر یا محض زنا کے مقدمہ میں صرف دو عورتیں گواہ ہیں۔ مگر ہیں دونوں قابلِ اعتبار۔ کیا اس گواہی پر زانی کی سزا فقہ کے مطابق صحیح ہوگی۔

ایک اسلامی حکومت بت پرستوں کے ساتھ ایک معاہدہ کرتی ہے جس سے ان کو اسلامی مملکت میں آنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ اور ان کو یہ بھی اجازت ہے۔ کہ اس ملک میں آ کر وہ عوام میں بُت پرستی کا پرچار بھی کر سکتے ہیں۔ کیا یہ معاہدہ درست ہوگا۔ اور اسلامی مملکت کی عدالت اس معاہدہ کی تکمیل کرا سکتی ہے

اسلامی حکومت کی باشندہ ایک مسلمان عورت دیانتدارانہ طور پر اور صدق دل سے عیسائی ہو جاتی ہے کیا اس عورت کو موت یا رجم کی سزا دی جا سکتی ہے۔ یا اس کو بطور ایک آزاد عورت کے زندگی بسر کرنے اور ایک عیسائی مرد سے شادی کرنے کی اجازت ہوگی۔

۵۔ اسلامی حکومت ایک بین الاقوامی معاہدہ میں فریق ہے۔ اور اسی معاہدے کے مطابق ایک قانون بناتی ہے۔ جس کی رو سے رجم اور قطع بدین کی سزا کو ترک کر دیا جاتا ہے۔ کیا یہ قانون شریعت کے مطابق ہوگا۔

۶۔ ایک شادی شُدہ شخص سفر پر روانہ ہوتا ہے اور سات سال تک نہ وہ واپس آتا ہے۔ نہ اس کے زندہ ہونے کی کوئی خبر آتی ہے۔ اس کے زندہ ہونے یا مر جانے کی کوئی شہادت نہیں۔ اس کی بیوی دوسری شادی کر لیتی ہے۔ کیا یہ شادی جائز سمجھی جائے گی۔ پہلا خاوند اور عورت سنی ہیں۔ اس سوال کے جواب میں ایکٹ ۸ سنہ ۱۹۳۹ء کا حوالہ نہ دیا جائے۔ اور اہل تشیع اس سوال کا جو جواب دیں گے مجھے معلوم ہے۔

۷۔ شریعت کا نظریہ اس شادی کے متعلق کیا ہے۔ جس میں ایک فریق مسلمان ہے۔ اور شادی سپیشل میریجز ایکٹ (SPECIAMARRIAGESACT) کے مطابق ہوتی ہے۔ کیا اسلامی قانون مسلم فریق کو شادی کو قابلِ تعزیر بناتا ہے۔ کیا ایسے شخص کو سزا دی جائے سکے گی۔

۸۔ ایک شخص جو عربی زبان سے ناواقف ہے۔ نماز کا اپنی زبان میں ترجمہ کراتا ہے۔ اور اسی زبان میں صدق دل سے نماز ادا کرتا ہے۔ کیا ایسی نماز شریعت کے مطابق صلوٰۃ کی شرط پوری کرتی ہے۔ اور اگر حکومت بذریعہ ادارہ قانون ساز ملکی زبان میں نماز پڑھنے کا حکم دے۔ تو کیا یہ نماز بھی ایک فرض کی صحیح ادائیگی سمجھی جائے گی۔

۹۔ حکومت ایک قانون ورثہ بناتی ہے جس میں بہن کو بھائی کے برابر ورثہ پہنچتا ہے کیا یہ قانون شریعت میں قابلِ تعمیل ہو گا۔ بہن بھائی اور ان کا باپ سُنّی ہیں۔

۱۰۔ ایک مسلمان بحرِ منجمد کے کسی جزیرہ میں رہتا ہے اور روزہ اس وقت افطار کرتا ہے جبکہ سورج نظر آرہا ہے۔ کیا یہ افطار درست ہے۔

۱۱۔ کیا دفعہ ۱۱۲ ایکٹ شہادت شرع سے متصادم ہے۔ اور اسلامی ریاست میں نافذ العمل، ایک مرد اور عورت ایک ہی عمارت کے مختلف حصّوں میں رہتے ہیں، دونوں ایک دوسرے کے ساتھ شادی کر لیتے ہیں اور چند دن کے بعد عورت کے ایک بچہ پیدا ہو جاتا ہے کیا یہ بچہ شادی کرنے والے مرد کا جائز بچہ تصور کیا جائے گا۔

۱۲۔ دو ملکوں میں جنگ چھڑ جاتی ہے۔ ان میں سے ایک ملک مسلمانوں کے لیئے دار الحرب بن جاتا ہے، دوسرا دار السلام۔ کیا دار الحرب کے مسلمان دار السلام میں بلا روک ٹوک ہجرت کر سکتے ہیں۔ کیا دار السلام کی حکومت ان کی ہجرت پہ کوئی پابندی عائد کر سکتی ہے۔ اگر مہاجر پہ جاسوسی کا شبہ تک نہیں ہو سکتا۔ یہ سوالات پوچھنے میں میرا مدعا شریعت پر نکتہ چینی نہیں ہے۔ صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ایسے مسئلوں پہ غور و خوض کرنا اور ان کو بذریعہ اجتہاد حل کرنا ضروری ہے۔ اجتہادِ مطلق ان مسئلوں کو دورِ حاضرہ کے تقاضوں کے مطابق حل نہیں کر سکتا۔ دنیوی معاملات میں تو رسول اللہ کی ایک حدیث ہے کہ میں ایک انسان ہوں۔ جب میں کسی مذہبی معاملے میں حکم دوں اُس کی پیروی کرو۔ مگر جب کسی دنیوی معاملے میں حکم دوں تو میری حیثیت انسان سے بڑھ کر نہیں۔ ایک اور سوال جو اکثر مسلمانوں کے لیئے پیدا ہوتا ہے۔ یا پیدا ہو سکتا ہے یہ ہے کہ کس صورت میں ایک مسلمان دوسرے کو قتل کر سکتا ہے۔ اس وقت کئی ریاستیں مسلم حکومت کے ماتحت ایشیا اور افریقہ میں ہیں (ترکیہ بھی مسلم ریاست یا ملک ہے) ان خود مختار ریاستوں کے علاوہ بہت سے ایسے ملک بھی ہیں جہاں کثیر التعداد مسلمان غیر مسلم حکومتوں کی رعایا ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلم ریاستوں میں جنگ کی صورت پیدا ہوئی۔ اور مسلمانوں نے مسلمانوں کو قتل کیا۔

عرب نے ترک مارے اور ترکوں نے عرب، بنگلہ دیش والوں نے اپنے ہم وطن پاکستان کے مسلمان مارے۔ اور پاکستانی مسلمانوں نے بنگلہ دیش کے مسلمان، خود ہندوستان میں جب مسلمانوں کی حکمرانی تھی یہ صورت کئی دفعہ پیدا ہوئی۔ یہی صورت پاکستان اور بھارت یا افغانستان کے درمیان پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لیئے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جہاں ایک مسلم حکومت دوسری مسلم حکومت کے خلاف جنگ کا اعلان کر دے۔ تو یہ اعلان کہاں تک شریعت کے مطابق ہو گا۔ اور ان دونوں حکومتوں کے مسلمان باشندوں کا کیا فرض ہے۔ کیا ان کا ایک دوسرے کو قتل کرنا جائز ہو گا۔ یا وہ ایسے اعلانِ جنگ کی خلاف ورزی کریں گے کہ ایسی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس سے انکار کرنا حقیقت سے انکار کرنا ہو گا۔ رسول اللہ کے زمانہ میں اور اس کے بعد حضرت عثمانؓ

کے عہد تک صرف ایک مسلم اُمت اور ایک ہی حکومت تھی۔ مگر جب معاویہ نے حضرت علیؓ کی خلافت سے انکار کیا۔ اور خلیفہ وقت کے خلاف بغاوت کی۔ تو امت میں انتشار پیدا ہوگیا۔ اور یہ حالت اب تک جاری ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت بہت سی مسلم ریاستیں ہیں۔ جو خود مختار ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف اعلان جنگ کر سکتی ہے۔ سورہ الانعام ' النساءٗ ' بنی اسرائیل میں قرآن مسلمانوں کو ایک دوسرے کو قتل کرنے سے منع کرتا ہے۔ سوائے چند استثنائی صورتوں کے جن میں سے کسی ایک کا بھی اطلاق یہاں نہیں ہوسکتا۔ رسول اللہ نے مکہ کے آخری خطبہ میں فرمایا تھا۔

"آپ کی جانیں اور اموال ایک دوسرے کے مابین قیامت تک مقدس و ناقابل انفساخ اور واجب التعظیم ہیں۔ اے لوگو میری بات غور سے سنو۔ اور اس کو سمجھو کہ ہر ایک مسلم دوسرے مسلم کا بھائی ہے۔ آپ سب آپس میں برابر ہیں۔"

نہ ہی قرآن کی کسی آیت میں اور نہ ہی خطبۂ عرفات میں اس سوال کا جواب مل سکتا ہے۔ کیوں کہ اس وقت یہ خیال ہی ناممکن سمجھا جاتا ہے کہ ملت اس طرح مختلف حکومتوں میں منتشر ہو جائے گی البتہ جہاں دنیا کے سارے مسلمان ایک برادری اور ایک حکومت کے ماتحت ہوں اس اصول کا اطلاق ضرور ہوگا گرچہ مسلمان حکومتوں میں اتحاد اور تعاون کے آثار موجود ہیں۔ مگر موجودہ اقاتیوں، متضاد' مفادات اور جو اہمیت علاقائی قومیت کو دی جاری ہے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ بہت مشکل نظر آتا ہے کہ دنیا کی ساری مسلمان ریاستیں' اپنی زبان' مقامی تہذیب اور اپنے جداگانہ مفادات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک ریاست میں متحد ہوسکیں۔ مگر پھر بھی ان مسلمان شہریوں کا جو کسی غیر مسلم ریاست کے باشندے ہوں، سوال باقی رہ جاتا ہے۔ یہ وہی پرانا سوال ہے کہ کیا ایک مسلمان شہری کی اولاً وفاداری اس ملک کے لئے ہے۔ جہاں وہ رہتا ہے یا اس مذہب کی جس کا وہ پیرو ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب تمام مسلمانوں کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اس سے زیادہ اہم کوئی اور سوال شائد ہی ہو۔ اگر اس سوال کا جواب وہی ہے جو علماء نے پنجاب کے ۱۹۵۳ء کے فسادات کی تحقیقاتی عدالت کو دیا تو اس کے نتائج ایسے ہولناک اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ضرر رساں ہوں گے۔ جن کا ذکر کرنا بھی خلافِ مصلحت ہوگا۔ اور اگر اس جواب کے خلاف کوئی جواب دیا جائے تو اپنی ضرر رسانی میں وہ بھی ایسا ہی خطرناک ہوگا۔ یہ سوال و جواب میں مصلحتاً اس جگہ حذف کر رہا ہوں۔ مگر جو لوگ اس سوال میں دلچسپی رکھتے ہیں تو وہ تحقیقاتی رپورٹ کے ۲۲۷ سے ۲۳۱ تک کے صفحات پڑھ سکتے ہیں۔

قرآن دو مسلمانوں یا دو مسلم گروہوں کے درمیان لڑائی کے امکان کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اور حکم دیتا ہے کہ دوسرے مسلمان اس شخص یا گروہ کی مدد کریں جو مظلوم ہے نہ کہ ظالم کی۔ اگر اس ارشاد کے مطابق ہر ایک مسلمان نے فرداً فرداً فیصلہ کرنا ہے۔ تو اس سے ایک افراتفری پیدا ہوسکتی ہے۔

میں نے مندرجہ بالا مثالیں اس لیے دی ہیں کہ ان سے ظاہر ہو سکے کہ اگر ان قواعد پر جو آئمہ اربعہ اور ان کے شاگردوں نے وضع کئے ہیں۔ عمل کیا جائے تو اس کا نتیجہ ضمیر عالم اور بہت سے مسلم گروہوں کے لئے اضطراب کا باعث ہوگا۔ مزید غرض یہ سوالات کرنے کی یہ بھی ہے کہ ان کا جواب بذریعہ اجتہاد و اجماع ڈھونڈا جائے۔ کیا ہمارے علماء اور رہنما ان سوالات پر غور کر کے جواب دینے کی زحمت گوارا کریں گے۔ ان کی رہنمائی سے کروڑوں مسلمانوں کا بھلا ہو گا۔ مؤخرالذکر سوال ایک غیر دینی ریاست میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور میرا خیال ہے۔ کہ اس قسم کی مشکلات ہی تھیں جن کی وجہ سے مسلم ریاستوں نے عام طور پر غیر دینی نظام حکومت کو ترجیح دی اگرچہ اسلامی قانون اسلامی ملکوں میں لاگو ہے جیسا کہ انگریز کے زمانہ میں ہندوستان اور کئی دوسرے مسلم ممالک میں لاگو تھا۔ اگر فلسطین عربوں کو واپس مل گیا تو یاسر عرفات کے تازہ بیان کے مطابق وہاں بھی اسی وجہ سے غیر دینی دستور نافذ کیا جائے گا۔

جہاں تک دستور کا تعلق ہے رجحان غیر دینی دستور کی طرف ہی ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد قانون دستور بحری تجارت کا قانون، قانون اراضی، بین الاقوامی قانون، قانون مال اور قانون حرب مسلم ریاستوں میں عام طور پر ایک دینوی معاملہ رہے ہیں۔ قاضی کے پاس صرف خالص مذہبی قانون مثلاً عائلی قوانین، اوقاف اور نمازوں کی امامت جیسے معاملات رہ گئے تھے۔ یہ حقیقت شاہ ولی اللہ کے مدنظر تھی۔ جب انہوں نے فرمایا:

رسول اکرم کی زندگی مسلمانوں کے لئے شرافت کا ایک نمونہ ہے۔ ان لوگوں کے جو امور سلطنت میں ان کے جانشین ہیں۔ اسی قسم کے فرائض سپرد ہیں۔ جیسے اسلامی قوانین کا نفاذ، جہاد کی تیاری، قلعہ بندی، سرحدوں کی حفاظت سفیروں کا تقرر، صدقہ کا تعین اور وصولی، تنازعات کا فیصلہ کرنا، ٹیکس اور آمدنی کا حساب، یتیموں کی حفاظت اوقاف کی نگرانی اور سڑکوں، مسجدوں اور دوسری عمارتوں کی تعمیر، وہ لوگ جن کے سپرد یہ فرائض ہیں، وہ رسول اللہ کے دینوی امور میں جانشین ہیں۔ روحانی معاملات میں حضور کے وہ جانشین ہیں جن کے سپرد مندرجہ ذیل فرائض ہیں۔

قرآن، حدیث اور اسلامی قانون کی تعلیم اور حلال حرام کا فیصلہ اسی زمرہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو بذریعہ بحث و مناظرہ مذہب کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ جیسا کہ متکلمین کرتے تھے۔ وہ لوگ جو وعظ و نصیحت کرتے ہیں، جیسا کہ مبلغ کرتے تھے۔ وہ لوگ جو اپنی صحبت اور روحانی رہنمائی اور تعلیم سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرتے ہیں، وہ لوگ جو نماز اور حج کا انتظام کرتے ہیں، یا لوگوں کو تقویٰ پر مائل کرتے ہیں ان سب لوگوں کو نبی کریم کے روحانی جانشین کہا جا سکتا ہے۔ (فیوض الحرمین، اردو ترجمہ، بمبئی ایڈیشن صفحہ ۸۲)

مغربی تہذیب کا نمایاں پہلو اس کی مادی ترقی اور خوشحالی ہے جس کی وجہ سائنسی ذرائع سے ایسا مادی سامان پیدا کرنا ہے۔ جو انسانی ضروریات اور خواہشات کو پورا کرے۔ اپنی وحشیانہ حالت سے تہذیب کے اعلےٰ مراتب تک انسان کو زندہ رہنے اور اولاد پیدا کرنے کے لئے اپنی ضروریات پوری کرنی پڑتی ہیں۔ اور

تہذیب انسان کے بنیادی اور شائستہ حاجات پورا کرنے کے ذرائع مہیا کرنے کی تاریخ ہے۔ موجودہ مرحلہ پر میں روحانی اور اخلاقی ترقی کا ذکر جو پہلے آچکا ہے چھوڑتا ہوں۔ مغرب میں ایسی ترقی جب سے کلیسا اور ریاست میں علیحدگی ہوئی عام طور پر افراد پر چھوڑ دی جاتی ہے اور مذہب ایک انفرادی معاملہ سمجھا جانے لگا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ مغرب میں ایسے شخص موجود نہیں جو اپنے روحانی اور اخلاقی ضرورتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ مغرب میں انسانیت کا ایک بڑا طبقہ اور ایشیا میں وہ طبقہ جو اپنی دھریت کا اقرار کرتا ہے۔ اور مذہب، روح اور مرنے کے بعد کسی دوسری زندگی پر یقین نہیں رکھتا۔ موجود ہے۔ اس تہذیب میں ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جب تک انسان مادی طور پر فارغ البال نہیں اور روندے ہوئے، مظلوم اور استحصال شدہ طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور غربت سے پسی ہوئی زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ باوجود اس طمانیت اور امید کے جو یسوع ناصری نے غریبوں کو دی کوئی روحانی یا مادی ترقی نہیں کر سکتا۔ بڑھتی ہوئی خوشحالی مادی پیداوار میں اضافہ کی وجہ سے ہے۔

اس بات کی کیا وجہ ہے کہ جب مغرب کے ممالک جن میں امریکہ بھی شامل ہے۔ دولت اور عیش میں لوٹ رہے ہیں۔ مشرق میں ہم سوائے جاپان، چین اور تیل کی دولت والے ملکوں کے غربت کی انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں۔ اور صرف زندہ رہنا ہمارا مقصد رہ گیا ہے۔ اور بھوک، بیماری اور افلاس ہمارے مقسوم ہو چکے ہیں۔

اس سوال کا جواب بہت سادہ اور مختصر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم سائنسی تکنیک سے یا تو واقف ہی نہیں یا اس کا استعمال کرنا نہیں چاہتے یا اس کے استعمال کے ذرائع سے محروم ہیں۔ اس سلسلہ میں میں سائنس اور تکنیک کے الفاظ استعمال کر رہا ہوں۔ جن کا سمجھنا ضروری ہے تاکہ حقیقت کا صحیح طور پر اندازہ لگ سکے۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ سائنس عرب مسلمانوں کا بچہ ہے اور سائنسی تکنیک بھی ان کے دائرہ فکر و عمل سے باہر نہیں تھی۔ مگر یہ امتیاز ان کو سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد ہوا۔ سائنسی تکنیک پر اقتصادی ترقی کا انحصار ہے۔ اور آج کل صورت حال یہ ہے کہ سیاسی اقتدار اقتصادی ترقی پر انحصار رکھنے لگا ہے۔ سر برٹرینڈ رسل اپنی کتاب سائنٹیفک آوٹ لک (SCIENTIFIC OUTLOOK) میں لکھتے ہیں۔

دنیا میں تبدیلی لانے کی طاقت جو بڑے بڑے سوداگروں کو حاصل ہے۔ اس طاقت سے بہت زیادہ ہے جو ماضی میں افراد کو حاصل تھی۔ مانا کہ ان کو سر قلم کرنے کی اتنی طاقت نہیں۔ جتنی نیرو اور چنگیز خان کو تھی۔ مگر وہ اس بات پر تو قادر ہیں کہ بھوک سے کون مرے اور دولت مند کون ہو۔ وہ دریاؤں کا رُخ بدل سکتے ہیں۔ اور حکومت کو گرا سکتے ہیں۔ تمام تاریخ بتا رہی ہے کہ طاقت ایک نشہ ہے۔ خوش قسمتی سے وہ لوگ جن کے ہاتھ میں طاقت ہے۔ اسی بات سے آگاہ نہیں کہ اگر وہ چاہیں تو کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ جب اس سے وہ واقف ہو جائیں گے۔ تو انسانی ظلم کا نیا دور شروع ہو گا۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مغرب نے سائنس قرون وسطے کے عربوں سے لی۔ اور یورپ میں احیاءُ العلوم و فن کا زمانہ اسی وقت شروع ہوا۔ جب کلیسا اور اس کے پادریوں کے

غلبہ سے نجات پاکر یورپ نے سائنس کو اپنایا۔ اور اس کے نتیجہ میں سائنس والوں نے اپنے اپنے میدانوں میں قدرت کی طاقتوں پر قابو پاکر ان سے کام لینا شروع کیا۔

عام معنوں میں سائنس کے معنی جاننے کے ہیں اور اسی کو علم کہتے ہیں۔ اصطلاحی تعریف میں سائنس سے مراد وہ علم ہے جو مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس علم کو غور سے آزمائش کرنے کے بعد ایک سسٹم میں ڈھالا جاتا ہے۔ پھر اس سے عام اصول وضع کئے جاتے ہیں۔ جن کو قوانین فطرت یا قدرت کہا جاتا ہے۔ جب تک اس علم سے وہ نتائج حاصل نہ کئے جائیں جو انسان کی حاجتیں پوری کرنے کے کام آئیں۔ سائنس علم کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ایسے علم سے انسان دانا اور عقلمند تو ہو سکتا ہے مگر اس سے پیٹ نہیں بھر سکتا۔ اچھے کپڑے نہیں پہن سکتا۔ اور نہ محفوظ مکان بنا سکتا ہے۔ سائنس اسی وقت مفید ہو سکتی ہے جب قوانین قدرت دریافت کرنے کے بعد ان سے کسی مفید شے پیدا کرنے میں مدد لی جائے۔ یا کسی نقصان دہ ماحول پر قابو پایا جا سکے۔

سائنس کی دو قسمیں ہیں۔ اوّل طبعیات کی سائنس یہ بات مشکوک ہے کہ مافوق الطبعیات (METAPHYSICS) بھی اس ضمن میں آتی ہے یا نہیں۔ دوم سماجی سائنس یعنی وہ سائنس جو انسانی افعال کے رجحان کی مفروضہ حالات میں نشاندہی کرتی ہے۔ میری رائے میں یہ عام طور پر درست خیال کیا جاتا ہے کہ تمام انسان اپنے افعال میں یکسانیت نہیں رکھتے۔ کیونکہ وہ ایک بیجان شے نہیں۔ اور نہ مختلف حالتوں میں مختلف طور پر عمل کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ سماجی قوانین خواہ وہ اقتصادیات کے قانون ہوں یا اخلاقی پہلو رکھتے ہوں۔ اتنے صحیح نہیں ہوتے جتنے کہ طبعیات کے قانون جس میں علم کیمیا بھی شامل ہے۔

اگرچہ سائنسی قوانین سائنسی تکنیک کے لئے ایسی صحت رکھتے ہیں۔ کہ ان کو درست سمجھ کر ان پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ سائنسی تکنیک کی ضروری صفت یہ ہے کہ اس میں وہ قدرتی قوانین اسی طریقہ سے کام میں لائے جائیں۔ کہ ان کے عمل سے یا تو پیداواری مشینیں زیادہ تعداد میں اور نہ یا دہ قسموں کی پیدا کی جائیں۔ یا ان کی مدد سے اشیاء صرف کے پیدا کرنے میں اضافہ ہو یا ان کی مدد سے ماحول پر قابو پایا جا سکے۔

سائنس اسی صورت میں انسان کے لئے کارگر ہو سکتی ہے۔ جب وہ انسانی حاجات کو پورا کرنے کی غرض سے استعمال کی جا سکے۔ جب سائنس اس غرض سے استعمال کی جاتی ہے۔ تو ایسے طریقۂ کار کو صنعتیات (TECHNOLOGY) کہا جاتا ہے۔ یعنی سائنس کو حصولِ مقصد کے لئے بطور وسیلہ استعمال کرنے کا علم۔

بارود، ملاحوں کا قطب نما اور چھاپنے کی مشین ازمنۂ وسطیٰ میں دریافت ہو چکے تھے اور اس

زمانہ کے اختتام سے پہلے امریکہ بھی پندرھویں صدی میں دریافت ہوا۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی میں سائنس نے بے پناہ ترقی کی۔ مگر بڑی اہم ایجادیں مثلاً بھاپ کا انجن، برقی قوت، ٹیلی فون، ٹیلی گراف سوت بنانے اور کپڑا بُننے کی مشینوں کی ایجاد صرف اٹھارویں صدی میں ہوئیں۔ اور اس سے کچھ عرصہ بعد نہایت حیران کن ایجادیں ظہور میں آئیں۔ یعنی ہوائی جہاز، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ بیسویں صدی میں جوہری توانائی دریافت ہوئی۔ اسی طرح ذرائع آمدورفت میں سمندر یا ہوا میں چلنے والے جہازوں اور زمین پر ہی چلنے والی گاڑیوں کے ذریعہ اتنی ترقی ہوئی۔ جو ایک وقت انسانی خیال سے باہر تھی۔ ان ایجادات سے بحری تجارت نے ترقی کی۔ اور بحری تجارت نوآبادیوں کا باعث بنی جس کا خام مال پیدا کرنے والے ممالک پر مضر اثر پڑا اور وہ دن دُور نہیں جب سورج سے توانائی حاصل کر کے تیل پیدا کرنے والے ممالک کی فوقیت کو ختم کر دیا جائے۔ مگر سرِدست تیل پیدا کرنے والے ممالک نے تمام صنعتی ممالک کو ہی پریشانی اور دردِسر میں مبتلا نہیں کر چھوڑا ہے بلکہ تمام دنیا کو ایسے اقتصادی بحران میں لا ڈالا ہے۔ اور ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں جس سے انسان کا مستقبل بھی مخدوش ہو گیا ہے۔ آبادی میں بے پناہ اضافے اور خوراک کی کمی نے حالات کو اور بھی نازک بنا دیا ہے۔ تیل کے بحران نے زراعتی پیداوار پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔ کیونکہ زراعتی پیداوار میں مشینوں کا بڑا حصّہ ہے۔ اور مشینوں کا استعمال تیل پر منحصر ہے۔ سائنسی تکنیک سے مغربی ممالک، خوراک، کپڑا، اور دیگر اشیائے صرف کی پیداوار میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ مگر تیل کی وجہ سے یہ اضافہ مشکوک ہی نہیں ہو گیا۔ ناممکن ہو کر رہ گیا ہے۔ جس سے تمام دنیا میں ایک اضطراب کی لہر دوڑ گئی ہے اور بہت سے طبقوں کی زندگی قیمتوں میں اضافہ سے اجیرن ہو گئی ہے اور ہر طبقہ کا قلبی سکون جاتا رہا ہے۔ سرمایہ کاری نظام ایک کڑی آزمائش سے دوچار ہے۔ کچھ عرصہ سے اقتصادی قوت نے سیاسی قوت کو اپنی لونڈی سمجھ رکھا تھا۔ اور اگر ان دونوں قوتوں میں کمی واقع ہو جائے۔ تو نہ معلوم تاریخ موجودہ مغربی تہذیب کو کدھر لے جائے۔

کیونکہ مغرب نے مذہب کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ اور بیشتر ممالک تو جو اشتراکیت کے نظریہ کے قائل ہیں۔ مذہب کو اپنے نظام سے ہی خارج کر چکے ہیں۔ اس لئے اخلاقی اقدار یا تو بے اثر ہو چکیں ہیں، یا سرے سے ہی غائب۔

ہربرٹ بینڈرسل جن کا اور جن کی کتاب کا اوپر ذکر آ چکا ہے لکھتے ہیں۔

ہر ایک چیز ایک آلہ ہے جب آپ پوچھتے ہیں۔ یہ آلہ کس غرض کے لئے ہے تو جواب ملے گا کہ یہ آلہ ایک اور آلہ بنانے کے لئے ہے۔ جو اپنے سے طاقتور اور آلہ بنائے گا۔

علیٰ ہٰذا القیاس۔ نفسیات میں اس سے یہ مراد ہے کہ طاقت کے نشہ نے ان ساری اقدار کو ایک طرف پھینک دیا ہے۔ جن سے انسانی زندگی کی تکمیل ہوتی ہے، محبت، والدین کے ساتھ شفقت عوام کی خوشی اور

جمالیاتی تصور صنعت کار کے لئے بمقابلہ بڑے طاقتور شہزادوں کے برائے نام رہ گیا ہے۔ ناجائز حربوں سے کام نکالنا اور استحصال سائنسی صنعت کار کا فرمانروا جذبہ بن چکا ہے۔ یہ طاقت کی عملی آزمائش یعنی ماحول پر قابو پانا ہے جس نے سائنس کو کبریائی بخشی ہے۔ بدقسمتی سے فیصلہ کرنے والا کوئی بے تعصب ثالث نہیں جو نسل انسانی کی خوبیوں کا موازنہ کر سکے۔ مگر جب میں ان کے ایٹم بموں، جراثیمی جنگ کے لئے ان کی تیاریوں ان کی کمینگی، بے رحمی، ایذا رسانی، ظلم و استبداد پہ نظر ڈالتا ہوں تو میں انسان میں جو فالق کا ہیرا ہے۔ روشنی کی کوئی جھلک نہیں پاتا ہوں۔ مغرب میں مادی خوشحالی کا ایک اور نتیجہ پرانی آزمائش شدہ اخلاقی اقدار کا بھاپ کی طرح اُڑ جانا ہے۔ خاندان کا تصور انتشار کی نذر ہو چکا ہے۔ بزرگوں کی عزت منقود ہو چکی ہے۔ غریبوں کی مدد ایک غیر متعلقہ شے بن کر رہ گئی ہے۔ البتہ چند رحم دل اور انسان دوست ہستیاں یا انکم ٹیکس سے بچنے والے دولت مند کچھ خیراتی ادارے ضرور قائم کرتے ہیں۔ مگر عام طور پہ یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ دولت کے حاصل کرنے میں نیکی، بدی، اچھائی، برائی، پاک اور ناپاک کی تمیز معدوم ہو چکی ہے۔ اور مذہب یا تو رسمی بات بن چکی ہے۔ یا نفع اندوزی اور جلب منفعت کا ذریعہ یا سیاسی اثاثہ۔ اگرچہ قانون کی اطاعت عام طور پہ کی جاتی ہے انسانی جان کی قدر و عظمت ختم ہو چکی ہے۔ سنگین جرائم مثلاً ڈاکہ زنی، زنا بالجبر فریب و دغا، قتل، اور خیانت مجرمانہ فروغ پذیر ہیں۔

نظام حکومت میں دیانتداری اب بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے مگر رشوت خوری کو حقارت سے نہیں دیکھا جاتا۔ بلکہ زندگی کا ایک معمول سمجھا جاتا ہے۔ نوجوان نسل کے لیے جنسی تعلقات یا ایسے تعلقات پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف رہنا ایک محبوب مشغلہ بن چکا ہے۔ اور یہ مصروفیت نو عمری میں ہی شروع ہو جاتی ہے۔ اس بے راہ روی پہ عمل ہی نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے ہر پہلو کی تعلیم حاصل کی جاتی ہے۔ ہمجنسوں کے اختلاط سے خواہش نفسانی کو پورا کرنا مردوں اور عورتوں دونوں میں نامناسب ہی نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کو پوشیدہ بھی نہیں رکھا جاتا۔ ایک دوسرے کے ساتھ بیویوں کا ادل بدل اور شادی کی ممنوعہ حدود میں جنسی تعلقات، نفرت سے نہیں دیکھے جاتے۔ طوائف کا پیشہ ایک باعزت پیشہ سمجھا جاتا ہے۔ بزرگوں کی فرمانبرداری اور عزت ایک فرسودہ رسم اور بے معنی رواج خیال کیا جاتا ہے۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ نوجوان مرد یا عورت نے اپنی زندگی خود بسر کرنی ہے۔ نہ کہ بوڑھے ماں باپ کی خواہش کے مطابق یا ان کے بتائے ہوئے مسلک پر چل کر انحصار اس فلسفہ پہ کیا جاتا ہے کہ ان انفرادی عیوب سے جن کو عیوب نہیں سمجھا جاتا۔ معاشرے کی عظمت پہ کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جب تک دولت بکثرت ہے نہ کوئی پوچھ سکتا ہے اور نہ کوئی نفرت و حقارت کر سکتا ہے۔

عزت دولت کا نام ہے۔ اور دولت عزت کا مقام۔ میں نہ تاریخ نویس ہوں نہ تاریخ دان ہونے کا دعوی کرتا ہوں۔ مگر بطور تاریخ کے طالب علم میں نے ایک تاریخی قانون کا عمل دیکھا ہے

کہ جب دولت اور اس کے نتیجہ میں عیش و عشرت معاشرہ کی حالت کو گندہ اور اخلاقی اقدار سے محروم کر دیتی ہے۔ تو اس معاشرے کے دن ختم ہو جاتے ہیں۔ خواہ وہ معاشرہ کتنے ہی مہلک دفاعی اور جارحانہ ہتھیاروں سے مسلح کیوں نہ ہو۔ یہ قانون آہستہ آہستہ اور پُر اسرار طریقہ سے عمل کرتا ہے۔ اور اپنے عمل کے لئے اسباب خود پیدا کرتا ہے۔ انفرادی عیش و عشرت زندگی سے محبت اور موت کا ڈر پیدا کر دیتی ہے۔ اور جہاں قوم کی عظمت برقرار رکھنے، آنے والی نسلوں کے لئے خوشگوار ماحول مہیا کرنے یا مذہبی جوش عقیدت میں جان قربان کرنے کا جذبہ باقی نہ رہے اور زندگی کا مدعا صرف اپنی عیش و آسائش رہ جائے تو حُبِ وطن اور شجاعت کا عنصر غیر مؤثر ہو جاتا ہے۔ اور فوج یا لشکر اجیری افراد یا بھاڑے کے ٹٹوؤں کا غیر منظم مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اور ایسی قوم دوسری قوم کا شکار بن جاتی ہے۔

کسی معاشرے کی مادی حالت طاقت پر منحصر ہے اور یہ طاقت فطرت کی قوتوں کو بذریعہ سائنس مطیع کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ دنیا میں مسلمان ہر جگہ سائنس اور تکنیک میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ اگرچہ سائنس کا نام علم ہے اور قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ علم سیکھو خواہ اس غرض کے لئے تم کو کتنا ہی دُور جانا پڑا۔ گذشتہ ۸۰۰ سالوں میں مسلمانوں کے سائنس میں یا اس کے طریقۂ استعمال میں ذرا بھی ترقی نہیں کی۔ اور وہ اس میدان میں دوسروں کی ترقی کو بطور تماشائی حیرت و استعجاب سے دیکھتے رہے ہیں۔ عربوں کو قدرت نے تیل کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ مگر تیل صاف کرنے کے کارخانے لگانے میں وہ دوسروں کے محتاج ہیں۔ وہ پیداوار بڑھانے کی مشین خود نہیں بنا سکتے ان کو یہ سامان دوسرے ملکوں سے درآمد کرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنا خام مال صرف یہ مشینیں یا اشیائے صرف حاصل کرنے کے لئے برآمد کر دیتے ہیں۔ اسلام رہبانیت نہیں سکھاتا بلکہ مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ دنیا کی اچھی چیزوں سے لطف اٹھاؤ اور اللہ کا شکر کرو۔ اگر حالات کا رُخ یہی رہا تو دنیا میں مسلمان اور اسلام تو رہیں گے۔ مگر جہاں تک اسلامی تہذیب کا تعلق ہے اسی کروڑ مسلمان جو دنیا کے مختلف حصوں میں آباد ہیں۔ ایک مردہ تہذیب کے آثار بن کر رہ جائیں گے۔ اور دنیا ان کو ایک عجیب الخلقت قوم سمجھنے لگے گی۔ ہمیں اپنی روحانیت پر ناز ہے۔ مگر روحانیت کے دنیوی امور پر اثر کے مفہوم سے ہم واقف نہیں۔ اور مغربی اقوام جن کے ساتھ ہمارا مقابلہ ہے۔ . . . .

. . . روحانی جنس کو مجموعانہ سمجھتی ہیں اور نہ اس کو کوئی اہمیت دیتی ہیں۔ اگر روحانیت اخلاق کی ترقی کا باعث نہیں بن سکتی۔ اور دوسری قوموں پہ فوقیت نہیں دے سکتی۔ اور معاشرے کو ارفع صفات نہیں دے سکتی۔ تو پھر مسلمانوں کے پاس قابل فخر کیا چیز رہ جاتی ہے میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ کہ وحی کا مقصد مسلمانوں کو انسانیت کا خاص نمونہ بنانا تھا۔ اگر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے عمل میں کوئی نمایاں فرق نہیں تو آجکل کے مسلمانوں سے دنیا یہ پوچھنے میں حق بجانب ہو گی۔ کہ ایسے سسٹم سے کیا فائدہ اگر اخلاقی لحاظ سے وہ ایسے ہی انسان

پیدا کرتا ہے۔ جس طرح کے دوسرے مذاہب یا لادینی فلسفہ۔ مسلم دنیا کے کسی حصّہ پر نظر ڈالئے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ نہ اپنی اخلاقی خصلت اور نہ دوسرے لوگوں کے ساتھ تعلقات کی شستگی میں مسلمان کسی ترجیحی اوصاف کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

پاکستان جس کو اسلامی اقدار کا نمونہ بنانے کی کوشش کی جارہی ہے اس معاملہ میں کسی دوسرے اسلامی ملک سے مختلف نہیں۔ بددیانتی اور غیر اخلاقی طریقوں سے دولت حاصل کرنے کی ہوس نے یہاں بھی ساری اسلامی اقدار کو چھپا رکھا ہے۔ چوری چھپے اپنا مال ملک سے خلاف قانون باہر بھیجنا بددیانتی سے زرمبادلہ حاصل کرنا، قتل، سرقہ، معصوم عورتوں کا اغوا، فریب، دغا، شاہراہوں پر دن دہاڑے ڈاکہ زنی، غرضیکہ ہر قسم کے جرم، بداخلاقی اور عام بددیانتی نے اسلامی شعار و اقدار کو نیچے دبا رکھا ہے۔ درحقیقت اس لحاظ سے وہ مغرب کے لوگوں سے بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بطور ایک سسٹم کے اسلام میں وہ خوبیاں ہیں جو کسی دوسرے مذہب میں نہیں۔ توحید اور اس تصور سے جو نتائج نکلتے ہیں۔ یعنی انسانی مساوات، دولت کی مساوی تقسیم کی کوشش بذریعہ خیرات، زکوٰۃ، صدقہ، ذخیرہ اندوزی، زر اندوزی اور ضیاع کی ممانعت، محتاجوں اور بیکسوں کی مدد، رواداری، آزادیٔ خیال یہ سب سونے اور دولت سے بڑھ کر قیمتی اقدار ہیں جن سے بنی نوع انسان کی فلاح مقصود ہے۔ میں نے کئی ایک مغربی ممالک کے معاشروں کا مطالعہ کیا ہے۔ مگر میں اس تاثر کو نہیں بھول سکا۔ اور یہی تاثر دوسرے لوگوں کا بھی ہے۔ کہ یہاں موجودہ مسلمانوں پر قرآنی، اخلاقی اقدار ضائع ہوئی ہیں، دوسری قوموں نے بغیر سمجھے کہ یہ قرآنی اقدار ہیں۔ ان کو اپنا کر اپنا معمول بنا یا ہے۔ صدر فورڈ کے حالیہ امریکہ کے مسلمانوں کے نام عید پر اس بیان کا کہ اہل امریکہ اور مسلمانوں میں بہت سی مشترک اقدار ہیں یہی مطلب تھا اور

۱۷ جنوری

۷۶ء کے پاکستان ٹائمز میں صدر چین ماؤزے تنگ کا ایک مسلمان سیاح کے سوال پر کہ کیا آپ نے قرآن پڑھا ہے۔ یہ جواب کہ مسلمان قرآن پڑھتے ہیں اور ہم اس پر عمل کرتے ہیں۔ ایک صریح طنز ہے۔ مسلمان ممالک میں جرائم کے متعلق بات میں کوئی بطور قاعدہ کلیہ نہیں کر رہا۔ کیونکہ مغرب میں بھی ایسے بھیانک جرم سرزد ہوتے ہیں۔ اور اس کثرت سے جن کا ہم خیال بھی نہیں کر سکتے۔ مگر اس اُمّت کے افراد جن کو بہترین اُمّت کہا گیا ہے۔ مغرب کے ان حالات کو اپنے عمل کے لئے وجہ جواز نہیں بنا سکتے۔

****

باب ۱۴
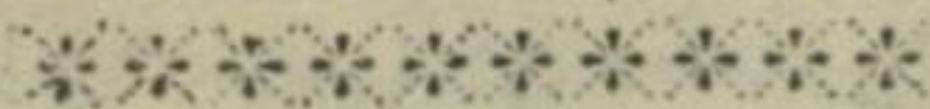
حرفِ آخر

پچھلے ابواب میں ہم قدیم سے قدیم تاریخ سے شروع ہو کر مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے زمانۂ حاضرہ تک پہنچ چکے ہیں - ان ادوار میں وہ دور بھی شامل ہے جب خلافت عثمانیہ اور بنو امیہ کے عہد میں مسلمان افریقہ کے راستے اندلس کو فتح کرنے کے بعد تاریخ یورپ میں شامل ہو چکے تھے جب ایک ہزار سال تک اسلام اور تہذیب مترادف الفاظ رہے اس دوران میں نصرت و کامرانی مجاہدینِ اسلام کے جوشِ عقیدت اور شجاعت کے قدم چومتی رہی اور انہی دو خوبیوں نے مسلمانوں کو ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ایک بڑے حصہ کا مالک بنا دیا تھا - پانچ سو سال تک علم و دانش کی شمع صرف مسلمانوں کے ہاتھ میں رہی - اس کے بعد بھی کئی صدیوں تک یورپ والے مسلمان دانشوروں کی تصانیف کی خوشہ چینی کرتے رہے حتیٰ کہ ۱۶۸۳ء میں وائنا کے دوسرے محاصرے سے پسپا ہونے کے بعد مسلمانوں میں زوال کے اسباب نمایاں ہونے لگے "شہنشاہی رومہ کے تنزل کے اسباب" مشہور مؤرخ گبن نے اس وقت قلم بند کیے جب اس شہنشاہی کی برتری ختم ہو چکی تھی اور اس کی تہذیب بھی مر چکی تھی - ایک مؤرخ کے مطابق اسلام کی قوت اس وقت عیسائیت کے کھنڈروں پر تعمیر ہوتی جب عیسائیت کے لیے تہذیب کا لفظ ناموزوں ہو چکا تھا مگر یہ خیال کلہم صحیح نہیں ہے کیونکہ اسلام کا انحصار عیسائیت یا کسی اور مذہب کے عروج و زوال پر نہیں - وہ خود اپنے اندر ایک ارتقائی قوت رکھتا ہے البتہ یہ بات درست ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط اور دیگر تہذیبوں خاص طور پر شہنشاہی روما کے تنزل کے اسباب میں کچھ نہ کچھ مشابہت ضرور پائی جاتی ہے -

دنیا کی تہذیب کی تاریخ چار ہزار برس قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے - اس وقت سے اب تک بہت سی تہذیبوں نے جنم لیا - وہ پھلی پھولیں اور صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں - قوموں، تہذیبوں اور معاشروں کے زوال اور معدوم ہونے کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں - اوّل تو جنگ ہے جب ایک قوم دوسری پر حملہ کر کے اسے ملیامیٹ کر دیتی ہے - اس کے ملک پر قبضہ کر لیتی ہے اور ایک نئی

تہذیب اور معاشرے کی بنیاد ڈالتی ہے۔ اس کے بعد معاشرہ یا تو بالکل نیا ہوتا ہے یا فنا ہو جانے والی تہذیب کے کھنڈروں پر تعمیر ہوتا ہے۔ دوسری وجہ کسی تہذیب کے مٹ جانے کی یہ ہوتی ہے کہ آہستہ آہستہ اندرونی خلفشار اس کو گھن کی طرح کھانا شروع کر دیتا ہے اور اس میں سابقہ ترقی کی سطح سے نیچے گرنے کے رجحان کا آغاز ہو جاتا ہے اور پھر اس پر یا تو کوئی بیرونی قوم غلبہ حاصل کر لیتی ہے یا کوئی شخص یا گروہ اس کے اندر سے ہی پیدا ہو کر اس کے نظام اور نظریے کو تباہ کر کے اپنا نظریہ اس پر مسلط کر دیتا ہے۔ تیسری وجہ قوموں اور تہذیبوں کے ادبار کی آفات سماوی یا طبعیاتی تغیر ہو سکتے ہیں مثلاً زلزلہ، سیلاب، بارش سے طبعیاتی ماحول میں ایسی تبدیلی جس میں وہ تہذیب یا قوم زندہ نہیں رہ سکتی کیونکہ ایسی تبدیلی کا وہ مقابلہ نہیں کر سکتی۔ قدیم صحرائے عرب و افریقہ کے باشندوں کا قحط اور متواتر خشک سالی کی وجہ سے نقل مکانی کر کے دنیا کے دوسرے حصوں میں جا بسنا ایسے اسباب کی ایک مثال ہے چوتھا سبب یہ ہوتا ہے کہ ایک آسودہ اور مہذب معاشرہ اپنا مرکز کھو کر جس پر اس کی طاقت کا انحصار تھا، ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے۔ ہر ایک ٹکڑا اپنی علیحدہ حکومت قائم کرتا ہے اور علاقائی تہذیب کی بنیاد ڈالتا ہے مگر مرکز کی مدد سے محروم ہو کر یہ حکومتیں اپنی سابقہ طاقت کھو بیٹھتی ہیں اور کسی وقت بھی اپنے سے زیادہ مضبوط طاقت کا شکار بن جاتی ہیں۔

دور حاضرہ کے مشہور مؤرخ ٹائن بی نے اکیس تہذیبیں شمار کی ہیں جن میں سے سولہ معدوم ہو چکی ہیں اور چار دم توڑ رہی ہیں۔ اسلامی معاشرے کو وہ اپنی فہرست میں بارھواں اور تیرھواں نمبر دیتا ہے اور اس کی بنیاد سوریہ کی تہذیب پر قائم کرتا ہے مگر سال ۱۵۱۶ء کو جب کہ ایران اور عرب کا اشتمال ہوا وہ ایک نئے معاشرے کا آغاز خیال کرتا ہے اور اسے وہ اسلامی معاشرے کا نام دیتا ہے۔ اس مؤرخ کے خیال کے مطابق تہذیبوں کی زندگی غیر انسانی مخلوق کی طرح، جس کا مرنا یقین ہے میں ہوتی مگر پھر بھی عام طور پر تہذیبوں کے لیے اس کے خیال میں چار منزلیں ہوتی ہیں۔ تہذیب کی پیدائش۔ اس کی نشوونما۔ اس میں زوال کے آثار نمایاں ہونا اور اس میں انتشار پیدا ہو کر اس کا ختم ہو جانا۔

مسلمانوں کے زوال کے آغاز کی تاریخ ۱۶۸۳ء مقرر ہو سکتی ہے۔ یہ وہ تاریخ ہے جب خلافت عثمانیہ کی فوجوں کو وائنا پر دوسرے حملے میں ناکام ہو کر واپس آنا پڑا کیونکہ پولینڈ کے جان سوم کی مزاحمت نے مسلمانوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس تاریخ کے بعد نہ صرف مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ عملی طور پر ختم ہو گیا بلکہ خلافت عثمانیہ کی حکمرانی سے کئی مفتوح ممالک یکے بعد دیگرے نکلنے شروع ہو گئے۔ خلافت عثمانیہ کے اندرونی حالات خراب ہونے لگے اور صوبوں نے بھی ایک ایک کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کرنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خلافت عثمانیہ کی مرکزی طاقت میں

کمزوری روز بروز بڑھتی گئی۔ اس زوال کا بنیادی باعث خلافت کی سیاسی اور حربی کمزوری تھا۔
یورپ کے اٹھارھویں صدی کے صنعتی انقلاب نے مغرب کے ہر ایک ملک کے معاشی نظام کو یکدم بدلنا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ان صنعتی ممالک کے سیاسی رخوں میں بھی تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں۔ طاقت کا انحصار صنعتی پیداوار اور صنعتی میدان کے سربرآوردہ سرمایہ داروں اور پیشہ ور منتظموں پر آٹھہرا صنعت بذاتِ خود سائنس اور سائنسی تکنیک کے علم کا نتیجہ تھی مگر اس میدان میں مسلمانوں نے جن سے سائنس نے جنم لیا تھا ذرا بھی حصہ نہ لیا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ صنعتی ممالک نے دنیا بھر میں جگہ جگہ اپنی منڈیاں اور بستیاں قائم کر لیں اور مسلمانوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ مسلمان ملکوں کے باہمی جھگڑوں اور نااتفاقیوں نے تنزل کے اس رجحان کو اور بھی تیز کر دیا اور ان کی مجموعی اور انفرادی طاقت کو کمزور کر دیا۔
مسلمان اب صنعتی اور سائنسی میدان میں کہیں نظر نہیں آتے شاید وہ کسی غیبی مدد کے منتظر ہیں یہودی بھی صدیوں تک ایسی مدد کے منتظر رہے مگر بے سود۔ کوئی غیبی مدد ملنے کی بجائے انہیں اسلام کے دشمنوں نے مدد دے کر ایک امیر مہذب مند اور بارسوخ قوم بنا دیا اور اس مدد سے یہودیوں نے ارض فلسطین کو جو دودھ اور شہد کی ندیاں بہنے کے بعد صحرا میں تبدیل ہو گئی تھی اپنے سائنسی، صنعتی اور زرعی علم سے گل و گلزار بنانا شروع کر دیا عربوں کو کسی ایسی امداد کی توقع نہیں اگرچہ ان کے ذرائع آج کل یہودیوں سے بہت زیادہ ہیں مگر اب تک انہوں نے اس موقع سے ذرہ بھی فائدہ نہیں اٹھایا سائنس اور صنعت میں وہ اب تک ویسے ہی پیچھے ہیں جیسے صدیوں پہلے تھے۔
مسلمانوں کے زوال کا ایک اور سبب میرے خیال میں وہ جمود بھی ہے جو اجتہاد مطلق کے نظریے نے ہمارے معاشرے میں گزشتہ آٹھ سو سال سے پیدا کر رکھا ہے آئمۂ اربعہ کا زمانہ نویں صدی عیسوی کے اختتام پر ختم ہوتا ہے۔ اور محدثین کا زمانہ دسویں صدی تک چلتا ہے۔ اس طرح فقہی جمود کا زمانہ گیارھویں صدی سے شروع ہوتا ہے اور فکری جمود کا زمانہ ابن رشد کی ۱۱۹۸ء میں وفات کے بعد شروع ہوتا ہے آیا فکری جمود فقہی جمود کا نتیجہ تھا یا ان دونوں قسم کے افکار میں کوئی تعلق ہے بھی یا نہیں ایسے سوالات ہیں جن کا جواب نفی یا اثبات میں نہیں دیا جا سکتا۔ اگرچہ ان دونوں افکار کی تاریخی حقیقت بھی ہے مولانا آزاد اپنے آٹھویں مکتوب (غبار خاطر) میں موروثی، جعفرافیائی رسمی اور مردم شماری کے مذہب کی تفصیل دے کر ایک حقیقی مذہب تک پہنچتے ہیں۔ مگر آخر الذکر کی وہ تعریف کرتے ہیں نہ تشریح اور اسی کتاب میں حسب ذیل خیال کا اظہار کرتے ہیں۔
"انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک اس کے تقلیدی عقائد ہیں اسے کوئی طاقت اس طرح جکڑ بند نہیں کر سکتی جس طرح تقلیدی عقائد کی زنجیریں کر دیا کرتی ہیں بسا اوقات موروثی

عقائد کی پکڑ اتنی سخت ہوتی ہے کہ تعلیم اور گرد و پیش کا اثر بھی اسے ڈھیلا نہیں کر سکتا۔ علامہ اقبالؒ اور سید امیر علی کے مطابق ایک غیر متحرک معاشرہ اپنے جمود کی وجہ سے بے حس، ساکن اور غیر ارتقائی صورت اختیار کر کے روزانہ بدلتی ہوئی دنیا میں اپنی موت اپنے ہاتھوں خرید تا ہے میرے خیال میں گزشتہ آٹھ سو سال میں اسلامی دنیا میں اس بات پر کما حقہٗ غور نہیں کیا گیا کہ اس قانون میں جسے اسلامی قانون کا نام دیا جاتا ہے زبان و مکان کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھ کر کوئی تبدیلی ممکن ہے یا نہیں اور اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو تبدیلی کہاں تک اور کسی اصول کے ماتحت ہو سکتی ہے قرآن میں ترد و بدل کا سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا مگر دورِ حاضرہ میں کئی ایک ایسے مفکر پیدا ہوتے ہیں جنہوں نے آئمہ اربعہ کے اجتہاد کو اجتہادِ مطلق سمجھنے سے انکار کیا ہے اور ان کے مجموعات اور فتاویٰ کو حرفِ آخر نہیں سمجھا۔ ایک حالیہ مضمون میں میں نے اسلامی کونسل کے لیے چند سوال اٹھائے تھے اور ان کا جواب اجتہاد مطلق کے مطابق پوچھا تھا میں خود ان سوالوں پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اجتہاد کا دروازہ اب بھی کھلا ہے اور اسلام کی قوتِ محرکہ سے اس کا جواب اسلامی عقیدے کے اندر رہ کر ڈھونڈا جا سکتا ہے تعبیر کے معاملے میں کوئی نسل آنے والی نسلوں کو پابند نہیں کر سکتی تاوقتیکہ درست طور پر وہ تعبیر رسول اکرمؐ کے ساتھ منسوب نہ کی جائے۔

مسلمانوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب ان اخلاقی تعلیمات کی بے قدری ہے جو ابتدائے اسلام میں خلق کا نمونہ سمجھی جاتی تھیں میرے خیال میں یہ سبب اقتصادی نظام کا نتیجہ ہے اور کئی ایک اقتصادی اصولوں کے ساتھ خلط ملط ہو چکا ہے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ عام طور پر اخلاقی پہلو سے مسلمان غیر مسلموں سے مختلف ہیں اس سلسلہ میں ایک واقعہ یہاں بیان کرنا نامناسب نہ ہو گا جب سلیمان ذی شان ہنگری کے ملک میں بوڈا کے محل کی سیر کر رہے تھے تو انہوں نے محل کی زینت سے متاثر ہو کر اپنے ایک مصاحب سے کہا کیا ہی اچھا ہوتا اگر استنبول میں بھی ہمارے لیے ایسے ہی عیش و عشرت کے ساز و سامان سے آراستہ محل ہوتا۔" اور یہ کوئی اتفاقیہ امر نہیں کہ سلیمان کی وفات کے بعد اسلام کے زوال کے اسباب جو پہلے ہی شروع ہو چکے تھے تیز تر ہو گئے۔

سامانِ عیش و عشرت کی اس خواہش کا مقابلہ کیجیے آپ حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی کی طرزِ زندگی سے جو غیر مسلم سفیروں کا استقبال موٹے بالوں سے بنے ہوئے ایک خیمے میں کرتے تھے اور آرام کرنے کے لیے فرشِ زمین پر ہی پتھر بطور تکیہ استعمال کر لیتے تھے۔ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کی خواہش مسلمانوں میں ایسی عام ہو گئی ہے کہ کئی ایک مؤرخوں نے اسے مسلمان کے زوال کا سبب اوّل بیان کیا ہے۔ عیش کی زندگی بسر کرنے کے لیے روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے اور روپیہ حاصل کرنے کے لیے آج کل جو ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں وہ اخلاق اور دیانتداری کو یکسر بالائے طاق رکھ کر ہی اختیار کیے جا سکتے

ہیں۔ یسوع ناصری نے اپنے پہاڑی خطبے میں سچ فرمایا تھا کہ "خدا اور دولت کا بھوت اکٹھے نہیں ہو سکتے"
اس سلسلہ میں ان قرآنی آیات کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جو عیش و عشرت پر دولت صرف کرنے کی مذمت
کرتی ہیں ایک موقع پر اسی قسم کی بات ایک دولت کے لالچی اور ظاہرہ طور پر مذہبی ذہن کے
تاجر کے متعلق میں نے اس طرح کہی تھی کہ جب روپیہ مذہب اور ایسے مذہبی تاجر کے درمیان آجاتا ہے
تو مذہب اس تاجر کو خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے
انفرادی عیش و عشرت زندگی سے محبت اور موت کا ڈر پیدا کر دیتی ہے اور جہاں قوم کی برتری
قائم رکھنے، آنے والی نسلوں کے لیے خوشگوار ماحول پیدا کرنے یا جوش عقیدت میں جان قربان کرنیکا
جذبہ باقی نہ رہے اور زندگی کا مدعا اپنی عیش و آسائش رہ جائے۔ تو حب وطن، شجاعت اور
ایثار غیر موثر جذبات بن کر رہ جاتے ہیں اور لشکر ایک اجیری افراد یا بھاڑے کے ٹٹوؤں کا مجموعہ
بن جاتا ہے اور ایسی قوم کسی دوسری کا جو متذکرہ بالا صفات کی حامل ہو یا کسی نظریہ پر جان قربان
کرنا مقصدِ زندگی سمجھتی ہو کا شکار بن جاتی ہے۔

پاکستان اسلامی معاشرے کی ترویج کی غرض سے ظہور میں آیا تھا۔ اگرچہ اس کے قیام کی کچھ
اقتصادی اور سیاسی اغراض بھی تھیں اور ہم پچیس سال سے بھی زیادہ عرصہ تک اس ملک میں اسلامی
نظام قائم کرنے اور اسلامی اقدار کو فروغ دینے کے لیے کوشش کرتے رہے ہیں۔ میرے خیال میں
قائداعظمؒ نے اپنی ۱۱ اگست کی تقریر میں ایک غیر دینی دستور اور ملک کا نظریہ پیش کیا تھا کیونکہ اس
وقت مسلمانوں اور غیر مسلموں کی آبادی میں بہت زیادہ فرق نہیں تھا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ ان
کی آنکھ بند ہونے سے پہلے ہی بھلے چنگے انسان جو خط تقسیم کے دونوں طرف رہتے تھے۔ درندوں
کی سطح سے نیچے گر کر کشت و خون کا ایسا بازار گرم کریں گے جس کی وجہ سے اتنے بڑے پیمانے پر قتل
نقل مکانی اور دشمنی شروع ہو جائے گی جس کی دنیا میں پہلے مثال نہیں ملتی۔ قائداعظمؒ کی وفات کے
بعد پاکستان کے اغراض و مقاصد کی قرارداد منظور ہوئی علماء کا ایک بورڈ بنانے کی تجویز ہوئی
اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بنائی گئی۔ ملک کا نام اسلامی جمہوریہ رکھا گیا۔ اسلامی نظریے کی دو کونسلیں
بھی بنیں وغیرہ وغیرہ۔

ان سب کا مقصد یہ تھا کہ اس ملک میں اسلامی اقدار کا احیا ہو اور پاکستانی قوم ایک ایسی
مثال قوم بن جائے جس میں انسان خور گرگ پیدا نہ ہو سکیں۔ ایک انسان دوسرے کا اپنی غرض کے
لیے استحصال نہ کر سکے۔ قانون کے نفاذ میں امیر و غریب اور حاکم و محکوم کی تمیز نہ ہو مساوات اور
اخوت کے اصول کو عملی جامہ پہنایا جا سکے مگر جو ہوا سب کے سامنے ہے صبح اخبار اٹھائیے اور
اور اس میں قتل، راہزنی، معصوم لڑکیوں کے اغواء، رشوت لینے اور دینے پر گرفتاریوں،

بجلی اور ٹیلیفون کے تاروں کی چوریوں کا حال پڑھیے اور اس کے ساتھ ہی روزانہ یہ اعلان سنئے کہ اسلام ہر مرض کی دوا ہے اسلامی نظام قائم ہو کر رہے گا مگر یہ بالکل نہیں سوچا جاتا کہ اسلام کی خوبی مسلمانوں کے عقیدے اور اعمال پر منحصر ہے اگر ہمارا عمل رشوت خوروں، چوروں، راہزنوں، خوراک میں ملاوٹ کرنے اور کاروں کے پُرزے چرانے والوں اور سمگلروں کا ہے تو ہم کس منہ سے فخر کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں "خیر اُمّہ" کہا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ہم دوسروں کو نیکی کی ہدایت کرتے ہیں ہم دوسروں پر تو نکتہ چینی کرنے اور ان کی اصلاح کا فرض اپنے ذمے لیتے ہیں مگر اپنے اعمال کا دوسروں کے ساتھ کبھی موازنہ نہیں کرتے یہ جرائم جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ دوسرں ملکوں میں بھی ہوتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ اور بھیانک نوعیت کے۔ مگر کیا اس سے مسلمانوں کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے کیا اس سے قرآن کے واضح احکام منسوخ ہو جاتے ہیں کیا مسلمانوں کے پاس صرف عقیدہ کا زبانی اظہار اور مذہبی رسوم کی ادائیگی رہ جاتی ہے اور حقوق العباد غائب ہو جاتے ہیں اگر آپ نے ان جرائم اور بد اخلاقیوں کا تجزیہ کیا ہے تو آپ پر ثابت ہو جائے گا کہ ان سب برائیوں کی جڑ دولت کی خواہش ہے کیونکہ جب تک کسی کے پاس دولت نہ ہو معاشرہ اسی کی عزت نہیں کرتا اور اگر ایک مسلمان ملک میں انتہائی مقصد دولت سمیٹنا ہو جائے۔ خواہ اس مقصد کے لیے کتنے ہی بد دیانتی کے اور اخلاقی پہلو سے گرے ہوئے ذرائع استعمال کرنے پڑیں تو پھر آپ کتنی ہی اسلامک کونسلیں یا بورڈ بنائیں اور کتنے ہی علماء کو بہشت و دوزخ کی باتیں کرتے سُنیں اسلامی معاشرہ قائم نہیں ہو گا، اسلامی قانون نافذ کرنے سے بھی نہیں ہو گا۔

اسلام ایک سسٹم ہے اور ہر سسٹم انسان کی مہارت اور اس کے علم سے چلتا ہے خواہ وہ سسٹم مشینی ہو یا کسی اور طرح کا مگر اسلام میں یہ فرق ہے کہ اسے انسان نے نہیں بنایا اور اس سسٹم کی غرض خاص صفات رکھنے والے انسان پیدا کرنا ہے لیکن جب ایسے انسان پیدا نہیں ہوتے تو مسلمان کی بدعملی اور بد اخلاقی کو اس سسٹم کی پیداوار کہنا قطعاً غلط ہو گا جرائم اور بد اخلاقی کو جو مثالیں میں نے دی ہیں ان سب کی جڑ خواہش زر ہے خواہ اس میں خلاف قانون یا اخلاقی خلاف ورزی یا کوئی اور غیر مناسب طریقے استعمال کیے جائیں دنیا میں روپیہ بڑی طاقت ہے کیونکہ اسی سے آپ اپنی آسائش کے لیے دوسروں کی خدمات اور عیش و عشرت کا سامان حاصل کر سکتے ہیں مگر ایسے معاشرے کے لیے جس میں ناجائز طریقے سے روپیہ حاصل کرنا بھی ایک طرز زندگی بن جائے مذہب ایک بے اثر اور رسمی چیز بن کر رہ جاتا ہے اور ان روحانی اقدار کو نہیں ابھار سکتا جو مذہب کا اصل مقصد ہیں۔

اسلام اس قسم کی گراوٹ کا کیا علاج بتاتا ہے اسلام کی اخلاقی اور معاشرتی اقدار کے سلسلہ میں ان قرآنی آیات کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جو ایک طرف دولت کے ضیاع اور فضول خرچی کی مذمت

کرتی ہیں اور دوسری طرف دولت جمع کرنے والوں کی موخر الذکر لوگوں کے متعلق ارشاد ہے کہ قیامت کے دن یہ جمع کی ہوئی دولت ان کے گلے میں پھانسی کا پھندا ہوگی۔" کیونکہ قرآن خیرات اور غریبوں اور بیکسوں کی مدد کرنے پر زور دیتا ہے ان آیات سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دولت کو جمع کر کے نہیں رکھنا چاہیئے اور نہ ہی اس کو عیش و عشرت پر خرچ کرنا چاہیئے بلکہ اس کا مناسب حصّہ غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کرنا چاہیئے دولت کا اسراف بھی اتنا ہی مذموم ہے جتنا اس کا اکٹھا کر کے رکھنا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر ان آیات کے مقاصد کو سمجھ کر ان پر عمل کیا جائے تو ملت کے لیے ایک ایسا اقتصادی نظام اور دولت کی منصفانہ تقسیم کار کا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے جو اجتماعی طور پر ملت کے مفاد میں ہو۔

اسلام پیداوار کو بڑھانے اور دولت کمانے کو مذموم نہیں سمجھتا اور نہ ہی ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھ پاؤں سے روزی کما سکتے ہیں۔ بیکاری اور بھیک مانگنا پسند کرتا ہے جن برائیوں کا اوپر ذکر ہو چکا ہے قرآن ان سب کی مذمت کرتا ہے اور ان میں سے کئی ایک کو قابل تعزیر بناتا ہے لیکن تقسیم برصغیر کے بعد جو دولت پاکستانی مسلمانوں کے ہاتھ آئی اور جو طریقے انہوں نے اسے حاصل کرنے میں استعمال کیے انہوں نے قوم کی اخلاقی اقدار کی بنیاد کو اکھاڑ پھینکا اور اس کے ساتھ سرکاری افسروں کو رشوت کی ایسی ترغیب دی کہ فرائض منصبی کی ادائیگی رشوت کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ہجرت جو برصغیر کی تقسیم کے بعد ہوئی اسلام کی تاریخ میں پہلے بھی ہو چکی تھی مگر مدینہ کے انصار و مہاجرین کے تعلقات ہیں اور پھر جو جائداد مدینہ اور اس کے گرد و نواح میں یہودی چھوڑ گئے تھے۔ اس کے انتظام و تقسیم میں ایک طرف اور برصغیر کی ہجرت اور تقسیم جائداد میں دوسری طرف کیا کوئی مقابلہ ہو سکتا ہے ایک اور عنصر جس نے مسلمانوں کی اخلاقی اقدار پر ضرب کاری لگائی ہے وہ لائسنسوں اور پرمٹوں کا سلسلہ ہے کون نہیں جانتا کہ اس سسٹم میں کتنی بے ایمانی اور محنت و استحقاق کے بغیر حصول دولت کی گنجائش ہے اور سیاسی پارٹیاں جو ابتدائے پاکستان سے برسر اقتدار آئیں۔ اپنا سیاسی اقتدار قائم رکھنے کی خواہش کے لیے اس الزام سے بری نہیں ہو سکتیں۔

اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سائنس اور ٹیکنیک سے محروم رہ کر جس پر زمانہ حاضرہ کی مادی خوش حالی کا انحصار ہے مسلمان عالم کا اجتماعی اور انفرادی طور پر کیا مستقبل ہے جہاں تک انسانی ذہن کام کرتا ہے۔ اس سوال کا جواب دینا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ بنی نوع انسان کے مستقبل کے متعلق پیش گوئی کرنا۔ کیونکہ تاریخ کے لیے کوئی پہلے سے متعین راستہ یا کھدی ہوئی نہر کی تہ نہیں ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکے کہ اس کی رو نے کس طرف بہنا ہے تاریخ طبیعی واقعات، ماحول، انسانی سرگرمیوں اور تخیل کی داستان ہے جو ایک نہ رکنے والی تبدیلی کے تابع ہیں جس کے متعلق کوئی قیاس آرائی بھی نہیں ہو سکتی۔

اس قاعدہ کلیہ سے مسلمان بھی مستثنیٰ نہیں لیکن جس طرح مسلمانوں کی ترقی کے اسباب گنے جا سکتے ہیں اسی طرح ان کے زوال کے اسباب کا بھی تجزیہ ہو سکتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ زوال کے اسباب کی روک تھام سے مسلمانوں کی عظمت رفتہ اپنی سابقہ صورت میں واپس آسکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تاریخ کے دھارے کا رخ موڑا جا سکتا ہے جو موجودہ حالات میں ناممکنات کی ایک صورت ہے جیسے گزرا ہوا وقت واپس نہیں آسکتا اسی طرح گزشتہ تاریخی واقعات بھی واپس نہیں آسکتے اگر یہ بات درست نہ ہوتی اور تاریخ کی رو ویسے ہی بہتی جیسے اس زمانہ میں جس کو ازمنۂ وسطیٰ کہا جاتا ہے تو آج بھی مسلمان علوم و دانش اور تہذیب و تمدن میں باقی دنیا سے ویسے ہی آگے ہوتے جیسے کہ وہ اپنے عروج کے زمانے میں تھے جب دنیا جہالت، تاریکی اور توہمات میں ڈوبی ہوئی تھی۔

اس دلیل کو سمجھنا ذرا مشکل ہے مگر اس کی بنیاد ڈھونڈنا بہت آسان ہے۔ اسلام کی سیاسی و حربی قوت اسلامی تہذیب و تمدن اور علوم و دانش نے تاریخ کے ایک خاص مرحلے اور ماحول میں نشوونما پائی تھی وہ ماحول اب موجود نہیں۔ صدیوں کی لمبی زنجیر سے گزر کر زمانہ ایک نئے ماحول کو جگہ دے چکا ہے اسی طرح وہ اسباب جنہوں نے مسلمانوں کو ایک ہزار سال تک دنیا کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی قوم بنایا تھا اب ایک غیر متعلقہ شے بن چکے ہیں۔ کیونکہ سیاسی و حربی قوت اور علم و دانش کا انحصار اب مختلف عناصر پر آٹھہرا ہے اس لیے مسلمانوں کو جو مسائل اب درپیش ہیں وہ بھی مختلف ہیں مسلمان ممالک اور دنیا کے تقابلی جائزہ سے ایک حقیقت جو کھل کر سامنے آتی ہے اور جسے ہم اپنی خوش فہمی کی وجہ سے ہی نظر انداز کر سکتے ہیں یہ ہے کہ اسلام کا اب کوئی مؤثر یا غیر مؤثر مرکز نہیں رہا اور مسلمانوں کی ترقی کا سب سے بڑا باعث ایک مشترکہ مرکز ہی تھا جب تک یہ مرکز مؤثر رہا اور مسلمانوں میں جوشِ عقیدت باقی رہا ناممکنات بھی ان کے لیے ممکن ہو گئیں۔ لیکن جب مرکزیت ختم ہو گئی اور مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ ہر طرف نا اتفاقی اور باہمی مخاصمت کی گھٹائیں چھا گئیں اور مضبوط مرکز کی بجائے مسلم ممالک کو مخالف اقوام سے فرداً فرداً نبرد آزما ہونا پڑا تو نتیجہ وہی نکلا جو تاریخ عالم ہمیشہ دہراتی رہی ہے۔ یعنی ملت اسلامیہ کے مختلف علاقائی طبقوں کی ترقی تو درکنار اپنی حفاظت بھی ان کے لیے مشکل ہو گئی۔

مسلمانوں میں جوشِ عقیدت کی رمق اگرچہ اب بھی باقی ہے لیکن حربی قوت کو وہ مدت ہوئی کھو بیٹھے ہیں۔ آج کل جنگوں میں جو اسلحہ استعمال ہو سکتا ہے۔ آج سے تیس سال پہلے اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ایک شہر ہیروشیما کے ... ۹۴ اور دوسرے شہر ناگاساکی کے ایک لاکھ باشندے صرف دو بموں سے آنِ واحد میں لاشوں میں تبدیل ہو گئے یہ دونوں شہر ملیامیٹ ہو گئے اور ریڈیائی اثر سے کئی سال تک بیشمار انسان لقمۂ اجل بنتے رہے زمانے نے ایسا رخ اختیار کیا ہے کہ اونٹ اور گھوڑے

اب باربرداری یا شوقین امراء کے شغل کے لیے رہ گئے ہیں منجنیق کے معنی ڈکشنری میں ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ شمشیر کو نیام کے اندر زنگ کھا رہا ہے۔ نوک سناں گھوڑ سواروں کے نیزے کی نمائش کے لیے رہ گئی ہے۔ تیرانداز کمان سے اب تیر نہیں نکلتا۔ کچی مٹی کے گولے باغوں سے طوطے اڑانے کے لیے نکلتے ہیں یرموک دمشق، قادسیہ، تبوک اور بیت المقدس جیسی کوئی جگہ فتح کرنے کے لیے باقی نہیں رہی۔ ملک کی وسعت بڑھانے اور مذہب کے پھیلاؤ کے لیے ممالک کو فتح کرنا اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق جس کو سب مسلمان ممالک بھی تسلیم کرتے ہیں ایک بین الاقوامی جرم سمجھا جاتا ہے یورپ میں پندرھویں اور سولھویں صدی کے احیاء علوم کا زمانہ مسلمان دانشوروں کی تصانیف کے مطالعہ سے شروع ہوا اور دنیا کی مشہور تاریخ "مورخین عالم کی تاریخ دنیا" کے مصنف تسلیم کرتے ہیں کہ اگر عربوں (مسلمانوں) کو تاریخ سے حذف کر دیا جائے۔ تو یورپ کا احیائے علوم کا زمانہ صدیوں پیچھے پڑ جاتا ہے۔ یہ اقبال ہے اس امر کا کہ یورپ کا احیائے علوم کا زمانہ مسلمانوں کا مرہون منت ہے اسی طرح زمانہ حاضرہ جو احیائے علوم کے زمانہ کی وجہ سے شروع ہوا۔ مسلمانوں سے بلاواسطہ تعلق رکھتا ہے مسلمانوں کی دانشوری اور سائنسدانی کا زمانہ بارہویں صدی کے آخر میں ختم ہو گیا اگرچہ ان دانشوروں اور سائنسدانوں کی تصانیف یورپ کی یونیورسٹیوں اور عوام میں تین صدیوں تک مقبول رہیں لیکن بارہویں صدی کے اختتام کے بعد اب تک کوئی مسلمان نامور سائنسدان پیدا نہیں ہوا۔ مگر احیائے علوم کی صدیوں میں دو سائنسدان یورپ میں پیدا ہوئے جو احیائے علوم کے زمانہ کی پیداوار تھے ان میں سے ایک تو کوپرنیکس (۱۴۷۳ء تا ۱۵۴۳ء) تھا۔ جس نے پہلی دفعہ یہ نظریہ پیش کیا کہ نظام شمسی کا مرکز سورج ہے جس کے گرد سیارے چکر لگاتے ہیں جن میں زمین بھی شامل ہے اسی نظریے کی تائید گیلیلیو[1] (۱۵۶۴ء تا ۱۶۴۲ء) نے کی اور مزید یہ دریافت کیا کہ زمین اپنے محور کے گرد ایک دن میں پورا چکر لگاتی ہے اور گرنے والے اجسام کی تیزی کا ان کے وزن سے کوئی تعلق نہیں اس سے صدیوں پہلے مسلمان شاقول (پنڈولم)، کے متواتر ہلتے رہنے کا سبب بھی دریافت کر چکے تھے۔ گیلیلیو کا یہ نظریہ کلیسا کے نظریہ سے ٹکر کھاتا تھا۔ اس لیے اس مشہور سائنسدان کو جس کی دریافتیں آج بھی صحیح سمجھی جاتی ہیں کلیسا کی مذہبی عدالت کے سامنے الحاد کے الزام میں پیش ہونا اور سزائے موت کا فیصلہ سننا پڑا۔ مگر اس کے اس نظریے سے توبہ کر لینے پر سزائے موت پر عمل نہ ہوا۔

اتحاد بین المسلمین کی جو وجوہ مسلمانان عالم کے ایک سیاسی وفاق میں سد راہ ہیں ان پر نہ کبھی اتفاق ہوا ہے اور نہ ہو گا۔ مگر وفاق کے بجائے اتحاد ممکن ہے اور اس کے کچھ آثار پیدا بھی ہو چکے ہیں علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کے مستقبل کی تشکیل کے متعلق تقریباً نصف صدی پیشتر یہ خیال ظاہر کیا تھا "آج کل ہر مسلم ملک کی قوم کو چاہیے کہ اولاً وہ اپنی خودی (فردیت)، کی گہرائی میں ڈوب جائے اور سر دست اپنی نگاہ اپنے آپ پر ہی مرتکز رکھے۔ تاوقتیکہ سب اسلامی ممالک ایک زندہ جمہوریت کے خاندان کے افراد نہ

---

[1] (GALILEO)

بن جائیں ۔ ایک حقیقی اور زندہ اتحاد وطن پرست مفکروں کے لیے ایک خلیفہ کی سرپرستی سے قائم نہیں ہو سکتا ۔ اصل اتحاد بہت سی آزاد خود مختار قوموں کی اکثریت سے ہی حاصل ہو سکتا ہے جن کی باہمی رقابتیں ایک مشترکہ روحانی خواہش کے ذریعہ غائب ہو جائیں مجھے یہ نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں آہستہ آہستہ یہ سکھا رہا ہے کہ اسلام نہ تو وطنیت کا نام ہے اور نہ شہنشاہی کا ۔ بلکہ مختلف ممالک کے مسلمانوں کا ایک لیگ میں جذب ہونا ہے جو مصنوعی حدود اور نسلی امتیاز کو صرف لیگ کے مختلف ممبروں کا حوالہ دینے کی غرض سے تسلیم کرتی ہو نہ کہ لیگ کے ممبروں کے اجتماعی افق کو محدود کرنے کے لیے"

تہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

آجکل ہر ملک کی طاقت اس کی اقتصادی ترقی پر منحصر ہے ۔ یعنی صنعتی اور زرعی پیداوار کی افراط پر میں نے ہر اسلامی ملک کے درآمدات و برآمدات اور زیر زمین معدنیات کی مقدار کا اندازہ لگایا ہے ۔ اور میں وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ تمام اسلامی ممالک کا ایک اقتصادی اتحاد بہت سے ملکوں کے مسائل کو اگر کلی طور پر حل نہیں کر سکتا تو ان میں تخفیف ضرور کر سکتا ہے اس لیے مسلم ممالک کے لیے یورپ کی مشترکہ منڈی کی طرز پر تنظیم بہت مفید ہو سکتی ہے دراصل ایک کے بجائے دو تنظیموں کی ضرورت ہے اور ان ہر دو تنظیموں میں ہر ایک ملک کا ایک ایک نمائندہ ہو ۔

اقتصادی تنظیم کے صرف ماہر اقتصادیات ہی ممبر ہوں اور وہ ہر مسلم ملک کی پیداوار اور ذرائع کا اندازہ لگا کر ایک مشترکہ پالیسی اور پروگرام مرتب کریں اور آپس میں تجارت کے ترجیحی سلوک کے امکان کا جائزہ لیں ۔ اس تنظیم کا کم ازکم ایک سالانہ اجلاس ضرور ہو اسی طرح یہ تنظیم ہر ایک ملک کے لیے صنعتی اور زرعی پیداوار کا پروگرام مقرر کرے جو اسی کے وسائل اور جو امداد اسے دوسرے ممالک دے سکتے ہیں، پر مبنی ہو اس طرح ایک یا ایک سے زیادہ مشترکہ اسلامی بنک، صنعتی کارخانے اور اسلحہ ساز ادارے آسانی سے قائم کیے جا سکتے ہیں ۔

دوسری تنظیم کا ڈھانچہ اقتصادی تنظیم کے خطوط پر ہونا چاہیئے اس کا مقصد سیاسی ہو اور تمام بین الاقوامی معاملوں میں یہ تنظیم سارے اسلامی ممالک کے لیے ایک مشترکہ پالیسی مقرر کرے ۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ اقوام متحدہ میں بھی ایک مضبوط اسلامی بلاک بنے جو اس عالمی ادارہ کے ممبران کی رائے کو متاثر کر سکے اس تنظیم کے دائرہ اختیار میں اس اسلامی ملک کی امداد کرنا بھی ہونا چاہیئے ۔ جسے کسی جنگ میں مصروف ہونا پڑے ۔

ان دونوں میں سے کوئی بھی تجویز اگر قابل عمل نہیں یا ان پر اتفاق نہیں ہو سکتا تو پھر ہر ایک اسلامی ملک کو صرف اپنے آپ پر انحصار کرنا پڑے گا اور کسی ایسی صورت کے مضمرات نہایت مہلک ہو

سکتے ہیں اگر ہر مسلم ملک نے اپنی انفرادیت پر انحصار کرنا ہے اور دوسرے مسلم ممالک کے ساتھ ویسے ہی تعلقات رکھنے ہیں جیسے کہ غیر اسلامی ممالک کے ساتھ تو انہیں ایک نازک صورت سے دوچار ہونا پڑے گا صرف مذہبیت یا روحانیت انہیں ترقی کے اس مقام تک نہیں پہنچا سکتی جو آج کل ترقی کا معیار سمجھا جاتا ہے ہر معاشرے کے افراد کو اپنی بقا اور مادی حاجات پوری کرنے کے لیے موجودہ ترقی کے وسائل کو اختیار کرنے کے سوا چارہ نہیں خوراک اور بنیادی اشیائے صرف کی کمی افراط زر کی وجہ سے مہنگائی اور بڑھتی ہوئی آبادی جس کے اثرات دیر سے ظاہر ہوتے ہیں مضبوط سے مضبوط روحانی معاشرے کی کمر توڑ سکتے ہیں اور جب تک صنعتی اور زرعی پیداوار میں اضافہ نہ ہو ایسے معاشرے کی سیاسی اور بین الاقوامی اہمیت کو ختم کر دیتے ہیں اس لیے ہر مسلم ملک کے لیے سائنسی اور تکنیکی ذرائع پیداوار ایک بنیادی ضرورت بن جاتے ہیں اور پیداواری ذرائع کا انحصار صرف سائنسی اور تکنیکی طریقوں پر ہی نہیں ان طریقوں کو اختیار کرنے کے لیے ان قدرتی وسائل سے استفادہ ضروری ہے جو قدرت کا عطیہ ہوتے ہیں اگر وسائل موجود نہ ہوں تو اپنی پیداوار کے بدلے انہیں دوسرے ممالک سے وسائل حاصل کرنے پڑتے ہیں۔

مسلمان ممالک فرداً فرداً اور مجموعی طور پر سائنس اور تکنیک کے معاملے میں مغربی اور تین ایشیائی ملکوں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور یہ حیرانی میں ڈالنے والی بات ہے کہ جو قوم قریباً ایک ہزار سال پہلے ایٹم کی دریافت کر کے قرآن کی مدد سے تخلیق عالم کی گتھی سلجھا سکتی تھی مادی اجسام میں تبدیلی کی وجہ دریافت کر سکتی تھی اور جس نے سائنس کو ایجاد کیا وہ صدیوں سے سائنس اور ایجادات میں آج ایک پسماندہ قوم بن کر رہ گئی ہے اکثر لوگ یہی کہتے ہیں کہ ہمارے زوال کا باعث اسلامی احکام اور اقدار سے روگردانی ہے اور یہ روگردانی اسلامی قوانین کی ترویج سے بند ہو سکتی ہے مگر جو قوم قرآن اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل نہیں کر سکتی کیا وہ کسی قانون ساز ادارے کے بنائے ہوئے قانون پر عمل کرنے کی طرف کسی طرح مائل ہو سکتی ہے۔

اسلامی حکومت یا ریاست، اسلامی قانون اور اسلامی معاشرہ ایک ایسا باہمی تعلق رکھتے ہیں کہ ان تینوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اصلی اسلامی حکومت اور معاشرے کی مدت تاریخ میں قریباً نصف صدی کی داستان ہے۔ جس میں رسول اکرم کی تئیس سالہ نبوت کا عرصہ بھی شامل ہے جب ہدایت کا اصلی سرچشمہ موجود تھا۔ اس طرح حضور کی وفات کے بعد اسلامی معاشرے کے ۲۲ سال رہ جاتے ہیں جو صحابہ کرام اور خلافت راشدہ کا زمانہ تھا سوال یہ ہے کہ کیا آج کل اسلام سے محبت رکھنے والے مفکرین اس زمانے کی طرف واپس جانا چاہتے ہیں یا ایک ہزار سال گزرنے کے بعد ہم اسلامی اصول کے اندر رہ کر ایک نئی اسلامی تہذیب پیدا کرنا چاہتے ہیں اگر ہم خلافت راشدہ

کے دور کا اعادہ چاہتے ہیں تو ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے - کہ تعبدیات کو چھوڑ کر اس اسلامی معاشرے
کے اقتصادی، سیاسی اور سماجی پہلو بھی تھے جن کے موجودہ معاشرے میں احیاء کرنے میں کچھ مشکلات ہیں
کیونکہ موجودہ زمانے میں یہ سرگرمیاں اب مختلف پہلو اختیار کر چکی ہیں جن کا اپنانا سابقہ اسلامی معاشرے
کی کچھ حد تک صورت بدل دے گا اس لیے موجودہ زمانے کے مفکرین اس بحران میں پڑے ہوئے ہیں
کہ کیا ان سرگرمیوں کو موجودہ زمانے کے مطابق مگر اسلام کے بنیادی اصولوں کے اندر رہ کر دور حاضرہ کے
تقاضوں کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے - جن مفکرین نے اس مسئلہ پر سوچ بچار کی ہے وہ اس بات پر
متفق نظر آتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ تبدیلی ضروری ہے اس غرض کے لیے اسلام کے اجزا کا جائزہ لینا پڑتا ہے
تاکہ ضروری اجزا کو فروعی اجزا سے علیحدہ کیا جا سکے اور اس طرح سے علیحدہ کیے ہوئے اجزا کو زمانے
کے تقاضوں کے ہم آہنگ ہی نہ کیا جائے بلکہ اسلامی معاشرے کو موجودہ معاشرے سے بھی اونچے لے
جایا جا سکے مفکرین اس بات پر بھی متفق نظر آتے ہیں کہ رسول اللہؐ کی ایک حدیث کے مطابق دنیوی امور
میں تبدیلی ہو سکتی ہے مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ تعبدیات اور دنیوی امور میں صاف تمیز کی جا
سکے کیونکہ تعبدیات میں تبدیلی نہیں ہو سکتی صاف ظاہر ہے کہ یہ بڑا مشکل کام ہے کیونکہ اسلام میں چند
دنیوی امور تعبدیات کے ساتھ ملے ہوئے ہیں بلکہ بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ ان دونوں میں علیحدگی
ناممکن ہے راقم کے خیال میں اس کام کو سرانجام دینے کے لیے حضرت عمرؓ کا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے
اور وہ یہ ہے کہ متعلقہ فرائض کے اصول اور اس زمانے کے معاشرے کی حالت کو دیکھ کر یہ جائزہ
لیا جائے کہ امر متعلقہ میں غالب پہلو تعبدیت کا ہے یا کسی امر دنیا کا - اگر امر متعلقہ کا غالب یا نمایاں
پہلو امور دنیا سے تعلق رکھتا ہے تو موجودہ قانون کے اصول کو استعمال کرتے ہوئے اس کو امور دنیا
کی ہی فہرست میں جگہ دی جائے مگر جو امور تقویٰ سے تعلق رکھتے ہیں ان کو تعبدیات میں جگہ دینا پڑے گی مثلاً
الغاف اس مشکل مسئلہ کو بذریعہ اجتہاد حل کرنے میں سب سے ضروری یہ بات ہے کہ اگر معاشرے کو اسلامی پہلو دینا
ہے تو معاشرے کو اسلامی اقدار کا صرف علم ہی نہ ہو - ان اقدار پر عام عمل بھی ہوتا ہو اور معاشرہ میں پہلے
سے قانون رائج الوقت کی پیروی کرنے کی عادت ہو خواہ وہ قانون دنیوی حکام کا بنایا ہوا ہو۔ جس معاشرے
میں قانون کی عام خلاف ورزی ہوتی ہو - تو وہاں اسلامی قوانین کی بھی ویسے ہی خلاف ورزی ہو گی -
کون نہیں جانتا کہ چوری، دغا، رہزنی، ملاوٹ، کم تولنا، زنا اور قتل اسلام میں بھی قابل تعزیر ہیں
یہ سمجھتے ہوئے اگر ان جرموں کا عام ارتکاب ہوتا ہے تو کیا محض یہ کہنے سے کہ ان کو اسلام قابل تعزیر
بناتا ہے اور ان افعال کو بذریعہ قانون قابل تعزیر بنانے سے ان جرموں کا ارتکاب معاشرے سے
غائب ہو جائے گا - کیا آجکل قانون ان افعال کو قابل تعزیر نہیں بناتا تو پھر ان قوانین کی کیوں عام
طور پر خلاف ورزی ہوتی ہے جو قوم خدا کے احکام کی تعمیل نہیں کرتی کیا وہ صرف ان احکام پر

اسلامی قانون کی مہر لگانے سے انکی تعمیل پر آمادہ ہو سکے گی میں نے مسجدوں میں بہت خطبے سُننے ہیں مگر میں نے کسی بھی واعظ کو اسلامی اعمال پر زور دیتے یا ان کی اہمیت جتاتے نہیں سُنا۔

اس لیے علماء اور دیگر رہنماؤں کا اسلامی قوانین کے نفاذ پر بار بار زور دینا بے معنی ہے۔ تاوقتیکہ وہ اپنے سامعین کو اسلامی اعمال کا سبق نہ دیں اور ان کی اہمیت پر زور نہ دیں۔ قانون کی عام خلاف ورزی کو دور کرنا اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے پہلا قدم ہے۔

بنیادی حقوق

اٹھارویں صدی کے فرانسیسی فلاسفروں نے حکومت کی بدعنوانیوں کو مدنظر رکھ کر چند قدرتی یا بنیادی حقوق کی اپنے فلسفہ میں تشریح و توجیہہ کی جن سے متاثر ہو کر عوام نے فرانس میں اخوت، مساوات اور آزادی کا نعرہ بلند کیا اور حکومت کے ظلم و تعدی کے خلاف عام بغاوت کی جس کو انقلاب فرانس کہا جاتا ہے۔ یہ انقلاب لوئیس شششم اور اس کی ملکہ کے سر قلم کرنے پر منتج ہوا۔ جو لوگ مذہبی تعصب، تنگدلی اور حکومت کے ظلم سے تنگ آکر یورپ سے امریکہ نقل مکانی کر گئے تھے۔ وہ بھی اس فلسفے سے متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنے آئین میں ان حقوق کو نمایاں جگہ دی۔ جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم دوم کے بعد جو آئین یورپ کے نئے ملکوں میں مرتب کیے گئے ان سب میں امریکہ کی مثال کو زیر نظر رکھ کر بنیادی حقوق تفصیلاً بیان کیے گئے۔ بعض آئینوں میں ایسے حقوق کی تعداد بہت مختصر ہے۔ یعنی آزادیٔ تقریر و اظہار، آزادیٔ ضمیر و مذہب، قانون کے سامنے سب کی برابری اور ہر فرد کو قانون کی محافظت مگر بذریعہ تشریح ججوں نے ان حقوق کو بہت وسعت دیدی۔ امریکہ کے آئین سے پہلے کسی ملک کے آئین میں بنیادی حقوق تسلیم نہیں کیے گئے تھے۔ قارئین کرام کو یہ پڑھ کر حیران نہیں ہونا چاہیئے کہ صدیوں پہلے رسول اکرم کی وفات کے بعد تفسیر قرآن اور حضور کی سنت سے کئی ایک بنیادی حقوق اخذ ہوتے ہیں۔ جو زمانہ حال کے حقوق کے متشابہ ہیں۔ رسول کریم کی زندگی میں وحی کی فوقیت کی وجہ سے جو کسی وقت بھی نازل ہو سکتی تھی حکومت کے خلاف کسی بنیادی حق کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا تھا مگر حضور کی وفات کے بعد قرآن اور حدیث سے ایسے حقوق اخذ ہوتے ہیں جن کو آجکل کی زبان میں بنیادی حقوق ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان میں اہم حقوق یہ ہیں۔

۱۔ اخوت۔ فرانسیسی لفظ (FRATERNITY) کا ترجمہ۔

۲۔ مساوات بلا لحاظ رنگ، نسل اور زبان اور چند صورتوں میں بلا لحاظ مذہب

۳۔ انصاف اور قانون کے سامنے سب کی برابری۔ خلیفۂ وقت کی غریب سے غریب بلکہ غیر مسلم سے برابری۔ ۴۔ آزادیٔ دین، مذہب اور ضمیر۔

۵۔ قانون کے تابع آزادیٔ عمل۔

جب یہ بنیادی حقوق اسلام میں موجود ہیں تو اگر فقہ کے اختلاف میں نہ پڑا جائے تو قوانین کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنا کوئی مشکل بات نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جیسے دو انسانوں کی شکل یا انگلیوں کے نشان مختلف ہوتے ہیں اسی طرح کسی دو مقدمات کے واقعات بھی بالکل ایک جیسے نہیں ہوتے اصول قانون ہر ایک مقدمے کے حالات کو مدِ نظر رکھ کر وضع کیا جاتا ہے۔ قواعد کلیہ جو فقہا نے مرتب کیے ہیں یا جو فتاوی واقعات کو زیر نظر رکھ کر دیئے گئے یا بذریعہ استخراج کوئی رائے قائم کی گئی تو صحابہ کرام کے زمانے کو چھوڑ کر وہ بعد کی نسلوں کو پابند نہیں کر سکتے ان فقہا کے متعلق امام ابو حنیفہ نے حقیقت بیان کی جب انہوں نے کہا کہ وہ بھی انسان تھے اور ہم بھی انسان ہیں۔ اسی عمل کا نام اجتہاد ہے۔ یعنی ہر ایک مسئلہ کو اس کے واقعات سمجھ کر کسی سابقہ فیصلے و فتوے یا رائے یا فرائض کے اصول کو سمجھ کر طے کیا جائے اور ہر دو کے فرق کو پوری اہمیت دی جائے جہاں واقعات میں اختلاف نظر آئے وہاں استحسان اور استصلاح کے اصول سے کام لیا جائے۔

****